

آ نامہ

جاوید

منظوم اردو ترجمہ

سید احمد ایثار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت علامہ اقبال کی مشہورِ زمانہ تصنیف

جاوید نامہ

کا مکمل اور منظوم اردو ترجمہ معہ متن

از

سیّد احمد ایثار

ناشر

ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ

نمبر 967، شیر خان اسٹریٹ، نگرتھ پیٹ، بنگلور۔ ۲۔

فون: 56694697/2217815

Title	:	**JAVEED NAMA** (Translation in Urdu Verse)
By	:	Syed Ahmed Esar
Edition	:	2003
Pages	:	480
Price	:	Rs. 250/-
Publisher	:	ESAR PUBLISHING HOUSE TRUST, Bangalore

© جملہ حقوق بنام سیدہ افتخار بانو سلمہا محفوظ

کتاب :	جاوید نامہ (مکمل و منظوم اردو ترجمہ معہ متن)
شاعر :	سیّد احمد ایثارؔ (مترجم)
سنہ اشاعت :	اپریل 2003ء
تعداد :	ایک ہزار
کتابت :	محمد اقبال
سرِ ورق :	سیّد منور حسین
طباعت :	مفید گرافک پرنٹس، بنگلور
ناشر :	ایثارؔ پبلشنگ ہاوز، بنگلور
قیمت :	=/250 روپئے

یہ کتاب کرناٹک اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے

ملنے کے پتے :

۱۔ اسلامک بک سنٹر، جامع کامپلکس، این آر روڈ، بنگلور۔ ۲

۲۔ دعوۃ بک سنٹر، نمبر ۴، یم نمبر ۳، اسٹریٹ، چار مینار مسجد روڈ، شیواجی نگر، بنگلور۔ 51

۳۔ دی بنگلور اکیڈمی، فسٹ کراس، اِنّی پورہ، کے ہنومنتیا روڈ، بنگلور۔ 27

۴۔ سید نعیم الدین، 570/3A۔ A، فسٹ فلور، درگاہ روڈ، سنگتراش واڑی، گلبرگہ۔

انتساب

میرے مرحوم والدین کے نام،
جن کی شفقت اور محبت بھری تربیت نے،
میرے وجود کو نکھارا۔

اور

صوفی منش اور سراپا صبر و شکر،
میرے ماموں کے نام،
جن کے ساتھ میرا لڑکپن گذرا،
جنہوں نے صفائے قلب کی طرف
میرے میلان کو بڑھایا۔

سیّد احمد ایثار

فہرست

اپنی بات		سید احمد ایثار	9
پیش لفظ		پروفیسر آغا مرزا محمود سروش	13
جاوید نامہ۔ ایک عبقری شعری کارنامۂ اقبال		خالد عرفان	21
مقدمہ		سید احمد ایثار	45
	جاوید نامہ		120
۱	مناجات		121
۲	تمہیدِ آسمانی (تخلیق کا پہلا دن۔ آسمان زمین طعنے کستا ہے)		129
۳	نغمۂ ملائک		133
۴	تمہیدِ زمینی (مرشدِ رومی کی روح آشکار ہو کر اسرارِ معراج کی شرح فرماتی ہے)		135
۵	زمان و مکان کی روح زرّہ آن مسافر کو عالمِ بالا کی سیر کیلئے لے جاتی ہے		149
۶	زمزمۂ انجم		153
۷	فلکِ قمر		157
۸	عارفِ ہندی سے ملاقات، جو چاند کے غاروں میں سے ایک غار میں خلوت گزیں تھا، ہند والے جس کو جہاں دوست کہتے ہیں		165
۹	عارفِ ہندی کے نو نکات		175

۱۰	جلوۂ سروش	181
۱۱	نوائے سروش	183
۱۲	وادیٔ ہرغمید کی سیر جس کو ملائکہ وادیٔ طوا سین کہتے ہیں	185
۱۳	طاسینِ گوتم (شوخ وشنگ رقاصہ کا توبہ کرنا)	189
۱۴	طاسینِ زرتشت (اہرمن کا زرتشت کو آزمانا)	195
۱۵	طاسینِ مسیحؑ (حکیم طالسطائی کا خواب)	201
۱۶	طاسینِ محمدؐ (حرم کعبہ میں روحِ ابوجہل کا نوحہ)	205
۱۷	فلکِ عطارد	209
۱۸	زیارتِ ارواحِ جمال الدین افغانی و سعید حلیم پاشاہ	211
۱۹	دین و وطن	217
۲۰	اشتراکیت و ملوکیت	221
۲۱	مشرق و مغرب	225
۲۲	محکماتِ عالمِ قرآنی	231
۲۳	خلافتِ آدم	231
۲۴	حکومتِ الٰہی	237
۲۵	زمیں خدا کی ملک ہے	241
۲۶	سلطنت خیر کثیر ہے	245
۲۷	روس کی قوم کو افغانی کا پیغام	253
۲۸	غزلِ زندہ رود	263
۲۹	فلکِ زہرہ	265
۳۰	مجلسِ خدایانِ اقوامِ قدیم	271
۳۱	نغمۂ بعل	273

۴۲	دریائے زہرہ میں اتر آنا اور دیکھنا ارواحِ فرعون وکشنز کو	277
۴۳	درویشِ سوڈانی کا نمودار ہونا	285
۴۴	فلکِ مریخ	289
۴۵	اہلِ مریخ	291
۴۶	مریخ کے منجم کا جنتر منتر سے آنا	295
۴۷	شہرِ مرغدیں کی سیر	301
۴۸	دوشیزۂ مریخ کا احوال جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا	309
۴۹	نبیۂ مریخ کی دعوت	311
۵۰	فلکِ مشتری	315
۵۱	حلاج، غالب و قرۃ العین طاہرہ کی بزرگ روحیں بہشت چھوڑ کر سیرِ دوم گرویدہ ہیں	317
۵۲	نوائے حلاج	319
۵۳	نوائے غالب	321
۵۴	نوائے طاہرہ	323
۵۵	زندہ رود اپنی مشکلات کو ارواحِ بزرگ سے بیان کرتا ہے	325
۵۶	خواجۂ اہلِ فراق ابلیس کا نمودار ہونا	349
۵۷	نالۂ ابلیس	355
۵۸	فلکِ زحل	359
۵۹	ارواحِ رذیلہ جنہوں نے ناٹ ملے سے غداری کی اور جنہیں دوزخ نے قبول نہیں کیا	361
۶۰	قلزمِ خونین	365
۶۱	ہندوستان کی روح حاضر ہوتی ہے	365
۶۲	روحِ ہندوستان نالہ و فریاد کرتی ہے	367
۶۳	قلزمِ خونین کی کشتی والوں میں سے ایک کی فریاد	371

۵۴	آں سوئے افلاک	375
۵۵	حکیم المانوی نطشہ کا مقام	377
۵۶	حرکت بجنت الفردوس	383
۵۷	قصرِ شرف النسار	387
۵۸	زیارتِ امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی و ملا طاہر غنی کشمیری	391
۵۹	درحضورِ شاہِ ہمدان	393
۶۰	شاعرِ ہندی برتری ہری سے ملاقات	409
۶۱	کاخِ سلاطینِ مشرق کی سیر (نادر، ابدالی، سلطان شہید)	415
۶۲	روحِ ناصر خسرو علوی ظاہر ہوتی ہے اور یہ غزل مستانہ انداز میں سنا کر غائب ہو جاتی ہے	421
۶۳	کاویری کو پیامِ سلطان شہید (حیات، موت اور شہادت کی حقیقت)	435
۶۴	زندہ رود فردوسِ بریں سے رخصت ہوتا ہے اور حورانِ بہشتی کا تقاضا	441
۶۵	زندہ رود کی غزل	443
۶۶	حضور	445
۶۷	جاوید سے خطاب (نئی نسل کو پیغام)	459

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنی بات

علامہ اقبال کا جاوید نامہ ایک وسیع کینواس رکھتا ہے۔ اس میں کم وبیش تمام شعبہ ہائے زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ سیاسیات، مذہبیات، ثقافت و تہذیب ہی نہیں بلکہ علوم حاضرہ کے علاوہ مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں بھی شامل ہیں۔ یہ تمام معاملات تاریخ ساز مشاہیر عالم کی ارواح سے مکالمہ کے ذریعہ منکشف کی گئی ہیں۔ لیکن صرف ماضی کے ان مشاہیر عالم کے ناموں کے تذکرے سے عام قاری کی تشفی ہونا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر مختلف کتابوں سے مواد اکٹھا کر کے مقدمہ لکھا گیا ہے۔ مقدمہ کی طوالت کا یہی سبب ہے۔ امید کہ طبع قاری پر گراں نہیں گذرے گا۔

سابقہ کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی اردو منظوم ترجمہ کے دوش بدوش اصل فارسی متن بھی دیا گیا ہے۔ فارسی اور اردو میں ایک قریبی نسبت ہے۔ فارسی کے بہتیرے الفاظ اور تراکیب اردو زبان نے اپنا لئے ہیں اور بول چال میں بھی مروج ہیں۔ ترجمہ کا مقصد ترسیلِ معانی ہے۔ نثر کا ترجمہ نثر میں ایک حد تک آسان ہوتا ہے لیکن نظم کا ترجمہ قدرے مشکل ہے۔ اکثر ترجمہ کے دوران میں اصل کا حسن اور تاثر ختم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنے ترجمہ کو اس سے پاک رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ ترجمہ کرتے ہوئے درجِ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھا ہے:

۱۔ ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کیا گیا ہے۔

۲۔ فارسی بحور برقرار رکھی گئی ہیں، لیکن جہاں دقّت کا سامنا ہوا، وہاں صرف ایک یا دو حرکات بڑھا یا گھٹا کر بحر میں تبدیلی کی گئی ہے۔ بہرصورت تاثر کو باقی رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ فارسی کے بنے بنائے استعارات اور تراکیب کا استعمال کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بوقتِ ضرورت قاری کے لئے اردو لغات سے رجوع ہونا کافی ہو۔

۴۔ جہاں کہیں ترجمہ مشکل نظر آیا اور تاثر پر اس کی زد پڑتی دیکھی، وہاں ترجمانی سے کام لیا گیا ہے۔

۵۔ بعض مقامات پر اردو میں مستعمل الفاظ پاکر صرف ایک دو الفاظ کی تبدیلی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر درجِ ذیل شعر کا ترجمہ ؎

زہرہ و ماہ و مشتری از تو رقیب یکدگر
از پئے یک نگاہِ تو کشمکشِ تجلیات

ترجمہ:

زہرہ و ماہ و مشتری تجھ سے رقیب یکدگر
دعوتِ دید ہے تجھے کشمکشِ تجلیات

۶۔ بعض مقامات پر فارسی متن کو جوں کا توں اردو ترجمہ میں رکھ لیا گیا ہے۔ جیسا کہ ؎ آدمیت احترامِ آدمی

یہ مصرعہ حالاں کہ فارسی ہے لیکن تینوں الفاظ اردو میں بھی اسی طرح بہ کثرت مستعمل ہیں۔ ان کا ترجمہ بے معنی ہوگا۔

جاوید نامہ کا ترجمہ ۱۹۷۹ء میں مکمل ہوا تھا۔ نظرِ ثانی کے بعد اب اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔ قبل ازیں "پیامِ مشرق" اور "زبورِ عجم"

کے ترجمے پیش کر چکا ہوں۔ ادب شناس حلقوں میں ان کی پذیرائی میرے لئے عزت اور ہمت افزائی کا باعث رہی ہے۔ مثنوی "پس چہ باید کرد....." کی کتابت ہو چکی ہے۔ امید ہے کہ وہ بھی ایک معقول وقت میں طباعت سے آراستہ ہو جائے گی۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں، مَیں کرناٹک اردو اکیڈمی کی جزوی مالی اعانت کا ممنون ہوں۔ پروفیسر آغا مرزا محمود سروش نے مسودہ کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ایک قیمتی پیش لفظ عنایت فرمایا ہے۔ جناب خالد عرفان کا تبصرہ بھی شاملِ کتاب ہے۔ مَیں دونوں کرم فرماؤں کا بے حد مشکور ہوں۔ جناب محمد اقبال نے گاہ بہ گاہ مشوروں سے نوازا، اور دیدہ زیب کتابت سے مشکور فرمایا ہے۔ جناب سید منور صاحب نے اپنے 'آرٹ' سے سرورق سنوارا ہے۔ ان کا اور دیگر تمام احباب کا، جنہوں نے حوصلہ افزائی کی میں شکر گذار ہوں۔ آخر میں 'مفید گرافک پرنٹس' کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے طباعت کا کام بلا تاخیر اور بخوبی انجام دیا ہے۔

سیّد احمد ایثار

نمبر ۹۶، شیر خان اسٹریٹ،
نگرتھ پیٹ، بنگلور۔۲۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از:- آغا مرزا محمود سروش

ایذرا پاونڈ کہتے ہیں: "ادبی تخلیق کا ایک عظیم دور ہمیشہ ترجمہ کا بھی عظیم دور ہوتا ہے یا پھر نتیجہ کے طور پر فوراً بعد پیدا ہوتا ہے۔" زبان و ادب کی ترقی میں ترجمہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یورپ میں جب نشاۃ ثانیہ شروع ہوا، اس وقت تک یونان کے علم و ادب کے خزانے برباد ہو چکے تھے۔ خوش قسمتی سے عربوں نے یونانی علم و ادب کے خزانوں کے بیشتر حصے کو عربی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ یہی میراثِ خلیل تھی جسے بقولِ اقبالؔ تثلیث کے فرزند لے اڑے۔ یعنی یورپی ممالک نے عربی سے اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے اپنے علم و ادب کی عمارت کے لئے ایک مستحکم بنیاد فراہم کی تھی۔ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اس طرح ترجمہ کے ذریعہ علم و ادب کا عظیم سرمایہ محفوظ ہو گیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو جس حد تک علامہ اقبالؔ نے متاثر کیا ہے کسی اور شاعر نے نہیں کیا۔ لیکن اقبالؔ کا بیشتر کلام فارسی زبان میں ہے۔ کلیاتِ اقبالؔ اردو میں ہے۔ اس کے علاوہ اقبالؔ کا سارا شعری سرمایہ فارسی زبان میں ہے۔

اب ہندوستان میں فارسی جاننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ آنے والی نسلوں میں اتنے بھی نہیں رہیں گے۔ ایسے میں علامہ اقبال کے وہ شیدائی، جو فارسی سے نابلد ہیں، اپنے محبوب شاعر کے کلام کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم ہو جائیں گے۔ غالب کی طرح اقبال کے بھی 'نقشہائے رنگ رنگ' فارسی ہی میں ہیں۔ اب ہماری مجبوری ہے کہ اپنے عظیم شاعروں کے فارسی کلام کو اردو میں منتقل کر لیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اصل کلام کے لطف سے محروم ہو جائیں گے۔

دنیا کی ہر بڑی زبان نے دوسری زبانوں کے ترجموں سے اپنی زبان اور اپنے ادب کو مالامال کیا ہے۔ ادب میں نئے رجحانات، نئے احساسات اور نئے تصورات ترجموں کے ذریعہ آتے ہیں اور زبان کی قوتِ اظہار میں اضافہ کرتے ہیں۔ اقبال نے 'زبورِ عجم' میں ایک جگہ کہا ہے ؎

شوق اگر زندہ و جاوید نباشد عجب است
کہ حدیثِ تو دریں یک دو نفس نتواں گفت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے سید امداد ایثار صاحب کو زندہ شوق عطا کیا ہے۔ اس لئے انہوں نے حدیثِ اقبال کو ہم تک پہنچانے کے لئے ایک آدھ مجموعۂ کلام کا ترجمہ نہیں بلکہ اقبال کے سارے فارسی کلام کا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ اور نہ صرف ترجمہ کیا ہے بلکہ اپنے مقدموں کے ذریعہ اس کی تفہیم کی بھی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ اقبال کو پوری طرح سمجھنا ہو تو ان کا سارا اردو اور فارسی کلام، ان کے مضامین، ان کے خطوط اور انگریزی لکچرس اور ان کی 'اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل' کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

شمیم حنفی لکھتے ہیں: "اقبال کو چاروں طرف سے پڑھنا اور ان چاروں طرف بکھری ہوئی حقیقتوں، مادی، مابعد الطبیعاتی، تہذیبی، معاشرتی،

روحانی، جذباتی اور نفسیاتی حقیقتوں کو سمجھنا اقبال کے مطالعہ کی مجبوری ہے۔ مشرقی فلسفہ، مغربی فلسفہ، قدیم و جدید فکری میلانات اور مکاتیب، یا ویدانت اور پراچین ہندو طرزِ فکر اور طرزِ احساس، سنسکرت، فارسی اور اردو شاعری، جرمن، اطالوی اور انگریزی شاعری، پوری نشاۃ ثانیہ سے لے کر اقبال کے زمانے تک کی تاریخ اور سیاست، اقبال کی فکر پر ان سب کا گہرا سایہ ہے۔"

کامیاب مترجم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس ادیب یا شاعر کا ترجمہ کر رہا ہے، اس کے افکار، جذبات، عقائد، اس کا اندازِ نظر، اس کے تعصبات وغیرہ سے واقفیت رکھتا ہو، اور اس کی ساری تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا ہو۔ ایثار صاحب کا تحریر کردہ مقدمہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ انہوں نے نہ صرف اقبال کے افکار کا مطالعہ کیا ہے بلکہ ان کے افکار کے سرچشموں کی بھی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ ترجمہ ان کی سخن فہمی اور ژرف نگاہی کا آئینہ دار ہے۔

جاوید نامہ اقبال کا ادبی شاہکار ہے۔ یہ اقبال کا Magnum Opus ہے۔ عبدالمغنی رقم طراز ہیں: "اپنے مضامین کی وسعت، موضوعات کے تنوع، کرداروں کی رنگارنگی، مناظر کی دل کشی اور افکار کی گہرائی، اشعار کی ساحری، تصورات کی آفاقیت اور مقاصد کی رفعت کے لحاظ سے دنیا کی کوئی شعری تخلیق اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ وہ شاعری ہے جو دانتے کے بس کی بات نہیں۔"

ایسے شاہکار کا ترجمہ کرنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ایثار صاحب نے بڑی عرق ریزی اور سلیقہ سے اس ذمہ داری کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ منظوم ترجمہ کر کے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا بھی ثبوت پیش کیا ہے۔

اردو اور فارسی کا مزاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف بھی نہیں ہے۔ ان دونوں زبانوں میں لسانی قرب ہے جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

ایثار صاحب نے اصل کلام کی روانی اور سلاست کو برقرار رکھا ہے۔ یہاں صرف دو چار شعر بطورِ نمونہ پیش ہیں۔ ویسے ترجمے کا زیادہ سے زیادہ حصہ اسی طرح رواں ہے۔

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ + ہر زماں گردم فغاں مانند چنگ

ترجمہ:- ہفت رنگ عالم میں نسا ہر زماں + چنگ کے مانند ہے گرم فغاں

لیکن ایں عالم کہ از آب و گل ست + کے تواں گفتن کہ دارائے دل ست

ترجمہ:- باوجود اس کے جہانِ آب و گل + کہہ نہیں سکتے کہ ہے دارائے دل

تو فروغِ جاوداں ماچوں شرار + یک دو دم داریم و آں ہم مستعار

ترجمہ:- تو سدا کی روشنی ہم جوں شرار + اک دو دم حاصل ہیں وہ بھی مستعار

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را + او ست سید جملہ موجودات را

ترجمہ:- جو بھی عاشق ہے جمالِ ذات کا + وہ ہے سید جملہ موجودات کا

ایک اچھا مترجم اصل معنی ادا کرنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں پاتا تو نئے مرکبات از خود بنا لیتا ہے، اور اس طرح اپنی زبان کو وسعت عطا کرتا ہے۔ یہ کام بھی ایثار صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ ان کی تراکیب ان کی تخلیقی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں:

ملک آدم خاکدانے بود و بس + دشتِ او بے کاروانے بود و بس

ترجمہ:- حق میں انسانوں کے آیا خاکداں + دشت در تھے بے نصیب کارواں

در گلو داری نواہا خوب و نغز + چند ازیں رنگل بنالی مثلِ چنگ

ترجمہ:- اے کہ تو ہے مطربِ نادر نوا + خاک میں مینڈک سا تو کیونکر بھلا

وحی حق، بیمن رہ سود ہمہ + در نگاہش سود و ابود ہمہ

ترجمہ:- سود سب کا وحی حق کا مقتضا + سود اور نابود خلقِ کبریا

در نسازد با تو ایں سنگ و حجر + ایں ز اسبابِ حضر تو در سفر

ترجمہ:- تیرے لائق کہ بیں یہ سنگ و گہر + تو مسافر اور یہ سامانِ سفر
رایت حق از ملوک آید نگوں + قریہا از دنبل شاں خوار و زبوں

ترجمہ:- پرچمِ حق بادشاہوں سے نگوں + شہر میں دنبل اُن کا دیہ کشت و خوں

آں دلے دارم کہ از ذوقِ نظر + ہر زماں خواہد جہانے تازہ تر

ترجمہ:- میرا دل ہے کشتہ ذوقِ نظر + چاہے وہ ہر دم جہانِ تازہ تر

خاکیاں را دل بہ بند آب و گل + اندریں عالم بدن با در بند دل

ترجمہ:- اہلِ دنیا کو ہیں سرخوب آب و گل + اور یہاں تن تابعِ فرمانِ دل

معرفت را انتہا نابودن است + زندگی اندر فنا آسودن است

ترجمہ: نیستی ہے معرفت کی انتہا + زندگی راحت ہے آغوشِ فنا

اگر مترجم اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کرے، یعنی مکھی پر مکھی مارے تو ترجمہ کی زبان نامانوس ہو جاتی ہے اور مفہوم سمجھنے میں بھی دقت ہوتی ہے۔ ایثار صاحب نے اشعار کا لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے روایتی، بامحاورہ اور مقبول اندازِ بیاں اختیار کیا ہے۔

آشکارا تر مقام دل از او + جذب ایں دیر کہن باطل از او

ترجمہ:- اس سے واضح تر مقامِ دل کا حال + دل سے مٹ جائے دنیا کا خیال

وہم و شک ما من شبیخوں زدند + عقل و ہوشم را بدار آویختند

ترجمہ:- ہو گیا شک و گماں میں مبتلا + ہاتھ عقل و ہوش سے دھونا پڑا

پختہ تر کاوش نہ خامی ہائے او + من شہیدِ ناتمامی ہائے او

ترجمہ:- خوبیوں سے اپنے ہی وہ پختہ کار + اس کی خامی پر مجھے آتا ہے پیار

حفظِ قرآں حکیم آئین تست + حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست

ترجمہ:- حفظِ قرآنِ کریم آئین ترا + دٹ کے سچی بات کہنا دین ترا

دامنِ آں دیدنے کہ خواب آرد ترا + باز در خوابِ گراں دارد ترا

ترجمہ:- اف وہ دیں غافل بنا دیتا ہے جو + تھپکیاں دے کر سلا دیتا ہے جو
از دلش تاب و تب سیماب رفت + خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت

ترجمہ:- جو تپش دل میں تھی ان کے کھو گئی + جانے تو جو گت ہوئی پنجاب کی

اردو زبان کے مقابلے میں فارسی زبان فکر اور لطافتِ اظہار کے اعتبار سے بلند درجہ رکھتی ہے۔ اقبالؔ نے محسوس کیا تھا کہ ان کے تخیل کی بلندی کو سہارنے کی قوت اردو سے زیادہ فارسی زبان میں ہے۔ ؎

پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

غالباً اسی لیئے انہوں نے فارسی زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔

اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ، اور پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، تمام فارسی اور ارمغانِ حجاز کا زیادہ تر حصہ فارسی میں ہے اور کچھ مختصر حصہ اردو میں ہے۔

ترجمہ میں کلامِ اقبالؔ کی روح اور لہجہ کو برقرار رکھنا نہایت مشکل ہے۔ اقبالؔ کی شعریت اور معنویت، دونوں کو ہو بہو ترجمہ میں منتقل کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اقبالؔ 'ارتباطِ حرف و معنی' کو 'اختلاطِ جان و تن' کہتے ہیں۔ تصورات پر نظر رکھی جائے تو ہیئت اور اسلوب غائب اور اگر ہیئت اور اسلوب پر زیادہ توجہ دی جائے تو تصورات پر گرفت ڈھیلی، اور پھر اقبالؔ جیسی تخلیقی توانائی کسی بھی مترجم میں کہاں۔ ایثارؔ صاحب نے بڑی احتیاط تو برتی ہے، پھر بھی کچھ مقامات ایسے آئے ہیں جہاں بڑی مشکل سے شاہیں زیرِ دام آیا ہے۔ ترجمہ در اصل مفاہمہ ہوتا ہے۔ اپنے ہی خیالات کا اظہار کرنا ہو تو شاعر جس طرح چاہے اظہار کرے۔ لیکن مترجم کو یہ آزادی کہاں۔ وہ اپنی طرف سے نہ اضافہ کر سکتا ہے نہ

حذف، اضافہ اور تبدیلی کر سکتا ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود کئی اشعار کا ترجمہ بالکل اصل کے مطابق ہے اور اس میں اردو کا مزاج بھی باقی ہے۔ اور ترجمہ شدہ اشعار میں اقبال کے لہجے کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ایسا ترجمہ بہت اچھا مگر مشکل مانا جاتا ہے۔ نمونتاً "نوحہ روحِ ابوجہل در حرم کعبہ" سے چند اشعار پیش ہیں۔ ؎

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ + از دم او کعبہ را گل شد چراغ

ترجمہ:- ہے محمدؐ سے یہ سینہ داغ داغ + گل ہے اس کے دم سے کعبہ کا چراغ

از ہلاک قیصر و کسریٰ بر و د + نوجواناں را ز دست ما ربود

ترجمہ:- قیصریٰ و کسریٰ کو ختم اس نے کیا + نوجوانوں کو اڑا کر لے چلا

پاش پاش از ضربتش لات و منات + انتقام از وے بگیر اے کائنات

ترجمہ:- چور چور اس نے کیے لات و منات + بدلہ اس کا تو ہی لے اے کائنات

دل بغائب بست و از حاضر گسست + نقش حاضر را فسوں او شکست

ترجمہ:- کٹ کے وہ حاضر سے غائب پر گیا + نقشِ حاضر کو مٹا کر رکھ دیا

در نگاہِ او یکے بالا و پست + با غلام خویش بر یک خواں نشست

ترجمہ:- اس کے ہاں ہے ایک ہی سب کا مقام + ایک دستر خواں پہ آقا اور غلام

احمراں با اسوداں آمیختند + آبروئے دودماں ریختند

ترجمہ:- اسود و احمر میں کیسی دوستی + آبرو کیا خاندانوں کی رہی

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل + بشکن افسوں نوائے جبرئیل

ترجمہ:- آ ہمارے واسطے بن کر دلیل + توڑ دے سحرِ نوائے جبرئیل

علامہ اقبال کو ملک کے نوجوانوں سے بڑی توقعات تھیں۔۔۔ جاوید نامہ کی ابتدا ایک مناجات سے ہوتی ہے جس کا آخری شعر ہے ؎

بر نوجواناں سہل کن حرفِ مرا + بہر ایشاں یاب کن ژرفِ مرا

ہمارے اُن باذوق نوجوانوں کے لئے جو فارسی سے بالکل ناواقف ہیں یہ کتاب سید احمد ایثار صاحب کی طرف سے انمول تحفہ ہے۔ انہوں نے اقبال کے فارسی کلام کا ترجمہ کر کے ایک بیش بہا ادبی خزانے کو محفوظ کر لیا ہے۔ اس سے پہلے وہ (مترجم) پیامِ مشرق اور زبورِ عجم پیش کر چکے ہیں۔

یہ دور علامہ اقبال کے الفاظ میں انبارِ خس و خاشاک ہے۔ آج کل ادب کا ذوق اور اس کی اہمیت کا احساس ختم ہوتا جا رہا ہے۔ سائنس، کامرس اور انسانیات کے طالب علموں کے لئے ادب کا مطالعہ تضیعِ اوقات سمجھ کر کالجوں سے نکالا جا رہا ہے۔ ایسے دور میں ایثار صاحب کی یہ ادبی کاوش جوئے شیر کا کام ہے۔ اس کے لئے محض شوقِ فضول اور جرأتِ رندانہ ہی کافی نہیں بلکہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے جنوں کی حد تک عشق اور انہماک کی ضرورت ہے۔

یہ کام جز وقتی نہیں، اس کے لئے تو ایک زندگی درکار ہے۔ مادّی آسائشوں سے بے نیاز، مطالعہ اور ترجمہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینا، پھر کتابی شکل میں شائع کرنے کے لئے کتابت اور طباعت کے ہفت خواں سے گذرنا، کثیر مال خرچ کرنا اور انجامِ کار چند باذوق احباب سے داد وصول کر کے شکریہ ایزدِ باری ادا کرنا اور خوش ہو لینا۔ یہ سب وہی کر سکتا ہے جو زندگی کو برتر از اندیشۂ سود و زیاں سمجھتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح سے شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اقبال کے قدر دان اس کتاب کا بڑی مسرت سے خیر مقدم کریں گے۔ اس کتاب کو ہر کالج اور یونیورسٹی میں ہونا چاہئے تاکہ اس سے نہ صرف طالب العلم بلکہ اساتذہ بھی استفادہ کر سکیں۔

آغا مرزا محمود سروش
وظیفہ یاب پروفیسر اردو
کولیجیٹ ایجوکیشن، کرناٹک۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خالد عرفان

جاوید نامہ ــــ ایک عبقری شعری کارنامۂ اقبال

علامہ اقبال کو شاعرِ مشرق کہا جاتا ہے۔ در اصل انہیں آفاقی شاعر کہنا چاہیئے۔ ممکن ہے اس کی وجہ ان کی مشرق پرستی بھی ہو، کیوں کہ وہ بلا شبہ مشرق کو مغرب پر ہر حال میں فوقیت دیتے ہیں۔ انہیں مغرب کی مادہ پرستانہ ترقیوں کا بھی مکمل احساس ہے اور سائنسی دنیا میں اس کے بے پناہ کارناموں کا درک بھی حاصل ہے۔ اس کے باوجود مشرق کو دنیا میں مستقل اقدارِ حیات کا پاسدار اور صحت مند اخلاقی قدروں کا علم بردار قرار دیتے ہوئے مستقبل میں عالمی سطح پر اس کی برتری کی پیشن گوئی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے ہاں نہ صرف ایک فرد کے تعلق سے بلکہ ایک عالمی نظام کے بارے میں بھی ٹھوس تصور، نظریات اور نمونے پائے جاتے ہیں۔ مردِ کامل کا تصور ادبی دنیا میں کئی طرح پیش کیا گیا ہے، پر ایسے تمام نظریات حقیقی سے زیادہ تصوراتی رہے ہیں۔ کیوں کہ کسی کے پاس کوئی عملی نمونہ نہیں رہا تھا۔ یہ صرف اقبال ہیں جن کے ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں 'مردِ مومن' یا 'مردِ کامل' کا ایک بے مثال نمونہ موجود ہے اور ساتھ ہی دینِ متین اور کتابِ مبین کی صورت میں ایک عملی و رجامع نظریۂ حیات اور دستورِ عمل موجود ہے۔ اقبال کی وسعتِ نظری اور فکری گہرائی کا پتہ ہمیں اس امر سے چلتا ہے کہ انہوں نے اس فلسفۂ حیات کو جس کی بنیاد میں مخصوص و مربوط نظریہ اور دستور کارفرما

ہیں محض اکائی کے طور پر نہیں برتا ہے بلکہ دوسری تمام اکائیوں کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ کرتے ہوئے اس کی برتری اور انفرادیت کو ثابت کیا ہے۔ اور یہ سب عمل تخلیقی ہے اور اسی لئے اس میں وہ تمام فنی اور جمالیاتی لوازمات پائے جاتے ہیں جو ادب کا لازمہ و لوازمہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی شاعری کا طرۂ امتیاز یہ رہا ہے کہ اس میں نہ صرف مقامی اور علاقائی زبانوں میں اعلیٰ شاعری کے نمونے پائے جاتے ہیں بلکہ بیرونِ ملک کی زبانوں میں جب بھی مقامی شعراء نے شاعری کی وہ نہ صرف بیرونی زبان کے کلاسکی شعراء کی سطح تک ابھر آئے ہیں بلکہ کئی بار ان سے آگے بھی ہو گئے ہیں۔ ایسی غیر ملکی زبانوں میں فارسی زبان کو اس لئے ایک امتیازی مقام حاصل ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی آمد کے ساتھ ہی درباری زبان کا درجہ حاصل کر پائی تھی۔ ایسا مقام بعد میں انگریزی زبان کو ملا ہے لیکن یہاں تذکرہ فارسی زبان کا ہو رہا ہے۔ امیر خسرو، بیدل اور غالب نے اپنا مقام تو بنالیا ہے، لیکن ان کا دور درباروں سے جڑا ہوا تھا۔ بیسویں صدی میں کئی قادر الکلام فارسی شعراء گذرے ہیں۔ ان میں کس نے ہندوستان سے باہر اپنی حکمت، فراست، علم اور فن کے علم بلند کئے ہیں؟ یقیناً جواب ہوگا علامہ سر محمد اقبال۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے مرشد معنوی مولانا روم جیسے جید عالم اور صوفی باصفا رہے ہوں اور مرشد اکتسابی لسان الغیب حافظ شیرازی جیسے خوش گو، پرفکر اور صاحب طرز شاعر رہے ہوں۔

اقبال کی شاعری کے محور مردِ کامل، اسلام اور قرآن ہیں۔ باقی جتنے بھی موضوع رہے ہوں وہ ذیلی عنوانات کے تحت ہی آتے ہیں۔ اردو کلام میں ان موضوعات پر جس طرح طبع آزمائی کی گئی ہے اس پر علیحدہ سے بحث کی جا سکتی ہے اور اسی طرح فارسی کلام کے اندراجات کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہاں بات 'جاوید نامہ' کو لے کر کی جائے گی جس کا اردو منظوم ترجمہ سید احمد ایثار صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہوئے اس پر ایک سیر حاصل مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس سے 'جاوید نامہ' اور پیامِ اقبال دونوں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ خود میں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جاوید نامہ کی تفہیم کے سلسلے میں ان کے اس ترجمے نے میری رہنمائی ہی نہیں رہبری بھی کی ہے اور میں نے جاوید نامہ کے انگریزی زبان میں ترجمہ کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

'جاوید نامہ' بلاشبہ معراج نامہ ہے جس میں نہایت ہی حکمت، مقصد اور فنی طور پر لطیف انداز میں معراجِ نبوی ؐ کی مختلف منزلوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارض سے عرش تک ہی نہیں بلکہ اس سے پرے بھی لمحوں میں اپنا سفر طے کیا تھا اور آپ پر وہ تمام راز منکشف کر دیئے گئے تھے جو اس کائناتی نظام میں برسرکار ہیں۔ اس خلا سے آگے کے سفر کو مختلف زبانوں میں چند ایک عبقری شاعروں نے اپنے طور پر اپنے اپنے فلسفوں، روایات اور محسوسات کو بیان کرنے کے لئے ماہرانہ طریقہ استعمال کیا ہے۔ لیکن جب اسی واقعہ کو اقبال اپنی ایک تصنیف کی بنیاد بناتے ہیں تو اس کو ایسا فنکارانہ موڑ عطا کرتے ہیں کہ وہ 'چیزے دگر' بن جاتا ہے۔ روایاتی سطح سے بلند ہو کر اس کی بدولت 'کوزے میں دریا' دریافت ہو جاتا ہے اور اس دریا کا نہ کوئی کنارہ ہوتا ہے نہ خاتمہ! بس بہاؤ ہے، اس بہاؤ کے سوار کے نظارے میں وہ تمام حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں جو عدم سے وجود، وجود سے مرگ اور مرگ سے حشر تک اپنی ساری عظمتوں اور پستیوں، ترقیوں اور تنزل، کارناموں اور ناکامیوں، راحتوں اور کلفتوں، اور ارمانوں اور حسرتوں کی داستان لئے

ہوتی ہیں۔

'جاوید نامہ' محض سیرِ افلاک نہیں ہے۔ وہ 'عروجِ آدمِ خاکی' کی داستان کے علاوہ 'سخنے بہ نژادِ نو' بھی ہے۔ ان تین امور ہی سے نہ صرف اس کی مشمولات کا پتہ چلتا ہے، بلکہ اس تصنیفِ بے مثال کے مقصد کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ اس کی جانب ایثارؔ صاحب نے اپنے مقدمہ کی ابتدا میں بہ تفصیل اشارہ کرتے ہوئے خود مصنف کے مقصد کا حوالہ بھی دیا ہے کہ پیرانِ کہن سے ناامید ہو کر وہ نوجوانوں سے مخاطب ہیں اور ان سے بندھی توقعات کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں دعاگو بھی ہیں کہ ؎

بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اندرونِ صفحات اس سلسلے میں جا بجا ایسے اندراجات ملیں گے جس سے مقصدِ تصنیف کا اعادہ ہوتا رہتا ہے۔ اور خصوصی پیغام تو اس کے آخری حصے بعنوان 'خطاب بہ جاوید' میں واضح اور جامع طور پر مل ہی جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی یعنی سرورق کے الٹنے پر جو دو اشعار بطور دیباچہ ملتے ہیں ان سے جو بصارت اور بصیرت ملتی ہے اس سے انسانی ترقیوں کی وہ راہیں منور ہو جاتی ہیں جو آج کے دور میں طے کی جا رہی ہیں، اور جن کی طرف کتابِ الٰہی میں کھلا اشارہ ہے کہ تسخیرِ کائنات بھی انسانی عزائم و فرائض میں شامل ہے۔ دوسرے سیاروں تک اس پیکرِ خاکی کی رسائی اور وہاں زندگی کے آثار کی موجودگی کے ثبوت فراہم کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان دو اشعار میں اقبالؔ نے جو کہا ہے اس سے سوچا جا سکتا ہے کہ انسان صرف 'خاکی پیکر' بن کر نہیں رہ جائے گا بلکہ وہ اور ستاروں کو بھی آباد کرے گا اور ابد سے عدم تک کے اس

سفر میں اس کی مراجعت زمین کی طرف ہو گی۔ ان اشعار کو پھر سے پڑھ لیا جائے تو مزید انکشافات ہوں گے ؎

خیالِ من بتماشائے آسماں بود است
بدوش ماہ و بآغوش کہکشاں بود است
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست
کہ ہر ستارہ جہاں است یا جہاں بود است

مَیں نے مزید انکشافات کی بات کہی ہے۔ ان انکشافات کی جانب خود شاعر نے اشارہ کر دیا ہے۔ غالباً اس لئے نہیں کہ ایسی کوئی سائنسی پیشن گوئیاں اُس زمانے میں رائج ہو چلی تھیں بلکہ اس لئے کہ واقعۂ معراج کی تفصیلات میں ہمیں اشارہ ملتا ہے کہ معراج سے واپسی کے دوران میں حضور اکرمؐ کی ملاقات مختلف افلاک پر مختلف نبیوں سے ہوئی تھی جس سے وہاں زندگی کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ان اشعار سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ 'جاوید نامہ' میں ان مراحل کی جانب بھی اشارہ ملے گا جن سے انسان کو بعد مرگ دوسری دنیا میں گذرنا پڑے گا۔ اس دوسری دنیا کا ذکر بر سبیلِ تذکرہ کئی ایک مقامات پر جیسے 'مقامِ حکیم المانوی نطشہ' اور 'حرکت بجنت الفردوس' وغیرہ آیا ہے۔ لیکن تفصیلی طور پر جن مراحل، مسائل، واقعات اور تصورات کو پیش کیا گیا ہے وہ اسی دنیا سے اور اسی دنیاوی زندگی سے متعلق ہیں۔ حالاں کہ اس کے لئے جو وسیلہ اختیار کیا گیا ہے وہ ماورائی کیفیت کا حامل ہے جس کی وجہ ایک جمالیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور قاری اکتا نہیں جاتا بلکہ اس کا تجسس بڑھ جاتا ہے اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔

تمہیدی اشعار کے بعد ہمیں ایک ایسی مناجات پڑھنے کو ملتی ہے جس میں بقول ایثار صاحب "شکوۂ تنہائی، بے کیفیٔ ایام اور حقائق اشیاء

تک نارسائی کا تذکرہ" ہے۔ یہ مناجات شکووں سے پُر ہے اور ہمیں 'بانگِ درا' کے 'شکوہ' کی یاد دلاتی ہے۔ لیکن ان دونوں شکووں میں کئی امتیازی فرق پائے جاتے ہیں۔ 'بانگِ درا' والے شکوہ میں "رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی" والی کیفیت پائی جاتی ہے جب کہ 'جاوید نامہ' کے شکوہ میں فکر، ٹھہراؤ اور استفسارانہ کیفیات پائی جاتی ہیں۔ وہاں کے مطالبے اور ہیں اور یہاں کے مطالبے اور۔ وہاں تعلی، طعن وطنز اور شوخی کا دامن تھاما گیا ہے یہاں تین عین یعنی علم، عقل اور عشق کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ وہاں اجتماعی مفاد پیشِ نظر ہے اور اُن مادی تصرفات کے مطالبے ہیں جن سے اغیار متمتع ہیں۔ یہاں ارضی ضرورتوں کی سرحدوں سے پرے دیدِ حضور اور جاودانی کیفیت کے مطالبے ہیں۔ اس مناجات کا اختتام دعائیہ ہے جس میں اپنی دلی آرزو کا اظہار ہے کہ وہ جوانوں کی علمی، عقلی، فکری اور عملی بیداری چاہتے ہیں جس سے تسخیرِ کائنات کا عمل بھی جاری رہے اور پاسداریٔ امانت بھی برقرار رہے۔

'تمہیدِ آسمانی' سے فکر انگیزی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ زمین پر آسمان کا طعنہ بجلی بن کر گرتا ہے اور وہ 'پیشِ حق از درد بے نوری تپید' جس پر دریائے رحمت جوش میں آتا ہے اور اسے تسلی دی جاتی ہے کہ ؎

اے امینے از امانت بے خبر
غم مخور، اندر ضمیر خود نگر

اور 'نور جاں از خاک تو آید پدید'۔

تمہیدِ آسمانی کے بعد ایک اہم باب 'تمہید زمینی' شروع ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے 'نغمۂ ملائک' پایا جاتا ہے جس کی ایک خصوصیت لاجواب ہے۔ ملائک جو تخلیقِ آدم پر پہلے نالاں اور پھر حیراں رہے تھے ان

ہی کی زبان سے اس 'مشتِ خاک' کو 'عرش آشنا' اور 'محبوبِ خدا' بتایا جا رہا ہے۔

'تمہیدِ زمینی'۔ یقیناً کتاب کا معرکتہ الآرا باب ہے جہاں سے 'عرشی سفر' کا آغاز ہوتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اقبالؔ اپنی اس 'سیاحتِ سماوی' پر اکیلے نہیں نکل کھڑے ہوتے۔ اپنے مرشدِ معنوی کو رہبر بنا لیتے ہیں جو قدم قدم پر اقبالؔ کی رہبری اس طرح کرتے ہیں جس سے لگتا ہے کہ انہوں نے پہلے ہی ان آسمانوں کی سیر کر لی ہے۔

تمہیدِ زمینی میں سیرِ افلاک کے لئے زمین ہموار کی جاتی ہے۔ یہیں زندہ رود اور پیرِ رومی کے درمیان گفتگو سے ایسے بنیادی تصورات کی وضاحت ہو جاتی ہے جو آگے چل کر مشعلِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔ ایسے حقائق میں 'موجود' اور 'ناموجود'، 'محمود و نامحمود'، 'مراتبِ ظہور'، 'دیدارِ ذات'، 'قوتِ عشق'، 'برہانِ مبین'، 'حقیقتِ معراج'، 'حقیقتِ زمان و مکاں' سب کچھ واضح ہو جاتے ہیں۔ کلامِ شاعر کے ذریعہ راست معلومات حاصل کرنے سے پہلے مترجم صاحب کے مقدمہ سے اس سلسلے میں استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ فلکِ قمر میں داخل ہوا جائے محولہ بالا حقائق میں سے ایک حقیقت کے ایک پہلو کی جانب توجہ مبذول کرنا ضروری ہے ــــ 'جاوید نامہ' دراصل 'معراج نامہ' ہے۔ حقیقتِ معراج اور فلسفۂ معراج کو جس فنکارانہ طریقہ پر یہاں بیان کیا گیا ہے اس سے اذہان پر سے ہر طرح کے نزاعی پردے ہٹ جائیں گے اور حقائقِ معراج خود بخود منکشف ہو جائیں گے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے ؎

چیست معراج آرزوئے شاہدے
امتحانے روبروئے شاہدے

اور جب شاہد و مشہود کے مراحل طے کئے جاتے ہیں تو اپنے ساتھ وہ تمام منزلیں

بھی طے ہو جاتی ہیں جس کے سنگِ میل علم، عشق، عقل، زمان و مکان، تن اور جان ہیں۔ پھر ایک اور مرتبہ فلسفۂ معراج کے بارے میں پوچھا جاتا ہے ؎

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
دار ہا ند جذب و شوق از تحت و فوق
ایں بدن با جان ما انباز نیست
مشت خاکے مانع پرواز نیست

معراج کو اس طرح انقلابِ شعور کے ساتھ جوڑ کر جس حقیقت سے روشناس کرایا گیا ہے اس سے خود انسان نہ صرف اپنے طور پر اس کائنات میں انتہائی بلندیوں پر پہنچ سکتا ہے بلکہ اس سے پرے اٹھ کر ذاتِ حق کے ادراک کی سرحدوں تک جانے کی سعی کر سکتا ہے جو یقیناً معراجِ انسانی ہے۔

سیاحتِ سماوی کی پہلی منزل 'فلکِ قمر' ہے۔ اسی کو اولین منزل ہونا بھی چاہیئے تھا، کیوں کہ خلائی سفر میں زمین سے سب سے قریب چاند ہی پایا جاتا ہے اور اسی کا سحر انسانی ذہن پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ فلکِ قمر میں پھر سے ایسے بنیادی حقائق اور تصورات کے بارے میں استفسار و تشریح کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو انسانی ذہن کو جستجو میں مبتلا رکھتے ہیں۔ سوالات کا سلسلہ زندہ رود سے شروع ہوتا نہیں بلکہ وہیں کے ایک باسی سے ہوتا ہے جن کا راست تعلق ہمارے اپنے وسیع و زرخیز ملک سے ہے، اور یہ باسی ہیں وشوامتر جن کو جہاں دوست کہا گیا ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ عالم، آدم اور حق کیا ہیں؟ پیر رومی دو شعروں میں اس طرح جواب دیتے ہیں کہ نہ صرف ان تینوں اکائیوں کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے بلکہ ان سے متعلق مشرق اور مغرب میں پائے جانے

والے نظریات کا بھی پورا ادراک ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم ایں شمشیر را سنگ فسن
شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید، از حق رمید

اس جواب سے مطمئن ہو کر وشوامتر، زندہ رود سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ پہلے تو مشرق بالخصوص بھارت کے لئے ایک ایسا پیغام دیتے ہیں جو اس کو بیدار کر سکتا ہے۔ پھر دونوں کے درمیان نہایت ہی جامع اور مختصر گفتگو ہوتی ہے جس سے وشوامتر پر مرگِ عقل و قلب، تن و جان، آدم و عالم، علم و ہنر و حجت، دین عامیان و عارفان کے بارے میں صحیح جانکاری ملتی ہے اور وہ خوش ہو کر اپنے نو نکات پیش کرتے ہیں۔ ان نو وصیتوں میں ہندوستانی فکر و فلسفہ کی روح سمائی ہوئی ہے۔ اور اب مسافرانِ سماوی وادیٔ طواسین میں پہنچتے ہیں۔ یہاں چار مذاہب یعنی بدھ مت، زرتشتی مذہب، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات کے کتبے ملتے ہیں۔ ان سے متعلق ضروری معلومات مقدمہ میں نہایت فاضلانہ طور پر شامل ہیں۔

مسافرانِ عرش کی دوسری منزل فلکِ عطارد ہے جہاں ان کی ملاقات رہنمایانِ دین سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا سے ہوتی ہے اور ان کے ذریعہ اس وقت کے ایسے مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے جن کا راست تعلق مسلمانوں اور مسلم ممالک سے ہے۔ اس سے دین اور وطن کے درمیان تعلق کی وضاحت ہو جاتی ہے تو اشتراکیت اور ملوکیت کی اصلیت کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ پھر مشرق اور مغرب کے اقدارِ حیات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مشرق کی برتری کو ثابت کیا جاتا ہے اور ترکوں اور روسیوں کے نام

پیغام دیئے جاتے ہیں جن میں توجہ قرآنی تعلیمات و محکمات کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے اور چند ایسے نازک لیکن اہم معاملات جیسے ربا اور قرضِ حسنہ کی اہمیت ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔

فلکِ عطارد سے عازمین سفر سوئے زہرہ روانہ ہوتے ہیں۔ زہرہ کی وادیٔ شاداب۔ بقول رومی، زندہ رود کی مطلوبہ دنیائے دگر کی طرح ہے۔ یہاں زندہ رود کو 'خدایانِ کہن' سے ملایا جاتا ہے جو اپنی ایک مجلس سجائے بیٹھے خوشیاں منا رہے ہیں کہ اب پھر سے ان کا بول بالا ہو رہا ہے کیونکہ ؎

زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس
آنکہ ما را از لحد بیروں کشید

اس طرح لحد سے باہر لائے جانے پر انہیں جو موقع نصیب ہوا ہے اس سے وہ بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کیوں کہ ؎

از چراغ مصطفےٰ اندیشہ چیست
ز آنکہ او رایف زند صد بولہب!
اہرمن را زندہ کرد افسون غرب
روز یزداں زرد رو از بیم شب!

اس کے بعد ان کی ملاقات ایک دریا کی تہ میں دو ایسی ہستیوں سے ہوتی ہے جن میں سے ایک کا تعلق راست طور پر قدیم ترین تہذیب سے ہے تو دوسرے نے اسی سے ملحقہ علاقہ میں طوفان قہاری پھیلا دیا تھا، فرعون اور لارڈ کچنر دونوں کا انجام غرقابی مقدر تھا اور وہی ہوا۔ ان سے مل کر دو متضاد حقائق سامنے آتے ہیں۔ فرعون کو اس وقت عرفان حق ہوا جب اس کے گلے گلے پانی آ گیا اور اس کی کیفیت ان لوگوں جیسی ہو گئی جو قرآن کریم کے مطابق پچھتاتے ہیں کہ اگر ایک موقع اور نصیب ہو جائے تو وہ ہر طرح کی سعادتیں لوٹ لیں گے۔

اس کے برخلاف کچنر سراپا قہر بن گیا تھا جس کے ہاتھ ہزاروں لوگوں کے خون میں لت پت تھے ایسی سزا پایا کہ اس کو نہ تو زمین نصیب ہوئی نہ اس کی یاد رہی۔ اور اس حقیقت سے پردہ اٹھایا درویش سوڈانی یعنی مہدی نے جنہوں نے اقوامِ عرب کے نام بیداری کا ایسا پیغام دیا ہے جس سے ان کو اپنے ظرف و مقام کے ساتھ اخوت و رہبری کے فرائض کی انجام دہی بھی یاد آجاتی ہے۔

فلک زہرہ سے نکل کر جب یہ دونوں فلکِ مریخ پر پہنچ جاتے ہیں تو یہاں انہیں ایک ایسی دنیا اور زندگی ملتی ہے جو ارضی زندگی سے قریب ہوتے ہوئے بھی ارفع و اعلیٰ ہے اور جہاں کے لوگ ہماری آپ کی زندگی سے بھی واقف ہیں۔ اس لئے یہاں جن موضوعات پر بحث ہوتی ہے ان کا تعلق ہماری زندگی سے راست ہے۔ زندہ رود یہاں کے ایک فلسفی حکیم مریخی سے جو گفتگو کرتے ہیں اس میں خدمت، محنت، تقدیر، تدبیر، خودی، دین، گفتار، کردار، زندگانی جیسے تمام موضوع شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک اور اہم ترین مسئلہ یعنی آزادیٔ نسواں پر رائے زنی کے لئے یہاں ایک فرنگن کو برآمد کیا جاتا ہے جو پہلے تو اپنی نبوت کا دعویٰ کرتی ہے اور پھر عورتوں کو مردوں سے بغاوت کرنے پر آمادہ کرتی ہے یہ کہہ کر کہ ؎

دلبری اندر جہاں مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است
از امومت زرد روئے مادراں
اے خنک آزادیٔ بے شوہراں

اور پھر درس دیتی ہے کہ ؎

رستن از ربط دو تن توحید زن حافظ خود باش و بر مرداں متن

ویسے فلک مریخ میں احساسات اور اعمال کے تعلق سے ایک طرح کی تشنگی اور ناتمامیت کا احساس ابھرتا ہے۔ لگتا ہے کہیں کچھ چھوٹ گیا ہے۔

دیدِ ذات کے ان شیدائیوں کا سفر جاری رہتا ہے اور اب وہ فلک مشتری پر پہنچتے ہیں تو انہیں یہاں ارواحِ جلیلہ سے ملاقات ہوتی ہے جنہوں نے جنت میں قیام کو رد کر کے سیرِ دوام کو پسند کیا ہے۔ ایسی روحوں میں منصور حلاج، غالب اور ایرانی شاعرہ قرۃ العین طاہرہ شامل ہیں ان تین عاشقان حق وحبیب کے انتخاب کے سلسلہ میں ایثار صاحب نے بڑے پتے کی باتیں بتائی ہیں بالخصوص غالب کی شمولیت کے تعلق سے ان کی شخصیت اور فن کے بعض منفرد پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

یوں حلاج، طاہرہ اور غالب کے ساتھ جو شاعرانہ گفتگو ہوتی ہے وہ نہ صرف فلسفیانہ ہے بلکہ عارفانہ بھی ہے۔ اس کی تفصیل مقدمہ میں مل جاتی ہے۔ یہاں صرف ایک خصوصی پہلو کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ منصور حلاج کی زبانی جہاں عبدہٗ و الوہیت کی تفہیم کرائی جاتی ہے وہاں عبد و عبدہٗ کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے اور کوئی واضح تصور ابھر کر نہیں آتا ہے۔ اس باب کا اختتام جہاں خواجۂ اہل فراق ابلیس کا ورود ہوتا ہے نہایت ہی وقیع و بامعنی ہے۔ پُر فراق زندگی کیا ہے؟ اس کا ذکر حلاج کی زبانی ہو ہی چکا ہے ؎

آتش ما را بیفزاید فراق
جان ما را سازگار آید فراق
بے خلشہا زیستن، نا زیستن
باید آتش در تہ پا زیستن
زیستن ایں گونہ تقدیر خودی است
از ہمیں تقدیر تعمیر خودی است

اس خواجۂ اہل فراق کی شخصیت و فطرت کا ادراک شاید ہی کسی اور نے اقبالؔ سے بہتر کیا ہو، کہتے ہیں ؎

رند و مُلّا و حکیم و خرقہ پوش
در عمل چوں زاہدان سخت کوش
فطرتش بیگانۂ ذوق وصال
زہد او ترک جمال لایزال
تا گسستن از جمال آساں نبود
کار پیش افگندہ از ترک سجود

"من 'بلے' در پردۂ 'لا' گفتہ ام" اور "زشتیٔ خود را نمودم آشکار" کہنے والے اس خواجۂ اہلِ فراق کے نالہ میں جو نکات پیش کیے گئے ہیں وہ بالکل نئے ہیں۔ یہاں ایک جانب حسرت ہے، شکایت ہے، شکر ہے، چیلنج ہے اور ساتھ ہی تخلیقِ آدم کی خامی کی جانب اشارہ ہے، کیا اس سے 'عداوتِ آدم' کی وجہ نہیں معلوم ہو جاتی! یہ محض 'رقابت' تو نہیں، کچھ اور ہے۔ اور یہ 'کچھ اور' کیا ہے؟ اس کا ایک جواب اس شعر میں ملتا ہے ؎

آنچناں تنگ از فتوحات آمدم
پیش تو بہرِ مکافات آمدم

اس کے ساتھ ہی مدِ مقابل کے طور پر ایک طاقتور 'مردِ حق' کی طلب کرتے ہوئے ابلیس کے دھوئیں کی طرح غائب ہو جانے پر ہمیں دوسری جانب کے ردِ عمل کا کوئی پتہ نہیں چلتا! اسی لئے خود اقبالؔ بھی خاموش ہیں اور مسافرانِ عرش کو ایک نئی منزل میں لے چلتے ہیں اور وہ ہے فلک زحل جہاں ایسی ارواح سے ملاقات ہوتی ہے جن کے اوصاف رذیلہ ہیں، جو ننگ و ناموس و وطن ہیں، غدارانِ مُلک و مِلک ہیں۔ ان کی کارگذاریوں کے اثرات

کے جائزے کے بعد روحِ ہندوستان کی آمد پر جس ملکی سیاست و انتظامیہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس میں دور اندیشی ہے، دردمندی ہے، عبرت ہے، نصیحت ہے اور بے غرض حب الوطنی کی خاطر دعوت وحدت ہے۔ اور وحدت انسانی اور وحدت الٰہی دو ایسی لازم و ملزوم اکائیاں ہیں جن کی خاطر 'جاوید نامہ' کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔

اس پیغام کے ساتھ ہی حدود افلاک ختم ہو جاتے ہیں اور سیاحت سماوی کے مسافروں کے آگے ماورائے افلاک جو منازل طے کرنے ہیں وہ براہِ راست اُس دربار تک لے جاتی ہیں جہاں سے جلوۂ ذات بھی ممکن ہے اور جہاں آخری عدالت برپا ہوگی۔ پہلی منزل کے 'عقل ما اندر جہانے ذوفنوں' جہانے دیگرے خوار و زبوں' والے ماحول میں اول ملاقات المانوی حکیم نطشے سے ہوتی ہے جس کی شخصیت اور حالات زندگی کو ان دو مصرعوں میں سمو دیا گیا ہے ؎

بود حلاجے بشہر خود غریب
جاں ز مُلّا برد و کشت او را طبیب

اس کے مقام کو اس طرح بیان کیا گیا ہے ؎

با تجلی ہمکنار و بے خبر
دور تر چوں میوہ از بیخِ شجر

اور اس کی حالت پر افسوس کیا گیا ہے ؎

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

اب جب قدم بڑھتے ہیں تو اس دنیا میں داخلہ ہوتا ہے جہاں زمان و مکاں کے حدود ہی نہیں تصورات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس دیارِ بے یمین و یسار اور فارغ از لیل و نہار میں نظریں پہلے جنت کی جانب اٹھتی

ہیں اور جو محل وہاں پہلے نظر آتا ہے وہ 'قصر شرف النسار' ہے۔ شرف النسار تیغ و قرآن کی عاشق تھیں اور جن کی نصیحت تھی ؎

مومناں را تیغ با قرآن بس است
تربت ما را ہمیں ساماں بس است

تیغ اور قرآن کے تعلق کو سمجھ لیا جائے تو مسلمان اپنی زندگی کو تابناک بنا دیں۔

اس کے بعد جن دو ہستیوں سے زندہ رود اور رومی کی ملاقات ہوتی ہے ان کا تعلق راست اور بلاواسطہ دونوں طرح آزاد ہندوستان سے ملحقہ ایک ایسی ریاست سے ہے جو پچھلے پچپن برسوں سے ایک مسئلہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا تنازعہ بنی ہوئی ہے جس نے بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لی ہے اگر 'جاوید نامہ' میں جس طرح تاریخ و سیاست کشمیر کا نقشہ بزبان شاہ ہمدان اور ملّا طاہر غنی پیش کیا گیا ہے پڑھ لیا جائے تو بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس تنازعہ کی جڑیں کہاں تک پہنچی ہوئی ہیں اور اس خطۂ زمین کے اصل حقدار کون ہیں۔ یہیں ہمیں 'شاہی و فقیری'، 'آزادی و غلامی'، 'تن و جان' وغیرہ تصورات زندگی کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے، کشمیریوں کے استحصال کے بیان کے لئے یہ ایک شعر کافی ہے ؎

دست مزدِ او بدستِ دیگراں
ماہیٔ رودش بہ شستِ دیگراں

اسی استحصال کا نتیجہ ہے کہ ؎

دہقاں و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اس تنازعہ کو حل کرنے والوں کے لئے بھی یہاں رہنمائی ملتی ہے۔ یہاں صرف دو شعر نقل کئے جا رہے ہیں۔ ان کو کس کس پر، اور کیسے حل کیا

جاسکتا ہے وہ اہلِ خرد ہی جانیں۔ ایک شعر ہے سلطنت نازک تر آمد از جہاں بہ۔ از دمے او را تواں کردن خراب
اور دوسرا شعر ہے ؎ تا زجاں بگذشت جانش جانِ اوست بہ ورنہ جانش یک دو دم مہمان اوست
جنت کی سیر کرتے ہوئے بھی علامہ اقبال نے اس خطۂ ارضی کو نہیں بھلایا
جو اُن کا وطنِ عزیز ہے، اور جس سے انہیں اسی قدر لگاؤ رہا ہے جس قدر کہ اس ملتِ
بیضا سے جس کے وہ ایک فرد ہیں۔ انہیں یہاں شاعرِ ہندی بھرتری ہری ملتے ہیں جن کے بارے
میں اُن کی رائے ہے ؎ کار گاہِ زندگی را محرم است

او جم است و شعرِ او جامِ جم است

ان سے جو گفتگو کی جاتی ہے اس سے ماہیئت شعر اور سیاستِ ہند
کے بارے میں جامع نکات ملتے ہیں اور شاعرِ ہندی بھرتری ہری
کی جس غزل کا فارسی ترجمہ کیا گیا ہے، اس سے مقتدر رہنمایانِ ہند کو خواہ وہ کسی
پارٹی، مسلک یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں راست رہنمائی ملتی ہے۔ انہیں یہ
نصیحت بھی اپنے دامن میں باندھ لینا چاہیئے ؎

پیش آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گذار

زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

مختلف افلاک پر جن ہستیوں سے مسافرانِ عرش نے ملاقات کی تھی ان میں
درویش بھی تھے، رشی بھی، رہنمائے دین بھی، غدار بھی، شاعر بھی اور دعویدارِ نبوت
بھی، لیکن جنت میں جن پاک ارواح سے ملا جاتا ہے ان میں متقی و پرہیزگار افراد
کے علاوہ صاحبِ علم اور صاحبِ ملک بھی ہیں۔ موخرالذکر افراد کے نمائندے تین
سلاطین ہیں جن کا تعلق ایران، افغانستان اور ہندوستان سے ہے۔ مقصد
یہاں ماضی کو کریدنا نہیں ہے بلکہ موجودہ حالت سے واقفیت حاصل کر کے
مستقبل کے لئے تھوڑی بہت رہنمائی دینا ہے، اسی لئے نادر شاہ کی جانب سے
استفسار کیا جاتا ہے تو زندہ رود اول تو وہاں صحتمند تبدیلی کی بات کرتے ہیں کہ

تا ز صحرائے رسیدش محشرے
آنکہ داد او را حیات دیگرے

پھر کہتے ہیں ؎

آہ احسان عرب نشناختند
از تشِ افرنگیاں بگداختند!

ایران کے اس نمائندہ سلطان کا افغانستان کے احمد شاہ ابدالی اور ہندوستان کے شیرِ میسور ٹیپو سلطان شہیدؒ سے کوئی موازنہ نہیں۔ اس امر کو غالباً علامہ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ یہاں انہوں نے ناصر خسرو کی غزل شامل کرلی جس میں ؎

بے ہنرداں نزدِ بے دیں ہم قلم ہم تیغ را
چوں نباشد دیں نباشد کلک و آہن را

کے حوالے سے ایسی تخصیص ہوجاتی ہے کہ ذہن بھٹک نہیں پاتا۔

اقبالؔ کے ہاں کہستان افغانستان اور فقرِ غیور افغانیوں کا بڑا مقام ہے 'بالِ جبریل' اور 'ضربِ کلیم' سے لے کر 'پیامِ مشرق' اور 'جاوید نامہ' تک بغیر ان کے حوالے سے بات نہیں کی گئی ہے۔ 'جاوید نامہ' میں جمال الدین افغانی کی زبانی : 'بگذر از شام و فلسطین و عراق' کہہ کر ان ممالک سے کوئی امید نہیں لگائی ہے لیکن ابدالی کے ذریعہ

آسیا یک پیکر آب و گل است
ملت افغاں دراں پیکر دل است

کہلوا کر اپنے اس رجائی تعلق کا اظہار کیا ہے۔ براعظم ایشیا میں افغانستان کی سی مرکزی اہمیت کو سمجھتے ہوئے غالباً امریکہ نے پچھلے برسوں میں اسی کو نہ صرف اپنا مہرہ بنایا تھا بلکہ حال ہی میں دہشت گردوں کی پناہ گاہ کا الزام لگا کر

افغانی جانبازوں کی اجتہادی قوتوں کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ اقبالؔ نے مغرب کی ترقیوں کے راز کو فاش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے ؎

قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

اور

علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوس فرنگ
فکر چالاک اگر داری بس است
طبع درّاکے اگر داری بس است

کہہ کر ان کے حصول کی راہ بھی بتادی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی طور پر خود مکتفی بننے کی بھی تلقین کی ہے۔ اس کے لئے کہا ہے ؎

غربیاں را شیوہ ہائے ساحری است
تکیہ جز بر خویش کردن کافری است

ایک ہی تخت پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تیسرے بادشاہ وہ مردِ حر ہیں جو ریاستِ میسور کے اس وقت کے حکمراں تھے جب کہ پردیسی حکمراں ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے اور ان کی اس راہ میں وہ سب سے بڑا کانٹا بنے ہوئے تھے۔ ٹیپو سلطان شہید رح کی ذات اور شخصیت نادر و ابدالی سے منفرد محض ان کی حریت پسندی اور جاں فروشی کی وجہ نہیں ہے۔ ان کے ہاں ان دونوں سلاطین کی طرح ہوسِ اقتدار، دولت اندوزی اور خونریزی کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی، وہ نہایت عادل، روادار، دور اندیش اور خدا پرست عوامی حکمران تھے، جن کے پیام بنام کادیری میں حیات و مرگ و شہادت کی حقیقت آشکار کی گئی ہے۔ یہ تین شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست
موت نیرنج و طلسم و سیمیاست
ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ
زندگی او را حرام از بیم مرگ
بندۂ آزاد را شانے دگر
مرگ او را می دہد جانے دگر

جنت سے روانگی کے وقت حوریں ان دونوں کو گھیر لیتی ہیں اور رکنے کو کہتی ہیں، لیکن قلندروں کے مزاج میں قیام کہاں! پر انہیں چھوٹ اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ایک غزل نذر کریں۔ اس میں جو خاص پیام دیا گیا ہے اس میں وہ 'نظر' یا 'نگاہ' بھی شامل ہے جو 'نگہ' سے کم نہیں۔ کہتے ہیں ؎

نظر ز صحبت روشندلاں بیفزائد
ز درد کم بصری تو تیا چہ می جوئی
قلندریم و کرامات ما جہاں بینی است
ز ما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی

ان مراحل و منازل سے گذرنے کے بعد جب منزل مقصود سامنے آجاتی ہے تو شاہد معنوی کا خود سے نظارہ کرنا پڑتا ہے۔ زندہ رود کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ معراج نبوی ؐ کی انتہا دیدار حق تھا۔ زندہ رود کو بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو ؎

عشق جاں را لذت دیدار داد
با زبانم جرأت گفتار داد

جرأتِ گفتار کے تیور تو دیکھئے کس دھڑلے کے ساتھ اسی ہر شوخ نہیں

گستاخ ہر جذب نہیں بیباک، کے انداز میں کہا جاتا ہے ؎

ایں چنیں عالم کجا شایان تست
آب و گل داغے کہ بر دامانے تست

اس گستاخی اور بیباکی کے جواب میں چاہیئے تو یہ تھا کہ جلالی قہر کا اظہار ہوتا، لیکن، نہیں، یہاں تو مہر جمالی کی کارفرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

کلک حق از نقشہائے خوب و زشت
ہر چہ ما را سازگار آمد نوشت

اور ؎ از جمال ما نصیب خود ببرد
از نخیل زندگانی بر بخورد

ہدایت ملتی ہے ؎ مرد حق! برندہ چوں شمشیر باش
خود جہاں خویش را تقدیر باش

اسی جمالی ندائے فرد اور ملت کی رہنمائی ان الفاظ میں کی ہے ؎

فرد از توحید لاہوتی شود
ملت از توحید جبروتی شود

فرد کے لئے ؎ آن یکی را بیند ایں گردد یکی
در جہاں با آں نشیں با ایں بزی

کے ذریعہ ہدایت ملتی ہے تو ملت کی خصوصیات کو بیان کرنے کے لئے 'باہزاراں چشم بودن یک نگہ!' اور 'خیمہ ہائے ما جدا، دلہا یکے است' کہا جاتا ہے

ایک سوال جو ہر متجسس فرد کے ذہن کو کریدتا رہتا ہے، زندہ رود کو بھی پریشان کئے ہوئے ہے، وہ پوچھ اٹھتے ہیں ؎

من کیم؟ تو کیستی؟ عالم کجا است
درمیان ما تو دوری چرا است؟

من چرا در بند تقدیرم بگوئے
تو نمیری من چرا میرم بگوئے!

اسی ندائے جمال کی وضاحت آتی ہے کہ تو 'جہان چار سو' میں قید ہے جس کی وجہ موت کا آنا لازمی ہے، اور اگر یہ چاروں جہات اپنے اندر ضم ہو جائیں تو فنا سے بچا جا سکتا ہے اور حیات جاودانی مل سکتی ہے۔

زندہ رود کہ مشرق و مغرب کے درمیان وسائل زندگی اور طرزِ زندگی میں پائے جانے والے ارض و سما کے بُعد سے مضطرب رہے تھے۔ چہرۂ تقدیر سے پردہ اٹھانے کے لئے کہتے ہیں کہ قادرِ مطلق کے جلال کو جوش آجاتا ہے اور بجلی سی چمکتی ہے، زندہ رود کو جھٹکا لگتا ہے اور وہ گر پڑتے ہیں۔ اسی عالم میں نوائے سوز ناک آتی ہے کہ 'بگذر از خاور و افسونِ افرنگ مشو' اور تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تو جان لے ؎

زندگی انجمن آرا و نگہدار خود است
اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو باہمہ رو
از تنک جامیٔ تو میکدہ رسوا گردید
شیشۂ گیر و حکیمانہ بیا شام و برو

سب کے ساتھ چلتے ہوئے سب پر اپنا پرتو ڈالتے رہنے کی اس دعوت یا تلقین کے ساتھ ہی 'جاوید نامہ' کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کے بعد 'خطاب بہ جاوید' کے تحت 'جاوید نامہ' کا اصلی مقصود بیان کیا گیا ہے۔ اس کی جانب 'مناجات' میں بارگاہِ الٰہی میں دعا سے پہلے اشارتاً کہا گیا تھا ؎

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن

آنے والی نسلوں کے لئے کل ملا کر چھ افلاک کی سیر کے دوران میں

وقیع شخصیتوں اور دنیاوی مسائل سے متعارف کرا کے ان کے ذہن بنانے کے بعد اقبال اپنا خصوصی پیام دے رہے ہیں جو صرف نژادِ نو کے لئے ہے اور جس پر پابند ہو کر ہی وہ ایک صالح معاشرے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ جوانوں سے اس خطاب میں اقبال، قلم اور ادب سبھی جواں ہو جاتے ہیں۔ ایسے وقیع بیان کی ابتدا یوں ہوتی ہے ؎

گرچہ من صد نکتہ گفتم بے حجاب
نکتۂ دارم کہ ناید در کتاب

پھر ماں کی گود سے لے کر مومنان فراست بننے تک ہر موڑ پر مطلوب تمام صفات و اعمال سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ جس طرح خیر و شر میں انتخاب کی آزادی حق نے عطا کی ہے اسی طرح لا الٰہ کا درس اول حاصل کرنے کے بعد سوز لا الٰہ کے حصول کے لئے ذوق نظر و طلب، جذب باطن، منزل شناسی، فکر و ذکر جیسے اعمال کے انتخاب کے لئے بھی جوان اپنے شعور پر تکیہ کر سکتے ہیں، تب کہیں جا کر انہیں پتہ چلے گا کہ ؎

علم حق اول حواس آخر حضور
آخر او می نگنجد در شعور

اور

دیں سراپا سوختن اندر طلب
انتہایش عشق و آغازش ادب

اور

ستر زن یا زوج یا خاک لحد
ستر مرداں حفظ خویش از یار بد

یہ اور ایسے کئی صفات سے مزین ہو کر ہی پتہ چلے گا کہ ؎

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست

اس شعوری جانکاری سے جو حقیقت واضح ہوگی وہ ہے ؎

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

اس انکشاف کے بعد یہ مومن کی فراست ہی ہے جو اس عالم ناپائیدار کو ایک گلشنِ سدا بہار میں تبدیل کر سکتی ہے۔

بنگلور

خالد عرفان

8/1، دوسرا کراس
کے ایچ بی روڈ، سلطان پالیہ
بنگلور۔ ۵۶۰۰۳۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

سید احمد ایثار

فارسی زبان میں علامہ اقبالؔ کی جملہ سات کتابیں ہیں۔ تاریخِ اشاعت کے لحاظ سے ان کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:

۱۔ اسرارِ خودی	۱۹۱۵ء	۵۔ جاوید نامہ	۱۹۳۱ء
۲۔ رموزِ بیخودی	۱۹۱۸ء	۶۔ پس چہ باید کرد	۱۹۳۶ء
۳۔ پیامِ مشرق	۱۹۲۳ء	۷۔ ارمغانِ حجاز	۱۹۳۸ء
۴۔ زبورِ عجم	۱۹۲۶ء		

ان سات کتابوں میں 'پیامِ مشرق' اور 'ارمغانِ حجاز' کی نوعیت بلحاظ باقی ماندہ کتابوں کے جدا ہے۔ 'پیامِ مشرق' ایک رنگ برنگے مضامین اور منظومات کا دل کش نگارخانہ ہے۔ ان میں رباعیات ۔ لازمطور ۔ کتاب کی زینت ہیں۔ بہاریہ نظمیں، فلسفیانہ مضامین اور لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کے کلام کی مٹھاس سے مملو، سوز و سرود سے لبریز 'مئے باقی' کی غزلیں اس کے امتیازی نشانات ہیں۔

'ارمغانِ حجاز' آپ کی آخری تصنیف ہے جو آپ کے وصال کے بعد اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں فارسی اور اردو کا باقی ماندہ کلام ایک ہی جلد میں محفوظ کیا گیا ہے۔ اردو کا حصہ بالکل مختصر ہے۔ اس کے برعکس فارسی رباعیات کی

تعداد ۱۱۳ ہے۔ ان میں ۱۶۱ رباعیات آپ کے ذہنی سفر حج و زیارت کے تاثرات لئے ہوئے ہیں۔ باقی کلام اسلامیات کے مختلف موضوعات پر مبنی ہے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ باقی پانچ کتابیں فکر کی یک رخی اور خیالات کے ارتقا پذیر تسلسل کی کیفیت کی حامل ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت تصنیف کی گئی ہیں۔

'اسرارِ خودی' میں فرد کی خودی کی تربیت کا ایک مستقل پروگرام ہے۔ اس کتاب میں تحقق و استحکامِ خودی پر پورا زور صرف کیا گیا ہے۔ در اصل یہ ایک انقلابی تحریک ہے جس میں صوفیانہ نظریۂ بے خودی اور ترکِ عمل کے خلاف گویا اعلانِ جنگ ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق اور حصولِ مرتبۂ نیابتِ الٰہی کی ترغیب اس کا منتہائے مقصود ٹھہرایا گیا ہے۔

'رموزِ بے خودی' میں خودی سے آراستہ و مستحکم افراد کو ایک ملّت میں ضم ہو کر، اپنی خود سپردگی اور یکتائی کی اساس پر اٹھنے والی ایک ایسی قوم کی تشکیل کا نظریہ ملتا ہے جو یکتائے زمانہ ہو اور تمام اقوام و عالم کے لئے نشانِ رحمت ہو سکے۔

'زبورِ عجم' مجموعۂ اسرارِ توحید ہے۔ اس کے غزلیات لحنِ داؤدی کے چھلکتے پیمانے ہیں۔ 'گلشن رازِ جدید' اس کتاب کا ایک باب، وحدت الوجود کا ایسا نگارخانہ ہے جس میں آپ نے خودی کو ظلِ ذاتِ حق کہہ کر متعارف کرایا، اور وحدت الشہود کے نظریہ کو اپنایا ہے۔ وحدت الشہود اور وحدت الوجود میں بس نام کا فرق ہے۔ دونوں مرکزیت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ ساری کائنات مظہرِ ذات و صفات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

چوں کہ توحید کی قلمرو میں ماسوا کی بندگی حرام ہے اس لئے علامہ نے گلشن رازِ جدید کے ساتھ آخری باب 'بندگی نامہ' کا اضافہ کیا اور غلامی کے

بھیانک اثرات کو نہ صرف انسانی زندگی پر بلکہ فنونِ لطیفہ پر بھی بہ صراحت دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ مردانِ حر کی تعمیرات میں باعثِ تعمیر ہستیوں کی شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

فرد کی تربیت، ایک مثالی معاشرے اور ملّت کی تشکیل کے بعد، اس کے استحکام کے لیے نظریۂ توحید کی اہمیت کو جتلایا ہے۔ اب عصرِ نو کے سامنے ایک مثالی شخصیت کو پیش کرنا تھا۔ چنانچہ علامہ نے اس کو اپنی تصنیف 'جاوید نامہ' میں پیش کیا ہے۔

جاوید نامہ اول سے آخر تک محاکاتی طرزِ تخلیق کا ایک اچھوتا نمونہ ہے۔ اس میں عشق کی کرشمہ کاری اور علم کی فتوحات دونوں کا ذکر ملتا ہے۔ نیک و بد اعمال کے نتائج، ماضی، قریب اور حال کے مباحث کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک کے اکتشافات کی پیش گوئی بھی واضح طور پر کی گئی ہے۔ فنّی لحاظ سے یہ کتاب فکر کی بلندی، اسلوب کی سحر آفرینی اور موضوعات کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ منظر نگاری کی بہترین مثال ہے۔

جاوید نامہ کا مرکزی موضوع 'آدمی' ہے۔ یعنی مردِ کامل کی جستجو۔ نطشے کا سوپرمین (Superman) نہیں بلکہ ایک 'مومن' ہے جس کی تلاش رومی کو تھی ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

علامہ اقبالؔ نے کیسے کیسے مشاہیرِ مشرق و مغرب کی صحبت پائی۔ ان کے علم و حکمت کے دفتر کھنگال کر دیکھا۔ لیکن جو کشش مثنوی اور صاحبِ مثنوی مولانائے روم میں پائی وہ سب سے سوا رہی۔ لہٰذا ان کو اس کتاب میں اپنا رہبر بنایا اور ان کے ہمراہ آسمانوں کی سیر کرتے ہیں۔

علم کی فتوحات اور عشق کی کرامات دونوں پر علامہ کی گہری نظر تھی۔ عشق کو صدیوں کا سفر لمحوں میں طے کرتے دیکھا تو علم کو قدم بہ قدم آگے بڑھتے پایا۔ آپ کی نظر میں علم و عشق دونوں کی اہمیت ہے۔ کیوں کہ دونوں کا منتہائے مقصود حقیقت کی تلاش ہے۔ علم کے باب میں کہا ہے

کارش از تدریج می یابد نظام
من ندانم۔ کے شود کارش تمام

تو عشق کے باب میں فرمایا ہے

کوہ پیش عشق چوں کاہے بود
دل سریع السیر چوں ماہے بود

جاوید نامہ کی منظر نگاری کے محاسن سے علامہ بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا کہا کہ اگر کوئی مصور ان مناظر کو اپنے فن کی گرفت میں لا سکے تو خود کو بھی زندۂ جاوید کر لے گا۔ الفاظ میں کیا کیا نقوش کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ دشوار گزار کا حلیہ، دریائے خون کی طغیانی، تند ہوائیں، جھپٹتے ہوئے زہریلے سانپ اور کشتی سوار، زروان کا دو رنگی سیاہ و سفید چہرہ، ایک آنکھ کھلی ہوئی اور دوسری خواب آلودہ وغیرہ مناظر کے خاکے رنگ بھر کر پیش کیے جانے کے قابل ہیں۔

غلط ہوگا اگر یہ کہیں کہ علامہ اقبال نے یہ کتاب ڈانٹے کی اتباع میں تصنیف کی ہے۔ ممکن ہے ڈانٹے کی "کامیڈیا" سے تحریک ملی ہو۔ لیکن اسلامیات میں خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کے واقعات بالکل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ علاوہ بریں اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے کشف و کرامات کے واقعات بھی موجود ہیں۔ پھر کیوں نہ ہم ان کو اس تصنیف کا محرک سمجھیں۔ اس کے برعکس ڈانٹے کا اسلامی روایات سے استفادہ

کرتے ہوئے 'کامیڈیا' کو وجود بخشنا بالکل قرینِ قیاس ہے۔

تصنیف کی ابتدا

جاوید نامہ کی تصنیف کے باب میں کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کو اس قسم کی ایک کتاب تصنیف کرنے کی فکر مدت سے تھی۔ ۱۹۲۹ء میں علامہ کو "خطباتِ مدراس" کے سلسلہ میں جنوبی ہند کا سفر درپیش ہوا۔ زیارت بارگاہِ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کی آرزو بھی دل میں مدت سے چٹکیاں لے رہی تھی۔ لہٰذا علامہ نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ مدراس میں اپنی کارگذاری کے بعد ۱۸ جنوری کو بنگلور پہنچے اور ۱۰ جنوری کو وارد میسور ہوئے۔ دوسرے دن مہاراجہ میسور سے ملاقات اور کرشنا راج ساگر سے ہوتے ہوئے سری رنگ پٹن پہنچے۔ روضۂ سلطانی پر حاضری دی۔ واپسی پر نڈھال تھے اور آنکھیں نم تھیں۔ باہر آپ سنگِ سیاہ کے ستون سے لگ کر آنسو بہا رہے تھے۔ حاضرین کی طرف سے پیغامِ سلطانی کے سلسلہ میں پوچھا گیا تو فرمایا: "پیغام تو بہت سے ملے ہیں، لیکن ان میں ایک شعر کی صورت میں یوں ہے ؎

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہم چوں مرداں جاں سپردن زندگیست"

یہیں سے 'جاوید نامہ' کی تصنیف کے رخ کا تعین ہوتا ہے۔ لاہور واپسی پر ۱۲ مارچ ۱۹۲۹ء کو مزید چار اشعار کے ساتھ مذکورۂ بالا شعر بھی "انقلاب" لاہور میں شائع کیا گیا۔ (دانائے راز دیارِ دکن میں سلیم تمنائی)

کتاب کی ابتدا مناجات سے ہوتی ہے۔ اس میں شکوۂ تنہائی، بے کیفیٔ ایام اور حقائق اشیاء تک نارسائی کا تذکرہ ہے۔ ساتھ ہی روشن ضمیری کے لئے تڑپ اور حیاتِ جاودانی کی آرزو کی گئی ہے۔ بظاہر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خود اپنے لئے ہے۔ لیکن اس کے آخری بند سے

ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام نعمتیں آپ نے اپنی قوم کے لئے اور خصوصاً آنے والی نسل کے لئے مانگی ہیں۔ اور اس میں تمام بنی نوع آدم کی بہبودی کا سامان ہے۔ یہاں تو اس کا ذکر بالکل مختصر طور پر ہے لیکن کتاب کے آخر میں جو ضمیمہ "خطاب بہ نژادِ نو" کے تحت ہے، اس میں تفصیل پائی جاتی ہے۔ مناجات کے آخر میں واضح کر دیا ہے کہ یہ کتاب بالخصوص آنے والی نسل کی ہدایت کے لئے تصنیف کی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ؎

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن
دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرفِ مرا
بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

تمہیدِ آسمانی

اصل کتاب کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ خالقِ کائنات نے جب آسمان کو پیدا کیا تو اس کو اجرامِ فلکی سے سجایا۔ ان گنت قندیلوں سے اس کو روشنی عطا کی۔ اس کے برعکس زمین کو بے نوری اور ویرانی کے سوا کچھ نہ ملا۔ کہیں زندگی کا نشان نہ تھا۔ پانی نہ فضا میں تیرتے ہوئے بادل، نہ ہی کوئی پنکھ مارتا پرندہ۔ یہ دیکھ کر آسمان نے زمین پر طعنے کسے۔ مفلس و بدنہاد کہہ کر اس کی غیرت کو للکارا ؎

یا بزی با ساز و برگِ دلبری
یا بمیر از ننگ و عارِ کمتری

بے چاری زمین بارگاہِ خداوندی میں اپنا دکھڑا سناتی ہے۔ آوازِ غیب سے اس کی دل دہی کے ساتھ بشارت دی جاتی ہے کہ اس کے بطن کے اندر بے انتہا خزانے مخفی رکھے گئے ہیں اور آنے والے زمانے میں ان کا ظہور ہوگا۔

سب سے افضل ترین خلقت، "انسان"، اس پر بسیرا کرنے والی ہے، جس کی فتوحات سے آسمان کو بھی شرمندہ ہونا ہوگا۔ اس کی روشنی کے آگے چاند سورج بھی مات ہو کر رہیں گے وغیرہ۔

تمہیدِ زمینی

یہ کتاب کا معرکتہ الآرا باب ہے۔ اس کی وضاحت بھی قدرے مشکل ہے۔ اسرارِ معراج کے پردے میں تکمیلِ بشریت کے لئے راہ ہموار کی گئی ہے۔

شام اور غروبِ آفتاب کا وقت ہے۔ علامہ اقبالؔ دردِ تنہائی میں مبتلا مولانا رومؔ کی "آرزوست" والی غزل گنگنا رہے ہیں۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم ہے اور ایسے میں آسمان سے ایک نور ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں ایک ٹیلے کی اوٹ سے روحِ رومیؔ نمودار ہوتی ہے۔ نور و سرور میں سراپا غرق، زبان پر اسرارِ وجود، یہ عالم تھا کہ معانی خود بخود کھلتے جا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر علامہ کو اپنی مشکلات کے حل کی سوجھی۔ استفسار کے لئے حوصلہ نے دست دہی کی۔ 'موجود' اور 'ناموجود' نیز 'محمود' اور 'نامحمود' کے معنی پوچھے۔ مولانا نے واضح الفاظ میں بتلایا کہ 'موجود' وہ کہلائے جو خود کو ظاہر کرے۔ اس لئے کہ ظہور تقاضائے وجود ہے۔ واقعۂ میثاق (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ) خود اس کا ثبوت ہے۔ خالقِ کائنات نے خود اپنے وجود پر بندوں سے گواہی طلب کی تھی۔ 'وجود' کے تین مراتب ہیں اور اس کے لئے تین امتحانوں سے گذرنا ہوگا۔

۱) ہمارے لئے پہلا امتحان خود آپ سے اپنے وجود کا تحقق ہوگا۔ اگر ہم خود کو اس مرحلہ میں موجود پائیں تو کامیابی ہوئی۔

۲) دوسرا امتحان ماسویٰ کے آگے خود کو پیش کر کے اپنے وجود

کو جبتلانا ہوگا۔

۳) تیسرا اور آخری امتحان واجب الوجود کی بارگاہ میں خود کو پیش کرکے اپنے وجود پر گواہی طلب کرنا ہے۔ اگر یہاں بھی کامیابی مل جائے تو ہم خود کو خدائے واحد کی طرح زندہ و پائندہ تصور کر سکتے ہیں۔ واقعۂ معراجِ نبوی ؐ کی حقیقت یہی ہے۔ دیدارِ ذات کے وقت آپ نے نہ پلک جھپکائی اور نہ حد سے تجاوز کیا۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی آیتِ قرآنی اس پر شاہد ہے۔ یہی مقامِ تکمیلِ بشریت ہے اور یہی مقامِ محمود بھی ہے

چیست معراج آرزوئے شاہدے
امتحانے روبروئے شاہدے
در حضورش کس نماند استوار
ور بماند ہست او کامل عیار

رومی اس باب میں فرماتے ہیں ؎

آدمی دید است و باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

دیدارِ ذات کے بغیر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان کہاں ہوتا۔ آپ کو اس انتہائی مقامِ عبودیت کو پانا تھا۔ امتِ مرحومہ کو آشنا کرانا تھا۔ علامہ فرماتے ہیں ؎ سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ ؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

علامہ اقبال کے لئے دیدارِ ذات کی راہ میں ہمت شکن مشکلات کا تصور حائل تھا۔ جہات میں محصور انسان، آسمانوں اور عرش کی بلندی کو چھونے کا حوصلہ کہاں سے لائے۔ مرئی اور غیر مرئی حدود کو کیسے پار کرے۔ مولانا روم نے یہ آیت قرآن ..... اِلَّا بِسُلْطَانٍ یاد دلائی۔ (یعنی

تصدیق کی کہ ہاں چھو نہیں سکتے مگر ایک زبردست قوت کو حاصل کرنے کے بعد)۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ ان حدود کو پار کرنا ممکن ہے۔ انسان کی خلائی پروازیں اسی کی طرف ایک اشارہ ہیں۔ کتنی صدیوں کی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہے جو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ علم ہو یا عشق، دونوں کا مقصود ایک ہے۔ زماں و مکاں کی تسخیر ایک کٹھن مسئلہ ہے۔ لیکن فی زمانہ سائنس کی فتوحات کے پیشِ نظر یہ بھی ممکن ہے۔ گو اس کا سفر قدم بہ قدم ایک طویل مدت میں طے ہوگا۔ اس کے برعکس عشق کے ذریعہ اس کو لمحوں میں طے کیا جا سکتا ہے۔ معراجِ نبویؐ اور کشف اولیائے کرام اس کے بیّن ثبوت ہیں۔

۱۹۳۲ء میں علامہ نے مسلم لیگ کے جلسہ میں خطبہ صدارت دیا۔ وہاں یہ خیال ظاہر فرمایا کہ "مذہبِ اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادّہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزا ہیں۔"

اور لالۂ طور کی رباعی نمبر ۱۵۲ میں جان و تن کی حقیقت کا بیان اس طرح فرمایا۔

ے یہ جانِ من کہ جاں نقشِ تن انگیخت
ہوائے جلوہ ایں گِل را دو رو کرد
ہزاراں جلوہ دارد جانِ بے تاب
بدن گردد چو با یک شیوہ خو کرد

یعنی ہمارا جسم جان ہی کا تعین ہے۔ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں خیال ظاہر کیا کہ روح مادّے کی ایک لطیف شکل ہے۔ خود جاوید نامہ میں اہلِ مریخ کی کیفیتِ مرگ کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہے۔ فرمایا ہے

اک دو روزے پیشتر از آنِ مرگ
می کند پیشِ کساں اعلانِ مرگ
تن بہ خویش اندر کشیدن مردن است

از جہاں در خود رمیدن مردن است

یعنی اہلِ مریخ قبل از وقتِ مرگ اعلانِ مرگ کر دیتے ہیں اور جسم کو جان میں جذب کر لینا ان کی موت ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ روح جسم میں اور جسم روح میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔

تیسرے درجہ میں امتحانِ وجود میں کامیابی اور 'دید'، تکمیلِ بشریت کی شرط ٹھہری۔ دیدارِ حق ہی دراصل معراج ہے۔ علامہ اقبالؒ نے وضاحت میں جسمانی و روحانی معراجِ نبویؐ کی موشگافیوں کو صرفِ نظر کرتے ہوئے تیسرے رخ کی طرف رہنمائی کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

از شعور است اینکہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

نصِ قرآنی ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدْ (۵۰:۱۶) "ہم اس سے نزدیک ہیں، دھڑکتی رگ سے زیادہ۔" اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ انسانوں سے انتہائی درجہ قریب ہے اور ساتھ ہی اس سے انتہائی دوری کا احساس بھی حقیقت ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ اس دوری کو ختم کرنے کے لئے شعوری انقلاب ضروری ہے۔ یعنی عرفان و عشق۔ اس کے ذریعہ حق سے اس دوری کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

علامہ اقبال نے "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے حوالے سے مذہب کی تعریف میں کہا ہے کہ "مذہب عام عقائد کا وہ نظام ہے جسے اگر خلوص سے مانا جائے، جیسا کہ اس کا حق ہے اور سمجھ لیا جائے تو سیرت اور کردار بدل جاتے ہیں۔"

'زبورِ عجم' میں عنوان 'انا الحق' کے تحت 'حس' کی تبدیلی کے باب میں کہا ہے ؎

چوں حس دیگر شود عالم دگر شد
سکون دسیر دکیف، وکم دگر شد

حس میں تبدیلی کا لازمی نتیجہ حالت میں تبدیلی ہے۔ حرکت سکون اور سکون حرکت نظر آتی ہے۔ اسی طرح زیادہ وکم کی مقدار اور دور و نزدیک کے فاصلوں میں بھی تبدیلی آنا ضروری ہے۔

منصور حلاج کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اسے قید میں ڈالا گیا تو اس نے قیدیوں سے پوچھا کہ آیا وہ رہائی کے آرزو مند ہیں۔ قیدیوں کو تعجب ہوا کہ خود قید میں آپڑا ہے اور اسے فکر اوروں کی رہائی کی ہے۔ جوں ہی حلاج نے نظر دوڑائی بیڑیاں کٹ گئیں، قید خانے کے دروازوں کے تالے ٹوٹ پڑے اور قیدی فرار ہو گئے۔ (تذکرۃ الاولیاء۔ عطار)

تاریخ اسلام کا یہ واقعہ بھی یہاں قابلِ ذکر ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضؓ مسجد نبوی ؐ میں منبر سے خطبہ دے رہے تھے۔ اس وقت مجاہدینِ اسلام عراق کی سرحد پر سرگرمِ قتال تھے۔ یکایک فاصلہ درمیان سے اٹھ گئے۔ محاذِ جنگ کا نقشہ آپ کے سامنے تھا۔ منبر سے آواز دی "یا ساریہ الجبل" (ساریہ! پہاڑ کی آڑ لو)۔ اُدھر ساریہ بن زنیم، سالارِ فوج نے آواز بھی سنی اور حضرت عمرؓ کو بھی دیکھا (مقدمہ ابن خلدون)۔ یہ سب عشق و یقین کی کرشمہ کاریاں ہیں کہ پردے نظروں سے اٹھ گئے اور دوریاں ختم ہو گئیں۔

حضرت بایزید بسطامیؒ نے مستی و حال میں سُبْحَانِی مَا اَعْظَمُ شَانِی کا جو نعرہ لگایا وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی سمجھا جائے گا۔ یہ تو رہیں عشق کی کرامات۔ اسی ضمن میں علم، خصوصاً علمِ سائنس کی فتوحات کا بھی جائزہ لیں۔ علم کو حقائقِ اشیاء کی تلاش صدیوں سے سرگرداں رکھے ہوئے ہے۔ یہ تسخیرِ زماں و مکاں میں بھی کوشاں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گو بذاتِ خود بے مثال مخزنِ علم تھے،

پھر بھی آپ کی زبان پر سدا یہ دعا رہا کرتی تھی "اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ (یعنی اے اللہ! جو چیز جیسی ہے اور اس کی جو حقیقت ہے مجھے اس کی فہم عطا کر) یہ علم سائنس کی پوری جدوجہد کا بھی مرکزی مقصد رہی ہے۔ اور وہ اس راستے میں نمایاں کامیابی سے بھی ہمکنار رہے ہے۔ آئن سٹائن کی تحقیقات اور اکتشافات نے دنیائے سائنس میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ اس کے $E = mc^2$ کے معادلے نے مادّے کو جوہری توانائی کا تعین ثابت کیا ہے۔ لیکن اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تک فہم کی رسائی کے لیے نہیں معلوم اور کتنی صدیوں کی مدت درکار ہے۔

علامہ اقبالؒ نے "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ "یہ کائنات جو دیکھنے میں اشیاء کا مجموعہ ہے کوئی ٹھوس جسم ہے نہ خلاء میں واقع، وہ شئے نہیں عمل ہے۔"

نوبل انعام یافتہ سائنس دان عبدالسلام اپنے مضمون "اسلام اور سائنس" میں بعنوان "ایمان اور سائنس" کے تحت مابعد الطبیعات کے اس عقیدے کے بیان میں کہ کائنات "لاشئ" سے وجود میں لائی گئی، ماہرینِ کائنات کے نظریہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "کائنات میں مادّہ و توانائی کی کثافت کی ممکنہ قیمت کچھ یوں ہے کہ کائنات میں مادّے کی مقدار صفر آتی ہے۔ اگر مادّے کی مقدار واقعی صفر ہے (اور اس مقدار کی پیمائش عین ممکن ہے) تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ حالتِ خلاء کی طرح کائنات بھی بے مادّہ ہے۔ دس برس ہوئے کسی نے بڑی جرارت سے معاملہ کو اور آگے بڑھا کر یہ خیال ظاہر کیا کہ کائنات محض خلاء کی ارتعاشی شکل ہے۔ گویا یہ "لاشئ" کی ایک کیفیت ہے جو زماں و مکاں میں بغیر کسی شئ کے تخلیق کی گئی ہے۔" (تہذیب الاخلاق۔ جنوری 1986ء)

پروفیسر ہاکنگس کی اِسٹرنگ تھیوری (ان گنت برقی تاروں کی لرزش)۔

کی رو سے بھی کائنات کا لاشئ ہونے کی طرف صاف اشارہ ملتا ہے۔

مذکورۂ بالا سطور سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ سائنس کی کامیابیاں شعوری ارتقار کا نتیجہ ہیں۔ اسی طرح عشق، جو کہ ایک کیفیت ہے اور غیر مرئی ہے، اس سے شعور میں تبدیلی آنا، تسخیرِ زماں و مکاں کا باعث ہونا، کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں وقت کے فرشتہ زروآن کا کہنا ہے کہ لِی مع اللہ الوقت "خلوصِ دل سے کہو تو میں درمیان سے ہٹ جاؤں"۔ بات صاف ہے کہ بارگاہِ حق میں رسائی ممکن ہے اور یہی معراجِ بشریت ہے۔

الغرض یہ کائنات، یہ زماں و مکاں کے فاصلے، سب ہماری شعوری سطح کی پستی کے سبب پہاڑ نظر آتے ہیں۔ ان کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہمارے شعور میں تبدیلی ضروری ہے۔ یہی بات اس درجِ ذیل شعر کے معانی پر دلالت کرتی ہے ؎

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور

ہمارا مادّی جسم ہمارے اس ارتقائی سفر میں ہرگز حائل نہ ہو ؎

ایں بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست

علامہ اقبالؔ کا درجِ ذیل شعر بھی یہاں قابلِ غور ہے۔ اس میں تخلیقِ کائنات کو "کُن فَیَکُون" کے مسلسل عمل سے متعارف فرمایا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

اس باب میں جن باتوں کی وضاحت کی گئی ہے وہ درجِ ذیل ہیں:

۱۔ معراج دراصل قربت و دیدارِ حق ہے۔

۲۔ جسم جان کا تعین ہے۔ جسم جان میں اور جان جسم میں تبدیل ہو سکتی ہے۔
۳۔ زماں و مکاں کا وجود اعتباری ہے حقیقی نہیں۔
۴۔ ذات و صفات دونوں میں دوری نہیں قربت ہے۔
۵۔ علامہ اقبالؔ نے جسمانی و روحانی معراج سے ہٹ کر خود سے ایک تیسری راہ نکالی ہے، جس کو معراجِ بشریت کی راہ کہہ سکتے ہیں۔ ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اس سیاق و سباق سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبالؔ نے لی مع اللہ الوقت کا اعادہ کیا ہے (اگرچہ کہ کتاب سے اس کا بیان ہو یا نہیں)۔ لہٰذا زردآن یکایک غائب ہو گیا۔ علامہ نے عدمِ ثقل محسوس کیا اور زمین کی حدود سے باہر پرواز کرنے لگے۔ سایہ پاؤں کے تلے سے بالائے سر آپہنچا اور وہ آسمانِ قمر سے نزدیک اور نزدیک تر ہونے لگے۔

فلکِ قمر

رفتہ رفتہ علامہ زمین سے دور اور چاند سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ آسمانوں کی سیر میں یہ پہلا پڑاؤ ہے۔ چاند کی روشنی مدھم پڑنے لگی اور زمین چمکتی نظر آئی۔ یکایک ایک بے نور کرۂ آب و خاک کو ماضی کے آتش فشاں پہاڑوں کے آثار لئے ہوئے سامنے دیکھا۔ سطح پر قدم رکھے تو دیکھا کہ ایک سنسان ویرانہ ہے جو اندھیروں میں لپٹا ہوا ہے۔

علمِ فلکیات کی رو سے چاند ایک سیارۂ ثانیہ یا طفیلی سیارہ ہے جو زمین کے اطراف گردش میں قائم ہے۔ یہ سیارہ زمین سے ۱/۸ گنا چھوٹا ہے۔ سورج سے ۸۴ ہزار کلومیٹر دور اور چار لاکھ کلومیٹر کے اوسط

فاصلے پر زمین کے گرد اپنے محور پر گھوم رہا ہے۔ زمین پر منعکس ہونے والی اس کی روشنی سورج کی مرہونِ منت ہے۔ اس کے اندر کئی غار پائے جاتے ہیں۔ سطح کے برخلاف غاروں کے اندر پائی جانے والی روشنی سورج کے فیض کی ممنون نہیں ہے۔ ہندو دیو مالا میں اس سیارے کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

سب سے پہلے غار کے اندر علامہ اقبال کی ملاقات جہاں دوست یعنی وشوامتر سے ہوتی ہے۔ علامہ نے اسے سر پر جٹا، ننگا بدن اور ایک اجلا سانپ اطراف حلقہ کئے ہوئے پایا۔ وشوامتر چھتری قوم کا ایک فرد تھا جو اپنی تپسیا کی شدت سے برہمنوں پر سبقت لے گیا، حتیٰ کہ دیوتاؤں کو بھی یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں وہ ان پر بھی سبقت نہ لے جائے۔ چنانچہ دو اپسراؤں ۔۔ مینکا اور رمبھا کو بھیج کر انہوں نے اس مہارشی کی تپسیا بھنگ کروا دی۔

وشوامتر کے بیان کردہ حلیہ سے پروفیسر جگناتھ آزاد کو شیوجی کا شبہ ہوتا ہے۔ آسمانِ قمر میں جہاں دوست کو پیش کرنا علامہ کی حب الوطنی کی طرف ایک اشارہ ہے۔ وشوامتر کی زبانی علامہ بیداریٔ اقوامِ مشرق کا مژدہ سناتے ہیں، جو ان اقوام کیلئے آپ کی نیک طلبی پر دلالت کرتا ہے۔

'رشی وشوامتر کی گفتگو اسے ایک بلند پایہ عارف ثابت کرتی ہے حضرتِ روحی سے اس نے آدم، عالم اور حق کی حقیقت دریافت کی اور آپ کے جوابات سے مطمئن ہوا۔ پھر علامہ سے بھی سوالات کئے اور آپ کے علمی مذاق کو دیکھ کر اپنی طرف سے نو نکات بیان کئے، جن سے ایک دنیائے معنی روشن ہوتی ہے۔ وشوامتر کا معاملہ تزکیۂ نفس اور ذاتی روحانی ارتقاء کا ہے۔

اس کے بعد فلک قمر میں دنیا کے چار مشہور مذاہب کا ذکر آتا ہے۔

ان کی اہم تعلیمات کو طواسین یا کتبوں کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ پیغمبروں کے ادب و احترام کا تقاضا ہے۔

طاسینِ گوتم صرف اخلاقیات کی تعلیم پر منحصر ہے۔ بدھ مت میں دنیا کو دُکھوں کا گھر اور اس کے حسن اور خوبیوں کو محض اعتباری اور ناپائیدار کہا گیا ہے۔ چنانچہ اس مذہب کے مطابق ترکِ دنیا ہی نروان یا نجات کا ذریعہ ہے۔ اس مذہب میں خدا کا تصور تک نہیں پایا جاتا۔۔۔۔ گوتم بدھ ایک رقاصہ کے آگے اپنی تعلیمات پیش کرکے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے اور وہ توبہ کرکے اس کے مسلک کو اختیار کرلیتی ہے۔

طاسینِ زرتشت میں اہرمن اور زرتشت کا مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ زرتشت نیکیوں کے مبلغ اور پیغمبر تھے۔ اہلِ فارس کے لئے ہادی بن کر آئے تھے اور وحدانیت کی تعلیم دی تھی۔ لیکن پارسیوں نے توحید سے انحراف کیا اور ثنویت یعنی دو خداؤں کے عقیدے کو اپنالیا۔ ان کی نظر میں یزداں اور اہرمن بالترتیب خیر و شر کے خدا کہلائے۔ زرتشت چوں کہ پیغمبر تھے، نیکیوں کو فروغ دینے میں کوشاں تھے، اس لیے اہرمن کو اچھے نہیں لگے۔ زرتشت کو آرے اور سولی جیسی سزاؤں کے انجام سے ڈرایا گیا۔ یزداں کی حمایت سے ہاتھ اُٹھا لینے کو کہا گیا، لیکن انہوں نے اپنا کام کیا۔

طاسینِ مسیح میں حکیم طالسطائے کے خواب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ایک مرد (قومِ یہود سے) پارے کے دریا میں تا بہ کمر غرق ہے۔ پیاس کی شدت میں پانی سے محروم ہے۔ اسی عالم میں دریا یک بیک منجمد ہو جاتا ہے۔ اس کی ہڈیاں چور چور ہونے لگتی ہیں تو وہ چیخ اٹھتا ہے۔ ایک حسینہ "افرنگین"، جو دریا کے کنارے محوِ نظارہ تھی، قومِ یہود پر طعنے کستی ہے۔ کہتی ہے کہ یہ مکافاتِ عمل ہے مسیح کو سولی پر چڑھانے کا۔ افرنگین (قوم نصاریٰ)

کے جواب میں یہودی اس کی تباہ کاریوں کی اسے یاد دلاتا ہے۔ نصاریٰ نے نہ صرف مسیحؑ کی تعلیمات کو مسخ کیا، ان کو روحانی اذیت پہنچائی بلکہ اقوام مشرق کو اپنی مادّہ پرست تہذیب کے ذریعہ خوار و زار کیا ہے۔ استحصالی طریقہ کار سے ان کی اقتصادیات کو تباہ و برباد کیا ہے۔ آخر میں بد دعا دی اور کہا کہ اس کی موت دنیا کے لئے پیغامِ نجات ہے۔ یہ گویا مغرب کی مادّہ پرستی پر علامہ کا جامع تبصرہ ہے۔

طاسینِ محمدی میں ابوجہل کا نوحہ پایا جاتا ہے۔ یہ دشمنِ اسلام، اس دینِ فطرت کی عظیم برکات کا انکار کرتا ہے، جو ساری دنیا اور کل انسانیت کے لئے ایک دائمی رحمت ہے۔ وہ بتوں کی دہائی دیتا ہے کہ اس دین کے فروغ میں مزاحم ہوں اور پیغمبرِ اسلام سے شدید انتقام لیں۔

فلک عطارد

عطارد (Mercury) زمین ہی کی طرح ایک سیارہ ہے۔ حجم کے لحاظ سے زمین سے اٹھارہ گنا چھوٹا ہے۔ اس کا خمیر بھی آب و خاک سے اٹھا ہے۔ زمین کی طرح اس کے اطراف گھومنے والا کوئی چاند نہیں ہے۔ زمین کی بہ نسبت یہ سیارہ سورج سے بہت قریب ہے۔

حدودِ قمر کو خیرباد کہنے کے بعد سائرانِ افلاک ــ علامہ اقبالؔ اور مولانا رومؒ پھر پرواز کرنے لگے۔ یہ سفر انہیں ایک عالمِ تحیر میں پہنچا دیتا ہے جہاں تجلیات اپنی ہی، آپ ہی تماشائی! کون کس میں سمائے ہے؟ آسمان مشتِ خاک میں یا مشتِ خاک آسمان میں۔ کون اندر تھا اور کون باہر۔ جو جیسا نظر آرہا تھا ویسا ہی حقیقت میں تھا کہ نہیں۔ کیفیت بیان سے باہر تھی۔ غور کا مقام رہا۔ شاید یہی وہ محسوسات ہیں جو انقلاب اندر شعور کا نتیجہ ہیں کہ خاک و افلاک سب تحلیل ہو کر ایک وجودِ واحد میں بدل گئے ہیں ؎

یا من افتادم بدامِ ہست و بود

یا بدام من اسیر آمد وجود
یا ضمیرم را فلک در بر گرفت
یا ضمیر من فلک را در گرفت

سطح عطارد پر پہنچ کر علامہ ایک غیر آباد و سنسان سا عالم پاتے ہیں۔ لیکن مولانا روم بتاتے ہیں کہ یہ مقام اولیاء ہے۔ دورانِ ہبوط میں آدم علیہ السلام کچھ دن یہاں قیام فرماتے ہیں۔ فضیل و ابو سعید، جنید و بایزید رحمہم اللہ جیسے بزرگوں نے بھی یہاں کی سیر کی ہے وغیرہ۔ اتنے میں کہیں سے اذان سنائی دیتی ہے۔ ذوقِ نماز میں سرشار ہو کر دونوں اُدھر کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں دو بزرگوں ــــ جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا ترک کو دیکھ کر مولانا نے "زندہ رود" کے نام سے علامہ اقبال کا تعارف کرایا۔ سید صاحب کی اقتداء میں تینوں نے نمازِ پر سرور و حضور ادا کی۔

سعید حلیم پاشا اور سید جمال الدین افغانی دونوں علامہ کے ہم عصر تھے۔ یوں تو عمر کے لحاظ سے دونوں بڑے تھے۔ افغانی ۱۸۳۸ء میں اسعد آباد (کابل ڈسٹرکٹ) میں پیدا ہوئے اور حلیم پاشا ۱۸۶۵ء میں قسطنطنیہ میں۔ سید صاحب (افغانی) کے والد سید صفدر افغانستان کے مشہور و معروف عالم دین اور مصلحِ قوم تھے۔ انہوں نے جمال الدین کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام کیا تھا۔ افغانی بھی ذہانت اور ذکاوت میں فقید المثال طالبِ علم تھے۔ صرف اٹھارہ سال کی عمر میں قرآن، حدیث، تصوف، قانون، فلسفہ، کیمیا اور طب وغیرہ شعبہ ہائے علوم میں مہارت حاصل کر لی اور ایک جہاں گشت مصلح اور مبلغ بن کر وطن سے نکلے۔ ہندوستان اور تمام ممالکِ اسلامیہ کا چکر لگایا۔ حجِ بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ آپ کو تمام اسلامی ممالک کی زبانوں

پر خاطر خواہ دسترس تھی۔ فرانس میں جب کچھ دن قیام کیا تو صرف تین ماہ کی مدت میں استاد کے بغیر فرنچ پڑھنے اور ترجمہ کرنے کی قابلیت پیدا کر لی۔ آپ نے ایران، مصر، ترکی، فرانس، انگلینڈ کے علاوہ امریکہ کی بھی سیاحت کی، اور آخری سانس تک زبان اور قلم سے جہاد کرتے رہے۔ آپ کی عظمت علمی کو دیکھ کر جامعۂ ازہر کے علماء اور طلبہ آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ مفتی سید محمد عبدہٗ جیسی عظیم شخصیتوں نے دل و جان سے آپ کی اقتداء کو قبول کیا۔ آپ کے بعد بھی آپ کے پیغام کی اشاعت میں سعی کامل سے کام لیا۔ سید صاحب کی صحبت اور تعلیم نے آپ جیسے کئی علمبرداروں کو دنیا کی وسعتوں میں پھیلا دیا۔

جمال الدین ایک کامیاب مصلح اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ ان کے باعث عالم اسلامیہ میں بیداری پھیلی۔ آپ کا پیغام ممالک اسلامیہ میں آپسی اتحاد (Pan Islamism) تھا اور ترکی کو مرکزِ خلافت بنانا اور مغربی تہذیب کی استحصالی پالیسیوں کا تدارک کرنا تھا۔ آپ نے وطن پرستی اور ملوکیت کی کھل کر مخالفت کی۔ اس معرکہ آرائی کے لئے آپ کا کوئی سرمایہ نہ تھا۔ سارا انحصار اپنے قلم اور اپنے زورِ خطابت پر تھا۔ اس فقیرِ بے نوا شاہانِ ذی اقتدار و قوت کو ایوانوں میں لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ جس کے نتیجہ میں انہیں قلیل مدتوں میں ہر بار ملک بدر ہونا پڑتا تھا۔

مسٹر براؤن نے کیا خوب کہا ہے:

"A Wandering Scholar, with no material resources, save only an eloquent tongue and a pen, made Kings tremble in their Thrones" (The forty greatemen & women in Islam).

"ردِ نیچریت" اور "تتمۃ البیان" آپ کی قلم فرسائی کی باقیات ہیں اور "عروۃ الوثقیٰ" آپ کی ہنگامہ خیز صحافت کا نمونہ ہیں۔

سید صاحب اور حلیم پاشا دونوں مغربی تہذیب کی تخریب کاری اور استحصالی شدت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ اسی لئے انہوں نے مغرب کی بے دین سیاست و تہذیب کے خلاف معرکہ آرائی کی۔

حب الوطنی ایک فطری جذبہ ہے جو نہایت درجہ خوب اور مقدس ہے۔ اپنے ہم وطنوں سے محبت اور ان کی ہمدردی سچی انسانیت ہے۔ سربراہانِ ادیان و مسالک میں سے کسی نے اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔ اس کے برعکس وطن پرستی یعنی خود وطن کو اپنا خدا تصور کرکے خلقِ خدا اور انسانی آبادیوں کو بانٹ لینا خلافِ انسانیت اور حکمت خداوندی ہے۔ وطن پرستی ایک عظیم فتنہ کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اہلِ مغرب نے یہی کچھ کر دکھایا ہے۔ دیگر اقوام کی گردنوں میں طوقِ غلامی پہنا کر جامۂ انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں۔ انہوں نے دیسی صنعتوں کو فنا کیا تاکہ ان کی اپنی صنعتوں کو فروغ ملے۔ تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہو کر انسانی شرافت کو مسخ کیا۔ ان کی معیشت و اقتصادیت کو بگاڑا، جس کے باعث اقوامِ مشرق آج تک پریشان حال ہیں۔ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

سید صاحب اور سعید حلیم پاشا نے اقوامِ مشرق کی بیداری و آزادی کو اپنا مقصودِ حیات بنا کر عمر بھر جہدِ مسلسل میں مشغول رہے۔ انہوں نے حکمتِ قرآنی کے اتھاہ سمندر سے انمول موتی جمع کئے اور چند اہم عنوانات کے تحت ان کو جوڑ دیا اور اس کے پرچار کے لئے ساری عمر صرف کردی۔ حکومت الٰہی، الارض للہ، خلافتِ آدمیہ سب پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اشتراکیت اور ملوکیت

کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اشتراکیت انسانی طبقات میں ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی پر اکسا کر فتنہ برپا کرتی ہے۔ ملوکیت انسانوں کو اپنا غلام بنا کر اپنے ہی فائدے کو مدِنظر رکھتے ہوئے قوانین و ضوابط کے ذریعہ انسانوں کو بے جان کر دیتی ہے۔ لہٰذا دونوں کی پُرزور مخالفت کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، دونوں بزرگوں کو کسی مقام پر مستقل قیام نصیب نہیں ہوا۔ ملک بہ ملک پھرتے رہے۔ سید صاحب آخر کینسر کا شکار ہوئے اور ۹ مارچ ۱۸۹۷ء میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ ان کی طرف سے پیغامِ ملّتِ روسیہ میں علامہ اقبال نے تعلیماتِ قرآنی کا نچوڑ پیش کیا ہے۔

سعید حلیم پاشا بھی شریعت کے اسرار اور حکمتِ قرآنی سے اچھی طرح واقف تھے۔ سیاست پر زیادہ اثر انداز ہوئے۔ انگریز ان سے بہت نالاں تھے۔ اور قسطنطنیہ پر قابض ہونے کے بعد آپ کو مالٹا بھیج کر نظر بند کر دیا۔ ایک سال بعد رہائی ہوئی تو آپ نے اٹلی میں قیام کیا۔ ۶ دسمبر ۱۹۲۱ء میں ایک آرمینی کے ہاتھوں آپ شہید کر دیئے گئے۔

غرض فلکِ عطارد میں صرف ان دو جلیل القدر حضرات کی ارواحِ مقدسہ سے ملاقات کے بعد زندہ رود اور رومی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

فلکِ زہرہ

رومیوں کے دیو مالا کے مطابق، زہرہ (Venus) باغات اور چشموں کی دیوی ہے۔ یونانیوں نے اس کو حسن و عشق کی دیوی قرار دیا ہے۔ علمِ فلکیات کے مطابق یہ نظامِ شمسی کا روشن ترین سیارہ ہے۔ اس کا قطر 7700 میل اور سورج سے اس کا اوسط فاصلہ 67,000,000 میل ہے۔ سورج کے اطراف چکر لگانے کے لیے یہ سیارہ 225 دن لیتا ہے۔

فلکِ عطارد کے بعد مسافروں نے زہرہ کا رخ کیا۔ دھند اور کہرے

میں لپٹا ہوا ایک کرہ دیکھا۔ اس کے اطراف تارکول جیسا ایک معلق دریا بھی دیکھا۔ اس میں داخل ہوتے ہی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اندھیروں کو چیرتے ہوئے ایک کہسار پر پہنچے۔ چوٹی سے نظر دوڑائی تو نشیب میں ایک مسطح، سرسبز و شاداب وادی پر نظر پڑی، جس میں خداوندانِ قدیم ــــ مردوخ، لات، ہبل وغیرہ نے محفل آراستہ کر رکھی تھی۔ موجودہ زمانے کے تناظر میں اپنے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، کیوں کہ ان کو اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ موجودہ انسان خدا سے ناامید ہو چکے ہیں اور ان کا جھکاؤ مادیت اور بتوں کی طرف بڑھ گیا ہے۔ روحانیت کا اعتبار ختم ہو گیا ہے۔ حواسِ خمسہ کے پلڑوں میں دین و ایمان کی جانچ ہونے لگی ہے۔ لہٰذا آسمانوں پر خدا کی تلاش بے سود ثابت ہونے پر انہوں نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا ہے۔ کلیسا اور حرم سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ مغربی تہذیب کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وطن ہی کو سب سے بڑا خدا بنا کر رکھ دیا ہے۔ لوگ حسنِ اخلاق، باہمی محبت اور انسانی ہمدردی سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس طرح تبصرہ کرتے ہوئے قدیم بابل کے خدا مردوخ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس تبصرے پر اور گہرا رنگ چڑھاتے ہوئے فنیقیوں کے پادینہ خدا بعل کہنے لگا کہ آلِ ابراہیمؑ اور مسلمانوں نے بھی وطن پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ لا الٰہ ان کی زبانوں تک موقوف ہے۔ دلوں میں اس کے لیے جگہ نہیں وغیرہ کہہ کر وہ مغرب کی ستائش میں رطب اللسان تھا۔ یہی وہ فتنۂ عظیم ہے جس سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔

حب الوطنی ایک بے حد نیک اور سراپا خیر جذبہ ہے، جو ہم وطنوں کے درمیان اتحاد، ہمدردی اور محبت کو فروغ دے کر سلامتی کی راہ سجھاتا ہے۔

وطن کی آن بان کو بڑھاوا دیتا ہے۔ جب یہی جذبہ وطن پرستی میں تبدیل ہو جائے تو قومیں حدِ اعتدال سے گزر کر استعماریت اور دیگر اقوام کے استحصال پر اُتر آتی ہیں۔ انہیں غلامی کی زنجیریں پہنا کر انسانیت کے درجہ سے نیچے گرا دیتی ہیں۔ مغربی استعماریت اور تہذیب نے یہی کارنامے انجام دیتے ہیں۔ اپنی ریشہ دوانیوں سے بھائی کو بھائی سے اور دوست کو دوست سے حق تلفی کرنے پر آمادہ کیا۔ خون خرابہ کروا کے خود کو اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچایا۔ دوسری قوموں کو ذلیل کیا۔ لوٹ کھسوٹ ہمیشہ سے ان کا شعار رہا ہے۔

انگریزوں کی درندگی اور بہیمیت کا ایک عبرت انگیز نمونہ سوڈان کی سرزمین میں یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۸۸۲ء میں لارڈ کچنر سوڈان کی تسخیر کے لئے مصر سے روانہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے پہنچنے سے دو دن پہلے ہی مہدی سوڈانی مجاہدوں کے لشکر کے ساتھ خرطوم پر قابض ہو جاتا ہے۔ مہدی نے ۱۸۸۵ء میں وفات پائی۔ مجاہدوں نے سوڈان پر تیرہ[۱۳] سال حکومت کی۔ ۱۸۹۸ء میں جب لارڈ کچنر نے دوبارہ خرطوم کا قصد کیا اور اس پر قابض ہوا تو، سب سے پہلے جو نیک کام انجام دیا وہ مہدی سوڈانی کی قبر کی کھدائی، اس کی ہڈیوں کو اکھاڑ کر جلانا اور خاک کو دریا میں پھنکوانا تھا۔ تیرہ بخت کچنر نے نہ صرف اپنی روسیاہی کروائی بلکہ اپنی پوری قوم کے دامن کو داغدار کر دیا۔ آج افرنگ اپنی سائنسی تحقیقات، اکتشافات اور ٹکنالوجی پر جتنا بھی ناز کرے بجا ہے لیکن ان کی تہذیب نے انسانیت اور خلقِ حسنہ کی دھجیاں اڑا دی ہیں۔ یہ وہ داغ ہے جو کبھی ان کے دامن سے دُھل نہیں سکتا۔ قدرت کا انتقام بھی کچھ کم نہ تھا۔ کچنر کو غرقابی کی موت نصیب ہوئی۔

اس باب میں علامہ اقبال نے مادّہ پرستی اور مغربی تہذیب کو نشانہ بناتے ہوئے وطن پرستی کے منفی پہلوؤں کے فروغ کی مذمت کی ہے۔

فلکِ مریخ

حجم کے لحاظ سے زمین کی بہ نسبت مریخ (Mars) بہت چھوٹا سیارہ ہے۔ سورج سے اس کا فاصلہ، زمین اور سورج کے درمیانی فاصلے سے دوگنا ہے۔ سورج کے اطراف چکر لگانے کے لئے اسے 687 دن درکار ہوتے ہیں۔ جہاں تک علم و فن اور روحانیت کا تعلق ہے، مریخ کے باشندوں کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ انسانوں پر سبقت رکھتے ہیں۔ اڑن طشتریوں کے افسانے انہیں سے متعلق ہیں۔

سائرُوں نے فلکِ زہرہ کے دریا کی تہہ میں آنکھ جھپکی تھی کہ فلکِ مریخ میں آن موجود ہوئے۔ دیکھا تو آفتاب دنیا کے اُفق پر روشن تھا۔ ہمارے روز و شب کے مقابلے میں اس کے روز و شب کا عالم کچھ اور ہی تھا۔ زمانے کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی وہ آزاد پائے گئے۔ زمانے کی تلخیوں کو ہم سہ لیتے ہیں اور دکھ درد اٹھا لیتے ہیں لیکن زمانہ ان کے لئے ہر دم پیامِ عید لاتا ہے۔ زمانے کی طوالت ہمارے چہروں پر کہنگی کے نقوش بٹھا جاتی ہے لیکن وہاں ان کے چہروں کی زینت بڑھاتی ہے۔ ان اختلافات کے باوجود ان کے اور ہمارے درمیان کچھ باتیں مشترک بھی ہیں۔ جیسے ہمارے جدِ امجد آدم علیہ السلام ہیں اسی طرح برخیا ان کے ابوالآبار ہیں۔ دونوں جنت میں مقیم تھے۔ ابلیس نے آدم کو فریب دے کر جنت سے نکلوایا۔ فرزمرز نے بھی اسی طرح برخیا کو دھوکا دینا چاہا۔ بندگی سے رہائی دلا کر جنت سے بھی بہتر مقام میں لبسانے کا لالچ دیا۔ لیکن برخیا نے اس کے فریب میں آنے سے خود کو بچا لیا۔ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی رہائش کے لئے مریخ میں جگہ دی۔

اہلِ زمین اور اہلِ مریخ کے درمیان مزید یہ فرق بھی ہے کہ مذکورہ قوم کو زماں و مکاں پر غلبہ حاصل ہے۔ اپنے ماحول کی فضا سے وہ کماحقہ،

واقف ہیں۔ ان کے ہاں مادّے پر روح کا غلبہ ہے۔ قبل از مرگ ان کو اس کا علم ہونے پر وہ موت کا اعلان کر دیتے ہیں اور ایک دو دن بعد جسم کو اپنی جان میں جذب کر لیتے ہیں۔ یہی ان کی موت ہے۔ علمِ کیمیا میں کامل دسترس کی بنا پر، جب بھی ان کو سونا درکار ہوتا ہے، وہ سورج کی کرنوں سے تیار کر لیتے ہیں۔ سیاحت کا شوق اتنا ہے کہ چین، جاپان، امریکہ اور دیگر ملکوں سے کبھی کے ہو آئے ہیں۔ انہوں نے ہماری زمین کی معدنیات کا جائزہ اور اندازہ بھی خوب لگایا ہے۔ پیغمبرِ اسلام کی نبوت کے دوران میں سرزمینِ حجاز کی سیر سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔

شہرِ مرغدین مرتخیوں کی ایک قابلِ ناز آبادی ہے۔ وہ معاشرہ بھی اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ لوگ خوبرو، خوش گفتار اور علم و ہنر میں طاق ہیں۔ ان کے نزدیک حصولِ علم و ہنر کا مقصود خدمتِ خلق ہے کسبِ زر نہیں۔ وہاں محنت کو نقد میں تولا نہیں جاتا۔ ان کو مشینوں کا جنون نہیں جن سے فضا مکدر ہو۔ وہاں کا شتکار زمینداروں کے زیرِ بار نہیں اور ان کی محنتوں کے ماحصل میں کسی غیر کا حصہ نہیں ہوتا۔ ان کی خوشحالی قابلِ رشک ہے۔ اشتہارات ایسے نہیں کہ جھوٹ کو فروغ ملے اور نہ ہی بازاروں میں بے کاروں اور گداگروں کے ہجوم ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ خوشحالی اور ان کی خوبصورت رہائش گاہیں سب تقدیرِ خداوندی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس خوشحالی کا باعث تقدیر کے ساتھ کچھ حصہ ان کی تدبیروں اور اعمال کا بھی ہے۔

ہماری درّاکی و ذہانت، قوتِ فکر و عمل اللہ کی دین ہے لیکن اس کا صحیح طریقۂ استعمال ہماری اپنی مرضی اور اختیار کا معاملہ ہے۔ مرتخیوں کا خوشحال معاشرہ ان کے فکر و کردار کا راست لازمی نتیجہ ہے۔ درجِ ذیل

شعر تقدیر کے اختیاری پہلو پر روشنی ڈالتا ہے ؎

رمز باریکش بہ حرفے مضمر است۔
تو اگر دیگر شوی او دیگر است۔

کائنات میں خیر و شر پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ شر میں بھی یقیناً خیر کا پہلو ہوتا ہے۔ اس کو ڈھونڈ نکالنا ہمارا فریضہ ہے۔ دنیا کو سنگِ فسن کہا گیا ہے۔ کیوں کہ اس کی رکاوٹیں انسانی ذہانت کو تیز رکھتی ہیں۔ تاکہ مقصدِ حیات کو پانے میں آسانی ہو ؎

آدمی شمشیر، حق شمشیر زن
عالم ایں شمشیر را سنگِ فسن

شر سے عالمِ مریخ بھی خالی نہیں ہے۔ شہرِ مرغدین کے پہلو میں ایک کھلا میدان ہے جس میں نبیۂ مریخ عورتوں کے ایک ہجوم سے مخاطب ہے۔ بدکردار فرزمرنہ اسے عالمِ طفلی میں افرنگ سے اڑا لایا تھا۔ اچھی تربیت دی اور مریخیوں کے لئے ایک صاحبِ الہام و وحی نبیہ کا یقین دلا کر، مریخ کی پُر امن آبادی میں پیش کیا تاکہ فرنگی تہذیب کی تشہیر کرے۔ زن و شو کے تعلقات کو بُرے جتلا کر فساد برپا کرے۔ اس کا کہنا ہے کہ افزائشِ نسل کے لئے زن و شو کا رشتہ ضروری نہیں۔ اس کو جاری رکھنے کے کئی اور طریقے بھی ہیں۔ جنین رحمِ مادر کے باہر بھی پرورش پا سکتے ہیں۔ رحمِ مادر میں جنین کی تخلیق ممکن ہے تاکہ غیر مطلوبہ جنین کو رحم کے اندر ہی ختم کیا جائے۔ مختصر یہ کہ نبیۂ مریخ کی تعلیمات میں مرد و زن کے باہمی رشتہ کو منقطع کروانے کی پوری سازش پائی جاتی ہے

رہبر علامہ اقبال مولانا رومؒ نے اس زہر افشانی کے تدارک کے لئے زندگی میں آئینِ عشق کو اپنانے کی رائے دی۔ مرد و زن کے تعلقات

فطری ہیں۔ ان میں بگاڑ تباہیوں کا پیش خیمہ ہے۔ علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے، دین میں پختگی پیدا کرنے اور سب سے بڑھ کر ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لئے عشق کو لازمی قرار دیا۔ سورۃ الروم کی آیت نمبر ۲۱ میں اس باب میں نصِ قرآنی موجود ہے۔ "وہی تراش اللہ کی، جس پر تراشا لوگوں کو، بدلنا نہیں اللہ کے بنائے ہوئے کو۔" غرض مولانا روم نے اربابِ عشق کی صحبت پر زور دیتے ہوئے اپنی بات ختم کی اور اسی پر سیرِ مریخ ختم ہوئی۔

فلکِ مشتری

قدیم رومیوں کے مطابق، مشتری (Jupiter) دیوتاؤں کا دیوتا، انسانوں کا حاکم اور جنت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ رعد و برق اس کے ہتھیار تصور کئے جاتے ہیں۔ علمِ فلکیات کی رو سے مشتری نظامِ شمسی کا سب سے بڑا سیارہ ہے۔ اس کا قطر 88,640 میل اور سورج سے اس کا اوسط فاصلہ 483,000,000 میل ہے۔ اس سیارہ کے بارہ چاند یعنی طفیلی سیارے ہیں جو یکے بعد دیگرے اس کے گرد گردش میں مشغول ہیں جس کے باعث نیم شب اور نیم روز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اس کا دن نو گھنٹے پچپن منٹ کا اور سال ہمارے 11.86 سال کے برابر ہوتا ہے۔

مریخ کی دنیا میں ہم نے ایک ایسی مخلوق کا ذکر پایا جو علم و ہنر میں انسانوں سے بدرجہا اعلیٰ و افضل ہے۔ وہ ہزاروں سال پہلے خطۂ زمین کی سیر، معدنیات کی جستجو کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہم مشتری کو ارواحِ عاشقاں کی رہائش گاہ پاتے ہیں جو ہمیشہ مشغولِ سفر ہیں۔ کسی ایک جگہ تادیر قیام ان کے لئے گویا عذاب ہے۔

سائرانِ افلاک اس سیارے میں حلاج، غالب اور طاہرہ نینوں کی ارواحِ جلیلہ کو اپنے روبرو پاتے ہیں۔ نغموں کے ذریعہ نینوں نے اپنا

اپنا تعارف کرایا۔ ایسا کہ ان کا رنگِ حیات، ان کی شخصیت لفظوں کے آئینے سے چھلکنے لگتے ہیں۔

ممکن ہے حلاج اور طاہرہ جیسی دنیائے عشق کی سرفروش ہستیوں کے ساتھ مرزا اسد اللہ خاں غالب کا لایا جانا خلافِ توقع اور وجہِ استعجاب ہو۔ لیکن غالب کی ہمہ جہت شخصیت، معجز بیانی، بندگی میں آزادی، نیازمندی و بے نیازی اور بے مائیگی کی حالت میں بھی اندازِ غنا، آپ کے بعد کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئے۔ غالب کو تنگ حالی نے کبھی دم لینے نہ دیا۔ شدید مصائب جھیلے لیکن اپنی خودداری پر کبھی آنچ آنے نہ دی۔ دوستوں کے ساتھ وہی وضع داری، وہی تلطف اور وہی امیرانہ زندگی کا رنگ ہمیشہ برقرار رہا۔ آخر آپ کی رگوں میں شاہِ ایران فریدوں کا خون رواں تھا۔

غالب اردو اور فارسی کے بے مثال شاعر تھے۔ ان کی شاعری ان کی ذات اور صفات کا آئینہ دار ہے۔ ان کی زبان، معنی آفرینی اور انداز بیان کو آج تک کوئی اپنا نہیں سکا۔ ان کی تخلیقات انگریزی زبان کے چوٹی کے شعراء کے شہکاروں سے ٹکر لیتی ہیں، بلکہ بعض باتوں میں ان سے افضل ہیں۔ غالب کو انسانی نفسیات کا بڑا ادراک تھا۔ تصوف پر جائیے تو بقول خود صرف بے نوشی کی وجہ سے درجۂ ولایت پانے سے رہ گئے۔ فاقہ مستی کے رنگ لانے کی امید میں پوری عمر گذار دی۔ ڈگمگاتی ہوئی کشتیٔ حیات، ہر لمحہ طوفانی تھپیڑے، ایسے میں کس کا پتہ پانی نہیں ہو جاتا؟ کون اپنی خودی اور وضع داری کو سنبھالے رکھتا؟ یہ غالب جیسی عظیم شخصیت ہی کا حصہ تھا۔ چوں کہ علامہ اقبال خودی کے علمبردار ہیں، اس لئے انہوں نے اپنی تصنیف میں طاہرہ اور حلاج کے ہمدوش غالب کو جگہ دے کر حق شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

اس فقید المثال صحیفہ **جاوید نامہ** میں غالب کے داخلے کی ایک

اور وجہ بھی ہے۔ ابتدار میں علامہ نے خودی کی تکمیل کے سلسلہ میں رہنمائی کی، معراجِ نبویؐ کے اسرار بیان کیے۔ فلکِ مشتری میں اب اسی سلسلہ کو انتہائی نقطۂ عروج تک پہنچانے کے لئے آپ کو حقیقتِ محمدیؐ کے سررشتہ کی تلاش تھی، تاکہ بحث کی ابتدار کی جائے۔ غالب کی مثنوی کا درجِ ذیل شعر اس مقصد میں کامیابی کے لئے محمد ثابت ہوا ؎

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمت اللعالمینے ہم بود

یہ شعر اس مناظرے کی یادگار ہے جو ۱۸۲۰ء میں مولانا فضل حق اور مولانا اسمٰعیل شہید کے درمیان ہوا تھا۔ موضوع تھا: "آیا خداوندِ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظیر پیدا کرنے پر قادر ہے یا نہیں۔" مولانا فضل حق خیرآبادی کا موقف تھا کہ "نہیں"، اور مولانا اسمٰعیل شہید کا یہ کہ "قادر ضرور ہے مگر نہیں کرے گا۔" غالب مولانا خیرآبادی کے دوست تھے۔ مولانا نے اپنے موقف کی موافقت میں ایک مثنوی کی فرمائش کی۔ مثنوی پوری ہوئی لیکن اس میں مذکورۂ بالا شعر آگیا، جس سے مولانا شہید کی تائید اور مولانا خیرآبادی کے قول کی تردید ہوگئی۔ آپ نے اس کی طرف نشاندہی کی تو غالب نے امتناعِ نظیرِ خاتم النبیینؐ کے ثبوت کے لئے درجِ ذیل دو شعروں کا اضافہ کر دیا ؎

منشاءِ ایجاد ہر عالم یکے است
گر دو صد عالم بود خاتم یکے است

جوہرِ کل برنتابد تثنیہ
در محمدؐ رہ نگنجد تثنیہ

اس طرح علامہ اقبال کو حلاج کے برابر غالب کو لاکھڑا کرنے کا جواز مل گیا۔
ابو المغیث حسین بن منصور حلاج بیضائے فارس میں پیدا ہوئے تھے۔

درحقیقت آپ حلاج یعنی دُھنیئے نہیں تھے۔ لیکن اپنے ایک دوست جو دُھنیا تھا۔ اس کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دُھینا اپنے کام سے باہر گیا تھا تو منصور نے اس کے کام کو اختیار کرتے ہوئے انگلی کے اشارے سے روئی اور بیج کو علیحدہ کر دیا۔ اس لئے آپ حلاج کہلائے۔ آپ ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ جامی فرماتے ہیں کہ آپ روزانہ ایک ہزار رکعت نماز ادا کرنے کے عادی تھے۔ یہاں تک کہ آپ نے قتل کے قبل کی رات میں بھی پانچ سو رکعتیں ادا کی تھیں۔

حلاج پر عشقِ الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ کبھی کبھی اطراف کی ہر شئے میں اور خود اپنے نفس میں تجلیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتے۔ ایک مرتبہ شدتِ جذب و حال میں "انا الحق" بول اٹھے۔ اس پر علماء نے گرفت کی اور کافر ٹھہرایا۔ دوسری طرف قدر دانوں نے ولی اللہ کے درجہ کو پہنچا دیا۔ چوں کہ اس سے دین میں فساد کا اندیشہ تھا اس لئے علماء، حکماء، محدثین، یہاں تک کہ صوفیاء نے بھی بالاتفاق آپ کو قابلِ گردن زدنی ٹھہرایا۔ قاضی ابو عمر نے فتویٰ جاری کیا اور حلاج کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ آپ یادِ الٰہی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ۹۲۲ء میں خلیفۃ المقتدر کے آخری حکم پر اعضاء کو قطع کر کے حلاج کو دار پر چڑھایا گیا اور پھر جلا کر آپ کی خاک کو دریا میں بہا دیا گیا۔

صاحبِ "گلشنِ راز" محمود شبستری نے اپنی مثنوی میں حلاج کی تائید میں مندرجہ ذیل شعر کہا ہے ؎

روا باشد انالحق از درختے
چرا نبود روا از نیک بختے

علامہ اقبال نے 'زبورِ عجم' کے باب 'گلشن رازِ جدید' میں اپنے مخصوص انداز میں اس کی تائید کی ہے۔ اس طرح کہ حلاج کا یہ خدائی دعویٰ نہیں تھا۔ در اصل انہوں نے خودی کی تصدیق کی تھی۔ یعنی یہ کہا کہ "خودی کا ہونا حق ہے اور

کائنات کے ہر ذرّہ کی اصل خودی ہی ہے۔"

طاہرہ کے حالاتِ زندگی کہیں دستیاب نہیں ہیں۔ شرح جاوید نامہ، میں پروفیسر سلیم چشتی کی دی ہوئی معلومات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

طاہرہ کا اصلی نام زریں تاج تھا۔ وہ حاجی محمد صالح کی بیٹی تھی۔ قزوین (ایران) میں پیدا ہوئی تھی۔ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہانت و ذکاوت میں بھی یکتا تھی۔ شعر گوئی میں بھی اس کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

سید علی محمد باب رضک شیرازی (۱۸۲۱ء تا ۱۸۵۰ء) نے بابی مذہب کی بنیاد رکھی تو زریں تاج نے اس کے ساتھ سلسلۂ خط و کتابت شروع کیا اور آخر کار اسی مذہب کو اپنا لیا۔ اس کے خاندان والوں نے لاکھ روکا، نہ مانی اس کے خسر ملّا محمد تقی نے بھی سخت مخالفت کی، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

کچھ دن بعد ملّا محمد تقی کا قتل ہو گیا اور زریں تاج پر بھی اس جرم میں ملوث ہونے کا الزام لگا۔ چنانچہ وہ بھاگ کر خراسان پہنچی، جہاں باب سے اس کی ملاقات ہوئی۔ باب نے زریں تاج کو قرۃ العین کے لقب سے نوازا، اور شاعری میں طاہرہ تخلص کرنے کو کہا۔ باب اور طاہرہ خراسان سے مازندراں روانہ ہوئے۔ ۱۸۵۰ء میں باب کو قتل کر دیا گیا۔ طاہرہ گرفتار کر لی گئی۔ شاہ ناصر الدین نے اس حسن کے پیکر پر رحم کھا کر درگذر کرنے کو کہا، لیکن علماء نے نہیں مانا۔ درباریوں نے بھی بابی مذہب سے توبہ کرنے کو کہا۔ لیکن سرفروش خاتون نے صاف انکار کر دیا اور اپنے مذہب کے لئے سر دینے پر آمادہ ہو گئی۔ لہٰذا قتل کر دی گئی۔

تینوں ارواحِ جلیلہ کو سامنے پاکر رومی نے زندہ رود سے حل طلب مسائل پیش کرنے کو کہا۔ زندہ رود نے حلاج کی جنت سے مہجوری اور مقامِ مومناں سے دوری کا راز پوچھا تو، اس کے جواب سے ظاہر ہو گیا کہ وہ عاشقِ ذات ہے، جنت اور حوروں سے اسے کوئی غرض نہیں ہے۔ سیرِ دوام اس کا کام

اور کسی ایک جگہ قیام اس کا مقصود نہیں۔ اس کے نزدیک بے خلش جینا، جینا نہیں، نہ آس نہ کوئی ہراس۔ کہا کہ ایسی ہی آزاد زندگی استحکامِ خودی کے لئے موزوں اور اُسے راس آئی۔ باتوں باتوں میں تقدیر کی بات چھڑ گئی۔ اس سے پہلے حکیمِ مرنج نے تقدیر کے اختیاری پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔ ع

"تو اگر دیگر شوی او دیگر است"

اب حلاّج نے اس کے جبری پہلو کی وضاحت کی، جس سے اس کی مومنانہ فراست کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہا کہ: "حیات و ممات دونوں تحتِ تقدیر ہیں۔" یعنی کہ جب وقتِ معین آن پہنچتا ہے پھر پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے (الاعراف ۷-۳۴) پس یہ تسلیم و رضا کا معاملہ ہے۔ موت جب آنی ہو ضرور آئے گی، اس سے فرار ناممکن۔ اگرچہ کہ یہ عقیدۂ جبر ہے، مگر یہ صرف اعلیٰ ظرف اور باہمت مردوں کے لئے خاص ہے۔ آدمی کو ہر خوف سے آزاد کرا کے فرد کو لشکر سے لڑوا دیتا ہے۔ یہی عقیدۂ جبر تھا جس نے خالد بن ولیدؓ کو لڑائیوں میں سیف اللہ بنا کر جتوا دیا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے والا اور ظلم کو تقدیر کا فیصلہ جان کر سہنے والا تقدیر کے جبری پہلو سے ناواقف ہوتا ہے۔ جبری پہلو میں بھی عمل سے کوتاہی کے لئے کوئی جواز نہیں ہے۔"

مومنانہ عقیدہ و اعمال کے باوجود حلاّج کا سولی پر چڑھایا جانا بعید از فہم تھا۔ زندہ رود نے اس پر تبصرہ کرنے کو کہا۔ حلاّج نے جواب دیا کہ مومنوں کے باطن سے کافری کی بو آ رہی تھی۔ امرِ رب میں روح کا رشتہ جو رب سے قائم ہے، اس میں ان کے یقین کو متزلزل پایا۔ تحفظ اور استحکامِ خودی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لہٰذا اس نے خودی کی دعوت دے کر خود کو لائق دار بنا لیا۔ آخر میں کہا: "اے زندہ رود! ہوشیار!! تو بھی وہی خطا کر رہا ہے جو میں نے کی تھی۔" طاہرہ نے اس بیان پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اصحابِ جنوں کی خطائیں مرغوب

ہیں کہ ان سے انقلابات کا ظہور ہوتا ہے اور اسرارِ نہانی طشت از بام ہو جاتے ہیں۔ ایسے مرد دار پر کھینچے جاتے ہیں اور قتل ہونے کے باوجود زندگیٔ دوام سے سرفراز ہوتے ہیں۔ اس مقام پر غالب کا یہ شعر ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرے سوختہ چیست

سیاق و سباق سے میل کھاتا نظر نہیں آتا۔ لیکن تینوں ارواح میں جنہوں نے اپنی اپنی خودی اور خود داری کی پاسداری کی، صرف غالب ہی سزاؤں (دار اور قتل) سے بچ نکلے۔ اَن گنت مشکلات سے گذرتے ہوئے بھی انہیں حلوے مانڈے سے کوئی شئ مانع نہ ہوئی۔ یعنی بہ لغتِ استعارہ 'نالے' کا اثر سب پر یکساں ہو یہ ضروری نہیں۔

بات بڑھتے ہوئے امتناعِ رحمت اللعالمین ؐ تک پہنچی۔ غالب نے وہی شعر دہرایا جس سے مولانا شہید کی تائید ہوتی تھی۔ اسی سلسلہ میں مزید سوالات پیش کیے گئے تو غالب نے یہ کہہ کر دامن بچا لیا کہ وہ کافری ہے؛ اور اس سے شاعری کا کوئی تعلق نہیں۔ بس غریبِ شہرِ سخن ہائے گفتنی کا دعویدار غالب مہر بہ لب ہو کر خاموش ہو گیا۔

یہ دیکھ کر حلاج سے رہا نہ گیا۔ بحث کو طول دیتے ہوئے مقاماتِ عبدہٗ پر پڑے ہوئے پردے چاک کرنے لگا۔ یہ وہی مقامِ نوا کا نقطۂ عروج ہے جہاں پہنچ کر ساز کے تار ٹوٹ جاتے ہیں، سرِ خامہ پر روشنائی خشک ہو جاتی ہے۔ حلاج ہی کا جگر تھا کہ گرہ کے بعد گرہ کھولتا چلا گیا۔ جتلایا کہ بلا فیوضِ مصطفوی ؐ کسی بھی عالم کی تکمیل ناممکن ہے۔ عبدہٗ! مقامِ عبدہٗ کیا ہے؟ دائرۂ زماں سے باہر آزاد، مسجودِ کائنات، آدم ہی، لیکن آدم سے اقدم، صورت گرِ تقدیر، مطلوبِ حق بے ابتدا، بے انتہا، سرّ الا اللہ، تیغ لا الٰہ کی دھار۔ آخر کہنے کو جب

کچھ باقی نہ رہا تو، عبدہٗ کو بلا جھجک 'ھو' کہہ کر اپنے ترکش کے باقی ماندہ تیر بھی خالی کر دیئے۔

مسئلۂ دیدار آخر زماں اور دیدارِ ذات بھی کم اہم نہیں۔ ان کے بغیر تکمیلِ بشریت بھی ناممکنات میں سے ہے۔ دیدارِ نبویؐ کا طریقہ یہ ہے کہ خود کو سیرتِ نبویؐ سے کماحقہٗ آراستہ کر لینے کے بعد قبولِ عام کے عالم میں خود کا دیدار کر لینا ہے۔ اور صبغت اللہ سے خود کو رنگ کر سارے عالم پر اسی رنگ کو اچھال کر نظارہ کرنا ہی دیدارِ ذات کے ہمسر ہے۔

اس باب کا آخری عنوان آدم و ابلیس کا محاسبۂ کمال ہے۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ کا دعویدار خواجۂ اہلِ فراق اپنی ضد پر اڑ کر کہیں کا نہ رہا۔ اس کے برعکس پُرعجز و انکسار مشتِ خاک نے آسمانوں کو چھو لیا۔ ابلیس جلالِ خداوندی کا گرویدہ تھا۔ اس کے لئے جمالِ خداوندی کے رخ سے قطع تعلق آسان نہیں تھا۔ لہٰذا ترکِ سجدۂ آدم سے معتوب ہو کر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ وہ بحرِ عشقِ الٰہی کا واحد شناور ہے جو عقیدۂ توحید پر پوری سختی کے ساتھ قائم رہا۔ وصال کے بجائے فراق میں اس نے لذت پائی۔ گر کر اٹھنے اور گھٹ کر بڑھنے کو بہتر سمجھا۔

دلدادۂ سیر حلاج کے اوجھل ہو جانے کے بعد تاریکیوں کے دبیز پردوں سے ایک کہن سال بوڑھا، شعلوں میں لپٹا ہوا، نمودار ہوا۔ اس کی تیز نظر جسم میں جان تک پہنچ رہی تھی۔ وہ دیدارِ حق سے مشرف تھا، وجودِ حق سے انکار کیا کرتا۔ اس نے آدم کی عداوت میں حق سے دشمنی مول لی تھی۔ کچھ دیر بعد دھوئیں کی شکل میں آنکھوں سے اوجھل ہوا تو فضا اس کے نالوں سے گونج اٹھی۔ کہہ رہا تھا:

"اے خدا! تُو نے مجھے بے اندازہ صلاحیتیں عطا کیں اور صیدِ زبوں آدم کے شکار پر آمادہ کیا۔ بے چارہ آدم از خود میرے دام میں آ پڑتا ہے۔ اس مشتِ خس کے لئے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ پھونک کر رکھ دے گی۔

میرے ہاں دیکھتے ہوئے ان شعلوں کا کیا کروں، کہاں لے جاؤں۔ فتوحات سے تنگ آچکا ہوں۔ کوئی ایسا مرد میرے مقابلے کے لئے بھیج، جو ایک نظر سے مجھے لرزہ براندام کر دے، میری گردن مروڑ دے، تاکہ میں اپنی شکست ہی سے لذت یاب ہو سکوں۔"

اس بابِ مشتری میں جو خاص مسائل زیرِ بحث آئے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں: ۱۔ تقدیر ۲۔ دیدار ۳۔ خودی ۴۔ حقیقتِ محمدیؐ

۱۔ تقدیر کا اختیاری پہلو حکیم مریخ کی زبانی ظاہر کیا گیا تھا۔ اس باب میں اس کے جبری پہلو (تسلیم و رضا) پر روشنی ڈالی گئی ہے ــــ جبری ہو کہ اختیاری دونوں میں عمل پر زور دیا گیا ہے۔ جبری پہلو زیادہ موثر اور مقدم ثابت ہوا ہے۔

۲۔ دیدارِ آخر زمانی ہو کہ دیدارِ ذات، خود کو اپنے مطلوب کے رنگ میں رنگ کر اپنا مشاہدہ کرنا دیدارِ مطلوب کے ہمسر ہے۔

۳۔ خودی ہر شے کا جوہرِ ذاتی ہے۔ اس کا ادراک و استحکام بقائے ذات کے لئے ضروری ہے۔ خودی کے معاملہ میں غلو تکبر کا باعث ہے۔ ابلیس اسی وجہ سے متکبر ہو کر راندۂ درگاہ ہوا۔ جمالی صفات کو ترک کر کے محض جلال کو اپنایا۔ آدم کی انکساری و نیازمندی صفتِ جمالی سے ہے۔ سرشتِ آدم میں جلال و جمال دونوں کی آمیزش نے اس کی خاک کو فلک رس بنا دیا ہے۔

۴۔ حقیقتِ محمدیؐ ذات و صفاتِ الٰہیہ کا آئینہ بن کر تمام کائنات سے منسلک ہے۔

فلکِ زحل

زحل (Saturn) نظامِ شمسی کا دوسرا سب سے بڑا سیارہ ہے۔ جس کا قطر 72,000 میل اور سورج سے اس کا اوسط فاصلہ 868,000,000 میل ہے۔ اس کا سال ہمارے سال کی نسبت سے 29.5 سال کے ہمسر ہے۔ اس کا دن ہمارے دس گھنٹوں کے برابر ہے۔ سورج کے اطراف

اس کی گردش اس قدر دھیمی ہے کہ دیکھنے میں یہ سیارہ ساکن نظر آتا ہے۔ بار بار اپنے مدار سے ہٹ کر واپس آتا ہے۔ اس سیارے کے اطراف برف پاروں کے کئی حلقے نظر آتے ہیں۔ عام طور پر اس سیارے کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

جاوید نامہ کے مطابق یہ سیارہ آب و خاک کا ناپاک نفوس اور غدارانِ ملک و ملت کی قیام گاہ ہے۔ یہاں ہندوستان جنت نشان کی دو ارواحِ رذیلہ کو دکھایا گیا ہے جو ایک ڈولتی ہوئی کشتی پر سوار ایسے دریائے خوں میں مبتلائے عذاب ہیں جس کے اندر اور باہر غضب کے طوفان ہیں۔ دریا میں پے بہ پے اٹھتی گرتی ہوئی سرکش موجیں اور باہر طوفانی ہوائیں اور جھپٹتے ہوئے سانپوں کے ہجوم، ایک نہایت ہولناک ماحول پیش کرتے ہیں۔ کشتی سوار، وہی دو طاغوت، جعفر و صادق ہیں، جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ہندوستان کی دو مضبوط اور مستحکم مسلم سلطنتوں کی بیخ کنی کر کے ساری قوم کو غلامی کے طوق پہنانے کے ذمہ دار ہیں۔

میر جعفر، سراج الدولہ کا سپہ سالار تھا، جس نے حکومت کے لالچ میں انگریزوں سے سازش کر کے ۱۷۵۷ء میں بنگال، ہگلی وغیرہ کو ان کے حوالے کر کے صلح نامہ کی راہ نکالی۔ ۱۷۵۷ء میں انگریز اس صلح نامہ کی دھجیاں اڑا کر پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کے مقابلے پر جم گئے۔ غدارانِ وطن کی بے وفائی سے سراج الدولہ کو دوبارہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ لارڈ کلائیو نے اس کو مرشد آباد میں گرفتار کرا کے قتل کر دیا۔

میر صادق نے بھی اسی طرح انگریزوں سے مل کر ٹیپو سلطان کے ساتھ وہی کیا جو میر جعفر نے سراج الدولہ کے ساتھ کیا تھا۔ انگریزی فوج نہ سراج الدولہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل تھی نہ ہی ٹیپو کی فوج کے۔ اگر نظام حیدر آباد ٹیپو کے دوستی کے پیغام کو نہ ٹھکراتا اور میر عالم اور میر صادق نے انگریزوں کی

پشت پناہی غدارانہ طریقے سے نہ کی ہوتی تو، نہ انگریز ہندوستان کو غلام بنا پاتے اور نہ دو سو سال حکومت کرتے۔ میسور کی چوتھی جنگ میں ۱۷۹۹ء میں شیرِ میسور کی شہادت کے بعد ہی انگریز سارے ہندوستان کے مالک بن بیٹھے۔

علامہ اقبال نے روحِ ہندوستان کو پیش کر کے جو باتیں اس سے کہلوائی ہیں، وہ خود ان کی اپنی حب الوطنی کے پاک جذبہ کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس بارے میں ان کی تشویش ان کے اس شعر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کے شب ہندوستاں آید بروز
مرد جعفر در روحِ او باقی ہنوز
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفران این زماں

خود غرض اور لالچی انسان مشکل ہے کہ راست کردار کی فہم پائے۔ دونوں طاغوتوں نے اپنوں سے غداری کی۔ اپنی مادرِ وطن کو استعماریت کی نذر کیا اور انگریزوں نے بھی استحصال میں کوئی کمی نہ کی۔ سونے کی چڑیا کہلانے والے ہندوستان کو نادار بنا دیا۔

ان کمینوں نے بھی کوئی اچھا پھل نہیں پایا۔ جعفر نے انگریزوں کا کٹھ پتلی حاکم بن کر قلیل عرصہ تک اپنی ہوس پوری کی۔ اور میر صادق سلطان کی شہادت سے پہلے ہی داخلِ جہنم ہوا۔

سراج الدولہ کی زبان پر آخری الفاظ یہ تھے: "شہیدانِ وطن کا خون ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا۔" (انقلاب کی خونین تاریخ۔ مفتی شوکت علی فہمی)۔

سلطان شہید کو میر صادق کی غداری کا یقینی علم اس وقت ہوا جب سلطان پر ڈوڈی دروازے بند کروا کے قلعہ میں داخلے سے روکا گیا۔ میر صادق امداد لانے کا حیلہ کر کے فرار ہوا تو سلطان نے کہا: "ایسا نہیں کہ مجھے

تمہاری غداری کا علم نہیں، تم اپنی اس بے وفائی کا مزہ جلد ہی چکھو گے اور قدرت کے انتقام کے اثرات تمہاری آئندہ آنے والی نسلوں میں بھی ظاہر ہوں گے۔ ان سیاہ کارناموں کی نحوست سے وہ ایک ایک دانہ کے محتاج ہوں گے۔"
(سیرتِ ٹیپو سلطان شہید ۔ الیاس ندوی)۔

احمد خان نامی ایک وفادار سپاہی نے اسے فرار ہوتے دیکھ کر ایک ہی وار میں سر تن سے جدا کر دیا۔ دونوں طاغوت آج تک نشانۂ ملامت ہیں۔ دوزخ کو بھی ان کا وجود ناقابلِ قبول ہے۔

اس حصہ میں ایک نکتہ قابلِ لحاظ ہے ۔ کہ موت کو صرف تن کے مٹانے پر اختیار ہے جان پر نہیں۔ جان تو امرِ رب سے ہے، اس کا تحفظ اس کے فرائض میں داخل ہے۔ ؎

گفت جاں سرے ز اسرارِ من است
حفظِ جاں و ہدمِ تن کارِ من است
جان زشتے گرچہ نرزد باز و جو
اے کہ از من ہدمِ جاں، خواہی برد

آں سوئے افلاک

سیرِ افلاک کے دوران میں علامہ اقبالؔ نے اپنے مشاہدات کا اجمالی خاکہ اس باب کی تمہید میں پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ہر کہیں ہنگامۂ ہست و بود دیکھا۔ حیات کو ثبات کا متمنی پایا۔ دنیائیں الگ الگ، رسم و آئین جدا جدا۔ روز و شب کی طوالت ایک جیسی نہ عقل و جنوں کا اعتبار ایک سا۔ اقدار میں تخالف، یہاں کا کم وہاں زیادہ اور وہاں کا خوب یہاں کا خراب ٹھہرا۔

دونوں مسافر حددِ کائنات پار کر چکے۔ مکان و لامکان کے

درمیان دونوں عوالم سے ملحق ایک اور عالم تھا، جسے برزخ کہا جاتا ہے۔ یہاں ایک دل شکستہ، سوختہ جاں، مرغِ نالاں، تنِ تنہا پایا گیا، جو بار بار یہ شعر اپنے آپ میں گنگنا رہا تھا۔ ؎

نہ جبریلے، نہ فردوسے، نہ حورے، نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد زجانِ آرزومندے

یعنی نہ جبریل کا وجود حقیقت، نہ فردوس و حور، نہ خدا ہی کا وجود! افسوس! کہ نادان لوگ جھوٹی تمناؤں میں مفت جان کو جلا رہے ہیں۔ رومیؒ نے کہا: "یہ علاجِ بے دار دِرسن، جرمنی کا حکیم، نطشے ہے جو 'اناولاغیری' کا مدعی رہا ہے۔

فرڈرک ولہلم نطشے ۱۸۴۴ء میں جرمنی میں بمقام راکن پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں اس کو یتیمی کے صدمے جھیلنے پڑے۔ ماں نے اس کی پرورش کی۔ بے حد ذہین و فطین تھا۔ لائپزگ اور بون میں تعلیم حاصل کی اور صرف چوبیس سال کی عمر میں ختم بھی کر لی۔ اور بیاسل (Basle) یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرر تقرر پایا۔ فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ میں ایک مختصر عرصہ کے لئے فوجی زندگی گذاری۔ بدقسمتی سے گھوڑے سے گر کر معذور ہو گیا۔ فوجی نظم و ضبط اسے بہت پسند تھا، لیکن عذر نے اسے اس قابل نہ رکھا کہ فوجی ہی بن کر رہ سکے عمر بھر اسے اسی کا افسوس رہا۔

لڑکپن میں نطشے کو بائبل سے کافی شغف تھا۔ جب پڑھتا تھا تو سننے والوں کو اتنا متاثر کرتا کہ وہ رو پڑتے تھے۔ لیکن اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس کے اندر ایسی تبدیلی آئی کہ دل سے خدا کا اعتبار اٹھ گیا۔ باقی تمام عمر اس نے منکرِ حق بن کر گذار دی تھی۔

وہ خدا کے بجائے فوق البشر (Superman) کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ تاحینِ حیات اسے اسی کے دیدار کی دھن لگی رہی۔ نطشے نے

اچھی اچھی کتابیں تصنیف کیں مگر کسی کو عام قبولیت نصیب نہیں ہوئی "بقول زرتشت" انیسویں صدی کی واحد اور عدیم المثال تصنیف بھی قبولیت کے درجہ کو پہنچ نہ سکی۔ اس کی خطا بس یہی تھی کہ وہ عیسائیت کے خلاف اپنے جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکا تھا۔ شدت سے مخالفت کی اور عیسائی قوم اس نابغۂ روزگار کی دشمنی پر اتر گئی۔ اس کی ہر ایک خوبی بھی غلطی پر محمول کی گئی۔ کسی نے یک لخت مہر و الفت کی نظر سے نہ دیکھا۔ نطشے کو دیوانہ مشہور کیا گیا۔ اس کی قسمت میں سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اس نے ایک ایسی سرزمین میں جنم لیا تھا جو مادیت کے عشق میں مبتلا اور روحانیت سے عاری تھی۔

نطشے 'مقامِ کبریا' کا طالب تھا۔ انسان میں خدائی صفات کو درجۂ کمال پر دیکھنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ وہ قوت و اقتدار کا خواہاں اور ترکی زندگی کا گرویدہ تھا۔ لیکن قوت و اقتدار کے جنونی کچھ ہی لوگ ہوتے ہیں۔ عام انسانی معاشرہ تحفظ و امن کے لئے کوشاں رہتا ہے۔

علامہ اقبال کی نظر میں نطشے دیوانہ نہیں تھا۔ اقبال نے اسے مجذوب کہا۔ اس لئے کہ وہ سرے سے خدا ہی کا منکر نہیں تھا۔ خود اپنی ذات سے بھی اس نے رشتہ توڑ لیا تھا۔ علامہ نے کہا ہے

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

اسی لئے 'جاوید نامہ' میں کہا ہے کہ ؎

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

افسوس کہ وہ مجذوب، حضرت شیخ احمد سرہندی کے زمانے میں نہ ہوا، ورنہ

سرورِ دائمی اور نشاطِ روحانی سے محروم نہ رہتا۔ آگے چل کر یہ بھی کہا۔ ؎

او بہ لا در ماندہ تا اِلّا نہ رفت
از مقامِ عبدہٗ بے گانہ رفت

شارح جاوید نامہ سلیم چشتی مقامِ عبدہٗ کو عبدیت کبریٰ اور خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے پہلے فلکِ مشتری میں حقیقتِ محمدیؐ کے سلسلہ میں عبدہٗ کا ذکر آیا ہے۔ یہ شانِ رسالت مآب ہے۔ سید عبدالکریم جیلانی نے اپنی کتاب 'انسانِ کامل' میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانِ کامل ثابت کیا ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اپنے مکتوب چہارم میں حقیقتِ محمدیؐ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام پر روشنی ڈالی ہے۔ غالباً اسی لحاظ سے علامہ نے ان کی طرف نشاندہی کی ہے۔

نطشے کی وفات ۱۹۰۰ء میں ہوئی۔ تادم آخر ایک بے بسی کی زندگی اس کے مقدر میں لکھی گئی تھی۔ اس کی موت کے بعد لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور اس کی تصانیف کی شہرت ہونے لگی۔ علامہ نے نطشے کو جس نگاہ سے دیکھا اور مرض کی جو تشخیص کی ہے وہ اس گفتگو کے بیان سے ظاہر ہے۔ اسی لیے اس کو مقامِ برزخ میں دکھایا اور کہا ؎

قلبِ او مومن، دماغش کافر است

علامہ اقبال، حضرت شیخ احمد سرہندی کے نہایت درجہ عقیدتمند تھے، جس وقت مشرقی پنجاب میں آپ کے مزار پر گلہائے عقیدت نچھاور کرنے گئے تو کہا کہ "یہ آخری آرام گاہ اس عظیم صوفی کی ہے جو ملت کی روحانیت کا امین تھا، جس نے اکبر کے ملحدانہ نظریات و حرکات کی دھجیاں اڑائیں اور برصغیر ہندوستان میں اسلام کے نشاۃ الثانیہ کے باعث بنے۔" حضرت شیخ کو عہدِ جہانگیری میں کچھ عرصہ قید خانے میں بھی گذارنا پڑا تھا۔ یہاں

وہ قیدیوں کے فاسد عقائد کی اصلاح کی طرف رجوع ہوئے اور اپنی تعلیمات سے ان کی زندگی اور خیالات میں ایک انقلاب برپا کیا اور انہیں پاک اسلامی رنگ میں رنگ دیا تھا۔

آپ نے عدم تشدد کا راستہ اپنا کر، اپنے مکتوبات کے ذریعہ خاموش جہاد کا ایک سلسلہ چلایا جو بالآخر کامیاب ہو کر رہا۔ شہنشاہ جہانگیر کو دینی معاملات میں آپ کی بالادستی کا معترف ہونا ہی پڑا تھا۔ علامہ نے شیخ کی نسبت یہ کہا ہے

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

شیخ ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰ دسمبر ۱۶۲۴ء کو وفات پائی۔

قصرِ شرف النسار

زندہ رود اور روحی عالمِ برزخ سے ہوتے ہوئے جنت کی فضائے بے جہات میں وارد ہوتے ہیں۔ وہاں ایک حیرت افزا عالمِ رنگ و بو دیکھتے ہیں۔ رات ہے نہ دن۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ ایک معمورۂ حیات، سورج سے بے نیاز، سراپا نور و حضور۔ بل کھاتی ہوئی شفاف نہریں، عنبریں ہوائیں، چاروں طرف گل و گلزار، تجلیات کی بارش، ایک تجلی جنت تو دوسری جہنم، ایک خوب تو دیگر زشت، کیفیات کے بیان سے زبان عاجز ہے۔ اِدھر اُدھر خوب صورت خیمے لگے ہوئے ہیں اور ان میں حورِ خرامان ایسے دل کش و روح افزا ماحول میں ایک کاشانۂ لعل ناب دکھائی دیتا ہے۔ احرام بند حوریں اس کی دربانی پر مامور تھیں۔ زندہ رود نے صاحبِ کاشانہ کے بارے میں دریافت کیا۔ بولے کہ یہ قصرِ شرف النسا ہے جس کے مدفن کے باعث سرزمینِ لاہور مقدس و فلک مرتبہ بن گئی ہے۔

شرف النساء، لاہور اور پنجاب کے گورنر نواب عبدالصمد خان کی نورالعین اور گورنر کشمیر نواب ذکریا خان کی ہمشیرہ تھی۔ نواب عبدالصمد خان نے تقریباً 25 سال تک گورنری کی تھی اور شہنشاہِ ہند محمد شاہ نے حسنِ خدمت کے اعتراف میں ان کو عضدالدولہ اور ہزبرِ جنگ کے خطابات سے نوازا تھا۔ عبدالصمد خان 26 جولائی ۱۷۳۷ء کو لاہور میں فوت ہوئے تھے۔

شرف النساء ایک نیک خاتون تھی۔ ماحینِ حیات نماز و روزہ اور تلاوتِ قرآن پاک میں مشغول رہی۔ اپنے ذوقِ خلوت اور شانِ فقر کے باعث گویا اسلامیات کے سانچے میں ڈھلی نسوانیت کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ تیغ و قرآن اپنے پاس رکھنا اس کا معمول تھا، جو اس کی غیر معمولی دینی فراست اور اس کی معنویت سے گہری واقفیت کی روشن دلیل ہے۔ تلاوت و نماز کے لئے اس کا ایک چبوترہ معین تھا۔

آخری وقت میں اس نے اپنی ماں سے وصیت کی تھی کہ اسی چبوترے پر اس کا مدفن بنے اور تیغ و قرآن دونوں اس کے مزار سے جدا نہ کئے جائیں۔ ایسا ہی کیا گیا اور اس چبوترے پر ایک چھوٹا سا گنبد بنا کر اسے مقفل کر دیا گیا۔ ۱۸۴۰ء میں یہ سب کچھ اسی طرح بحال رہا۔ لیکن جب پنجاب پر سکھوں کا غلبہ ہوا تو انہیں لوٹ کے لئے وہاں کچھ نہ ملا تو، وہی تیغ و قرآن انہیں مالِ غنیمت بن گئے۔

تلوار، قرآن کے تحفظ کے لئے تھی تو قرآنِ کریم نے تلوار پر پابندیاں عائد کر دیں تاکہ اس کے غلط استعمال کی نوبت نہ آئے۔ تیغ و قرآن کے رشتہ کا یہی وہ راز ہے جس سے شرف النساء بخوبی واقف تھی۔ مگر عام مسلمانوں کو اس کی آگہی نہیں۔

زیارت حضرت سید علی ہمدانی و ملّا طاہر غنی کشمیری

شرف النسار کے حالاتِ زندگی اور بے وقت موت کا بیان سُن کر زندہ رود غم زدہ ہو گیا۔ جنت کی سرور آگیں فضائیں بھی اس کی طبیعت پر گراں گذر رہی تھیں۔ ایسے میں کوثر کی جانب سے ایک درد مند آواز سنائی دی۔ کوئی یوں نغمہ سرا تھا ؎

جمع کردم مشتِ خاشاکے کہ سوزم خویش را
گُل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں

یہ صدا درویش منش، صمدیت کے پیکر شاعر ملّا طاہر غنی کشمیری کی تھی، جو شاہِ ہمدان کے حضور اپنا دکھڑا سنا رہا تھا۔ اس کی بے مائیگی کا حال "پیامِ مشرق" میں بھی واضح کیا گیا ہے۔ گھر سے باہر ہوتا تھا تو دروازہ کھلا چھوڑ جاتا تھا۔

اردو کلیاتِ اقبال کے اشاریہ کے مطابق غنی، شیخ محسن فانی کا شاگرد اور صائب و کلیم کا ہم عصر و ہم مشرب تھا۔ عنفوانِ شباب میں ہی ۱۶۶۸ء میں انتقال کیا، جب کہ اس کی شاعری کا دور پورے عروج پر تھا۔ جیسا کہ آگے آیا ہے، غنی اس بات پر فخر محسوس کر رہا ہے کہ اس کے ہم وطن زندہ دل برہمن زادگان (آنجہانی موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو) نے ہندوستان کو ذوقِ آزادی دیا۔ انہیں کی جدوجہد سے ملک کی آزادی کو یقینی امر جتلا کر مطمئن کرنے میں کوشاں پایا گیا ؎

اے کہ از طبع تو کشتِ گل دمید
اے ز امیدِ تو جانہا پر امید
کارواں ہا را صدائے تو درا
تو ز اہلِ خطہ نومیدی چرا

حضرت سید علی شاہ ۱۳۱۲ء میں شہر ہمدان (ایران) میں پیدا

ہوئے۔ آپ حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ علومِ ظاہری و باطنی سے بھی آراستہ تھے۔ حضرت امام غزالیؒ نے آپ ہی کے اجداد سے تصوف کا درس لیا تھا۔ التمش کے فرزند شہاب الدین، حکمرانِ کشمیر کے زمانے میں درویشوں کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ واردِ کشمیر ہوئے۔ شاہ نے آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آپ کے رفقاء آپ اور آپ کے فرزند کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ کشمیریوں کی آبادی کا بڑا حصہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوا۔ کشمیر میں جو مسلمان موجود ہیں، ان ہی کی نسل سے ہیں۔ شاہِ ہمدان نے کشمیر کو نہ صرف دین و تہذیب سے مالا مال کیا بلکہ صنعتِ پارچہ بافی، قالین سازی، نقاشی اور خطاطی کو فروغ دے کر کشمیر کو ایرانِ صغیر کے درجہ کو پہنچا دیا۔

سلطان شہاب الدین کی مذہبی رواداری کا یہ واقعہ ایک سنہرا کارنامہ ہے۔ ایک ہندو وزیر نے گوتم بدھ کے پیتل کے مجسمے کو گلا کر سکے ڈھالنے کی صلاح دی تو اس کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا۔ زندہ رود کی گفتگو کے جواب میں شاہِ ہمدان کے یہ اہم نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں:

۱۔ شر میں بھی خیر کا پہلو ہے۔ یہ گویا سان کا پتھر ہے جو انسان کی خودی کی دھار کو تیز رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔

۲۔ شیطان سے دوستی نہیں جنگ بہتر ہے۔

۳۔ کشمیری اپنی ضعفِ خودی کے باعث مفلسی کا شکار ہیں۔

۴۔ خراج کی وصولی اولوالامر یا جوانمرد فاتحوں کا حق ہے۔

۵۔ شاہی دولت کے عوض خریدی نہیں جا سکتی، ہاں ملک خریدے جا سکتے ہیں۔ ۶۔ عرفانِ نفس سے انسان زماں و مکاں پر قابو پا سکتا ہے۔

شاعرِ ہندی بھرتری ہری دونوں مسافروں نے غنی کشمیری اور شاہِ ہمداں سے

رخصت طلب کی تو غنی نے زندہ رود سے ایک مستانہ غزل کی فرمائش کی۔ زندہ رود نے "زبورِ عجم" کی وہ انقلابی غزل سنائی جس کی لَے پر روح رقص کرنے لگتی ہے، تختِ شاہی پر ضربیں پڑتی ہیں، رستم سے پنجہ لڑانے پر طبیعت آمادہ ہوجاتی ہے غزل سن کر جنت کی حوریں اپنے خیموں کے بھرد کوں سے جھانکنے لگتی ہیں ــــ اور بھرتری ہری بھی کشاں کشاں آ پہنچا ہے۔ بھرتری ہری کو علامہ اقبال نے درویش منش بادشاہ اور شاعر کہا ہے ــــ

بادشاہے بانوائے ارجمند
ہم بہ فقر اندر مقامِ او بلند

بارَبرا اسٹولر ملّر۔ بھرتری ہری کے کلام کی مترجم نے اپنی کتاب The Hermit and the Love of thief میں اس کے ایک قطعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بھرتری بادشاہ نہیں، درباری شاعر تھا۔

Earth his Soft Couch	فلک چھت اس کے سر پر، خاک بستر
Arms of Creeper his Pillow	نہ سر رینگتی ڈالوں کا تکیہ
The Sky his Canopy	رہے رات اس کی روشن چاندنی سے
Tender winds his Fan	ہوا دھیمی، چلائے اس کو پنکھا
The moon his brilliant lamp	ہو نوے بے نیازی اس کی ہمدم
Indifference his detachment & Joy	بنے بے مائیگی ساماں خوشی کا
Tranquil the Ash Smeared	سکوں جوگی کو ایسے میں میسر
Sleeps in Cape hermit like a King.	شہوں کے خوابِ خوش اطوار جیسا

بارَبرا کے مطابق بھرتری ہری پانچویں صدی کا سنسکرت زبان کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی شاعری تین حصوں میں منقسم ہے ــ فلسفیانہ، عاشقانہ اور راہبانہ۔ سلیم چشتی نے اس کو راجہ گندھرواسین کا بیٹا بتایا ہے۔ باپ کے

انتقال کے بعد اس کی سوتیلی ماں کے باپ راجہ دہار نے اس کی پرورش کی۔ اس کی عقلمندی اور ذہانت سے خوش ہوکر اپنے سگے نواسے پر اس کو ترجیح دیتے ہوئے اپنا راج پاٹ اس کے سپرد کر دیتا ہے۔

بھرتری ہری شاعری، موسیقی اور مصوری کا دلدادہ تھا۔ اسے اپنی زندگی کو عیش و عشرت میں گذارنے کی دھن لگی تھی۔ چنانچہ وہ از خود حکومت اپنے سوتیلے بھائی وکرم کو سونپ کر اپنے کاروبارِ عیش میں کھو گیا۔ وکرم نے اسے ہزار منع کیا اور نہ ماننے پر وہ بھی حکومت کو ترک کر کے بنگالہ چلا گیا۔ بھرتری نے اب حکومت ایک قابل درباری کے حوالے کر دی اور اپنے شوق کو پورا کرنے میں لگ گیا۔

ایسے خوش باش راجہ کے ویراگ اختیار کرنے کی پشت پر خود اس کی ملکہ کے گناہ میں ملوث ہونے کا واقعہ بتلایا گیا ہے۔ سلیم چشتی اور باربرا کے بیانات میں ذرا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ سلیم چشتی کے مطابق ملکہ کا گناہ بھرتری کا آنکھوں دیکھا تھا۔ باربرا کا کہنا ہے کہ کسی جوتشی نے ایک نایاب پھل بھرتری کے قابل سمجھ کر اس کو دیا۔ بھرتری نے وہ پھل اپنی ملکہ کو دیا۔ ملکہ نے اپنے یار کے حوالے کیا اور اس کے یار نے اپنی معشوقہ کی نذر کیا۔ آخر میں اس کی معشوقہ نے اپنے یار یعنی بھرتری کے حوالے کیا۔ بھرتری پر اس واقعہ کا ایسے حد شاق گذرا۔ اس نے کہا:

Damn her, damn him, the god of love
The other woman and myself.

یعنی لعنت ہو اس عورت پر، اس مرد پر، عشق پر، اس دوسری عورت پر اور خود مجھ پر۔

غرض دل برداشتہ ہوکر بھرتری نے جنگل کی راہ لی۔ سادھوؤں اور جوگیوں کی تلاش میں نکلا لیکن کسی سے کچھ نہیں ملا۔ آخر چلتا ہوا نیپال کی

ترائی میں مشہور جوگی گورکھ ناتھ کی خدمت میں پہنچا۔ اس کی ارادت میں بھرتری کو سکون نصیب ہوا۔ بارہ برس تک اس کی نگرانی میں علومِ ظاہری و باطنی حاصل کر کے سنیاس مارگ اختیار کیا۔

کہتے ہیں کہ بھرتری نے کئی کتابیں تصنیف کیں، لیکن صرف تین اشٹنگیں باقی رہیں، جن کے ترجمے دیگر زبانوں میں کئے گئے ہیں۔ سلیم چشتی کہتے ہیں کہ اس کے ویراگ اشٹنگ میں سعدی اور عطار کا رنگ پایا جاتا ہے۔

غرض علامہ اقبال کو بھرتری ہری کی درویشانہ روش اور شاعرانہ باریک بینی پسند آئی اور جاوید نامہ میں جنت میں جگہ دی اور پوچھا کہ شعر میں سوز کس کی دین ہے، خدا کی یا خود دی کی؟ بولا کہ آرزو اس سوز کا باعث ہے۔ پھر پوچھا کہ اہلِ ہند کیوں مبتلائے اضطراب ہیں۔ اس میں کیا رازِ خداوندی ہے؟ جواباً کہا کہ میں ان سنگ و خشت کے بتوں اور دیر و کنشت کا قائل نہیں۔ جو کچھ بھی موجود ہے وہ مکافاتِ عمل ہے۔ اس قبیل کا ایک شعر علامہ کے اردو کلام میں بھی پایا جاتا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

بھرتری ہری کے کلام میں اکثر خود اس کے تجربات کا بیان ہے۔

کاخِ سلاطین

بھرتری ہری کے نغمۂ مکافاتِ عمل سے زندہ رود پر طاری کیفیت ابھی زائل نہ ہوئی تھی کہ مولانا رومؒ نے کاخِ سلاطین کی طرف اشارہ کر کے چونکا دیا۔ قصرِ فیروزی میں ایک ہی تخت، پر تین شاہانِ شرق کو جلوہ افروز پایا۔ وہ تھے نادر شاہ ایرانی، احمد شاہ افغانی اور ٹیپو سلطان شہید شاہِ دکن۔ ان تینوں کے کارنامے نوادرِ روزگار ہیں۔ بھولے نہیں بھلائے جاتے۔

"سو عظیم مسلمان" (The Great Hundred Muslims) میں نادر شاہ کو فاتحِ اعظم کہا گیا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ جلال آباد کی خونریزی اور ۲۳ مارچ ۱۷۳۹ء کو دہلی میں ہوئے قتلِ عام کا وحشتناک منظر آنکھوں کے سامنے قیامت کا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ The Reign of Mohd. Shah میں ظہیر الدین ملک نے لکھا ہے کہ صبح نو بجے سے دوپہر دو بجے تک بتیس ہزار مرد و زن اور اطفال کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سیکڑوں عورتیں گرفتار کی گئیں اور صدہا عورتوں نے کنوؤں میں کود کر جان دیدی۔ خوب صورت مکانات اور شرفا کی کوٹھیوں کو نذرِ آتش کیا گیا، اور دوکانیں لوٹی گئیں۔ بازاروں اور گلیوں میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ مسلمانوں نے جوہر کی رسم سے کام لیتے ہوئے اپنے بچّوں اور عورتوں کی جانیں لے لیں۔ یہ قیامت اس وقت ختم ہوئی جب محمد شاہ نے بہ اصرار نظام الملک کے حوالے سے نادر شاہ کو بس کرنے کے لیے کہلا بھیجا۔ اس نے کہا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

نادر شاہ قزلباش (لال ٹوپی والا) ترک تھا۔ اس کا اصل نام نادر قلی بیگ تھا۔ ۱۹۸۸ء میں خراسان کے ایک قریہ میں کاشتکار کے گھر پیدا ہوا۔ بعض کے نزدیک وہ پوستین دوز تھا۔ سترہ سال کی عمر میں دو ازبکوں نے اسے گرفتار کر لیا اور چار سال کے بعد رہائی ہوئی۔ ابتدا ہی سے اس میں جوانمردی کے آثار تھے۔ اس کی بہادری کا شہرہ ہوا تو والیٔ خراسان نے اسے اپنے ہاں ملازمت دیدی۔ نادر نے ازبکوں کے خلاف جنگ میں اپنی بہادری اور شجاعت کے مظاہرے سے افسری پائی۔ (شام سلطنتِ تیموریہ۔ از محمد ذکاءاللہ)۔

جب افغان، ایران پر قابض ہوئے تو سلطان حسین نے بھی ایران

پر افغانی حکومت کی تصدیق کر دی۔ سلطان کے تیسرے فرزند طہماسپ نے منتشر افواج کو اپنے باپ کے پرچم تلے جمع کر کے قزوین میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ مشکلات کے باوجود اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ نادر کو اپنے ساتھ لے کر اس کی حمایت سے ۱۷۳۰ء تک سارے ایران کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ طہماسپ اور اس کے بیٹے عباس سوم (نابالغ) کے بعد نادر نے خود اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سرزمینِ ایران پر ایرانیوں کی بحالی اور افغانوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد نادر نے قندھار کو فتح کیا۔ پھر اس کی نظر سونے کی چڑیا ہندوستان پر جم گئی۔ لہٰذا اسّی ہزار سواروں کو ساتھ لے کر اس کی طرف اقدام کیا۔ مغلیہ سلطنت کے نمک حراموں نے بھی اس کا تعاون کیا۔ اس کے ہاتھوں جو تباہیاں ظہور میں آئیں ان کا بیان پہلے ہی آچکا ہے۔ ہندوستان پر حملے کا مقصد ملک پر قابض ہونا اور اس کو غلام بنانا نہیں تھا۔ چوں کہ مسلسل جنگوں کے باعث ایران کے خزانے خالی ہو چکے تھے۔ اسے حکومتِ ایران کو مستحکم بنانے کے لئے دولت کی ضرورت تھی۔ ہندوستان سے فتح کے بعد لوٹتے ہوئے وہ اپنے ساتھ تین سو ہاتھی۔ دس ہزار گھوڑے اور اتنے ہی اونٹ، نقد پچاس تا اسّی کروڑ روپیہ، تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا لے گیا۔

واپس جانے سے پہلے محمد شاہ کو اس کی حکومت بحال کر دی اور اپنے بیٹے کی شادی مغل شاہزادی کے ساتھ بڑی دھوم سے رچائی۔ واپسی کے سات سال بعد دشمنوں نے نادر شاہ کو قتل کر دیا۔

وحشتناک قتل و خونریزی کے گھناؤنے واقعات کے باوجود علامہ نے نادر شاہ کو جنت میں دکھایا ہے۔ یہ بات کچھ بعید از فہم معلوم تو ہوتی ہے۔ لیکن اورنگ زیب کے بعد سلطنت مغلیہ کے واقعات قابلِ غور ہیں۔ اورنگ زیب کا کوئی جانشین اس قابل نہیں تھا کہ وسیع سلطنت کا نظام بخوبی

چلا سکے۔ شاہزادوں کے درمیان خلفشار پیدا ہوگیا۔ سلطنت کو پانے میں جو بھی کامیاب ہوا وہ امرار کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گیا۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ حکام اور امرار کو بھی اپنی اپنی سوجھی۔ غریب رعایا کا کوئی پرسانِ حال نہ رہا تھا۔

"شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر" ایک حقیقت ثابت ہوئی۔ اس کے بھیانک نتائج نصِ قرآن سے بھی واضح ہیں۔ (الشوریٰ ۴۳) یعنی جو پڑے تم پر مصیبت سو وہ بدلہ ہے اس کا جو کمایا تمہارے ہاتھوں نے اور معاف کرتا ہے وہ بہت سے گناہ۔ ہندوستان سے واپسی کے بعد نادر شاہ صرف سات سال زندہ رہا۔ بعد اس کے دشمنوں نے اسے قتل کر دیا۔

نادر شاہ کی شخصیت میں کچھ ایسی خوبیاں بھی ہیں کہ جن کا اعتراف نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ جیسے ـــــ بہادری اور جوانمردی اس کا ایک ذاتی جوہر ہے۔ جس کی بنا پر وہ کاشتکار کی سطح سے اٹھ کر تختِ ایران پر جلوہ فروز ہوا۔ خودی، خودداری اور خود اعتمادی اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جب اس کے بیٹے کی شادی مغلیہ شاہزادی سے ہونے والی تھی تب حسبِ روایت اس کی سات پشتوں کے نام طلب کیے گئے۔ اس نے کہلا بھیجا:

"بگو دامادِ شما پسرِ نادر شاہ است، و نادرِ شاہ پسرِ شمشیر تاہم چنیں ہفتاد بار بشمار" (بولو کہ تمہارا داماد نادر شاہ کا فرزند ہے اور نادر شاہ شمشیر کا فرزند اسی طرح ستر پشت شمار کر لیں)۔ اس سے اس کا اندھی روایات سے گریز، حق گوئی و بے باکی جھلکتی ہے۔ تمام عمر اس نے معرکہ آرائی میں گذاری اور کامیاب رہا۔ اس سے اس کی حرکی زندگی کا ثبوت ملتا ہے۔ ایران کو افغانوں کے قبضہ سے نکال کر ایرانیوں کے سپرد کیا۔ اپنی مردانگی کے اثر سے مُردہ ایرانیوں کو مرد بنا دیا۔ فیاض اتنا کہ وقتِ رخصت محمد شاہ کو اس کی بادشاہت بحال کر دی۔ کسی کو غلام نہیں بنایا۔ شاید انہی غیر معمولی خصوصیات کے صلہ میں علامہ نے اس کو جنت نشیں

بتلایا ہے۔

جنت میں نادر شاہ نے زندہ رود سے ایران کے موجودہ حالات دریافت کیے۔ زندہ رود نے بتایا کہ اہلِ ایران بڑی مدت کے بعد جو بیدار ہوئے تو تقلیدِ فرنگ کرنے لگے۔ اپنی قوم پر عرب کے احسانات کو یک لخت بھلا دیا۔ وطن پرستی اہلِ قبور سے بے جا عقیدت میں کھو گئی۔ زندہ رود نے یزدجرد کے زمانے میں ایران کی پست حالی اور عربوں کی فتح کے بعد ایران پر ان کے احسانات یاد دلائے۔

ناصر خسرو کی غزل اس مقام پر پہنچ کر علامہ اقبال نے قدرے توقف کیا ہے۔ نادر شاہ کے تذکرے کے بعد اصولاً احمد شاہ ابدالی اور حضرت ٹیپو سلطان شہید کا ذکر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن یکایک ناصر خسرو علوی کی روح نمودار ہوتی ہے اور معنویت کے اعتبار سے ایک اہم سیاسی غزل سنا کر غائب ہو جاتی ہے۔ سلیم چشتی نے ناصر کے بارے میں جو معلومات جمع کی ہیں اس کی تلخیص یہ ہے:

ناصر خسرو کا اصلی نام حجبِ خراسانی و بدخشاں ابو المعین ناصر بن خسرو ہے۔ ۱۰۰۴ء میں بمقام قصادیاں حوالی بلخ میں پیدا ہوا۔ تمام علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں مصر میں فاطمی حکومت تھی۔ اس کے حکمران اسمٰعیلی مذہب کے پیرو تھے۔ علوم عقلیہ سے ان کو اور ان کے مبلغین کو زیادہ شغف تھا۔ ناصر خسرو کی مصر میں بڑی پذیرائی ہوئی اور انعامات و قدر افزائی سے نوازا گیا۔ ناصر خسرو فلسفیانہ مذاق رکھتا تھا۔ اس کی تصانیف مطالعہ کے لائق ہیں۔ وہ شاعر تھا اور اس کا ایک دیوان بھی ہے۔ اسماعیلیہ فرقہ میں اس کو اونچا مقام حاصل ہے۔ ۱۰۸۷ء

میں اس نے وفات پائی۔ مذکورۂ بالا غزل اسی دیوان سے جاوید نامہ میں شامل کی گئی ہے۔

غزل میں تیغ (قوت)، قلم (علم) اور دین کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علم کے بغیر تلوار کا راست استعمال مشکوک ہوتا ہے اور تلوار کے بغیر علم کا تحفظ بھی بیخ یقینی ہے۔ ہر قوم کی ترقی کے لئے یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ صرف علم اور تلوار کے بل پر کوئی قوم ترقی کرے بھی تو دین کی تقویم کے بغیر نہ امن و سکون میسّر آسکتا ہے نہ معاشرے کا استحکام۔ دین جاہل دینداروں سے ذلیل اور داناؤں سے باعزت ہوتا ہے۔

اس غزل کا اندراج جس مقام پر کیا گیا ہے اس سے ایک ہی تخت پر جلوہ افروز تین عظیم شاہانِ مشرق کے درمیان ایک خطِ امتیاز ایسا کھینچ جاتا ہے کہ ایک، ایک طرف اور دو، دوسری طرف ہو جاتے ہیں۔ علم اور دین کی حمایت کے لحاظ سے احمد شاہ ابدالی اور ٹیپو سلطان شہیدؒ کی یک جائی میں کسی کو اختلاف رائے ہو، بعید از فہم ہے۔

احمد شاہ ابدالی

نادر شاہ کی فاتحانہ عظمت کا کون قائل نہیں؟ لیکن اس کا انجام افسوس ناک رہا۔ ۱۷۴۷ء میں خود اس کے اپنوں نے اس کو قتل کر دیا اور اس کے بعد اس کی سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے۔ احمد خان جس کو اس نے اپنا محافظ مقرر کیا تھا، اس وقت جائے وقوع پر موجود نہیں تھا۔ بعد میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا کر نادر شاہ کے خاندان کو بچایا۔ جب وہاں اس کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی تو وہ قندھار لوٹ آیا۔

قندھار میں جوں ہی نادر شاہ کے قتل کی خبر پہنچی تو افغانی قبائل کے سردار درگاہِ "شیر سرخ" میں اپنے لئے ایک سردارِ اعلیٰ چننے کے لئے

جمع ہوئے۔ کئی نام پیش کئے گئے لیکن کسی کے حق میں اتفاق رائے قائم نہ ہوا۔ آٹھ نشستیں بے سود ثابت ہوئیں۔ نویں مرتبہ شیخ صابر نامی ایک بزرگ نے احمد خان کا نام پیش کیا اور سبھوں نے اتفاق کرتے ہوئے اسے اپنا قائد بنا لیا۔ اس وقت احمد خان مشکل سے 25 سالہ نوجوان تھا۔ رسم تاجپوشی کی ادائیگی بالکل سادہ طریقہ سے انجام پائی۔ کلغی کے بجائے اس کی دستار میں گیہوں کی ایک بالی لگائی گئی۔ شیخ صابر نے اسے "درِّ دوراں" کے لقب سے نوازا۔ اس تقریب کے بعد احمد خان، احمد شاہ ہو گیا۔ احمد شاہ نے باقی ماندہ افغانی قبائل کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ ابتدا تھی ایک مستقل افغانی حکومت کی۔

احمد شاہ ابدالی ثم درانی، سدوزئی قبیلہ کا فرد تھا۔ خواجہ ابو احمد ابدال چشتی اس کے جد اعلیٰ ترین کے مرشد تھے۔ اسی لئے اس خاندان کے تمام افراد 'ابدالی' کے لقب سے مشرف ہوئے۔ احمد خان، زمان خان حاکم ہرات کا دوسرا بیٹا تھا۔ احمد کے بچپن ہی میں زمان خان راہیِ ملکِ عدم ہو چکا تھا۔ اس کی ماں زرگونہ بی بی نے اچھی دانشمندی کے ساتھ اس کی پرورش کی اور اخلاقِ حسنہ کے سانچے میں ڈھالا۔ احمد خان کا بڑا بھائی اپنے باپ کے بعد حاکمِ ہرات ہوا۔ اس کی سیادتی سرگرمی سے بدظن ہو کر نادر شاہ نے ہرات پر حملہ کر کے اسے مغلوب کر لیا۔ بعد میں خود ہی ہرات کی حکمرانی اسی کو سونپ کر احمد خان کو اپنا باڈی گارڈ بنا کر واپس ہوا۔ احمد خان نے اپنی ہوش مندی خوش اخلاقی اور دلیری سے نادر شاہ کے دل میں گھر بنا لیا۔ جوں جوں اس کے ذاتی جوہر کھلتے چلے گئے نادر شاہ اس کی خوبیوں کا زیادہ سے زیادہ معترف ہوتا گیا۔ اور کہنے لگا کہ اس کی وسیع سلطنت میں کوئی ایک فرد بھی اس کی ہمسری کرنے کے قابل نہیں۔ ہندوستان پر حملۂ نادری کے وقت

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے چھ ہزار سواروں کا ایک دستہ اس کی کمان میں دیا تھا۔ اور احمد خان نے بھی خود کو اس قابل ثابت کر دکھایا تھا۔

قندھار کی عنانِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لیتے ہی احمد شاہ کو اس کے استحکام کی فکر اور دولت کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسے وقت خوش قسمتی سے ناصر خان کی جمع کی ہوئی دولت، جو نادر شاہ کے لئے لے جا رہا تھا، اس کے ہاتھ آئی۔ احمد شاہ نے اس کو قبیلوں کی بہبودی کے لئے تقسیم کر دیا۔ اس طرح ان کے دل موہ لیئے۔ اسی سلسلہ کی اور ضرورتوں کے لئے مزید دولت درکار تھی۔ چنانچہ اس کے لئے اس کی نظریں بھی ہندوستان پر جم گئیں۔ پھر کیا تھا کابل، پشاور اور پنجاب کو فتح کرتے ہوئے ۱۷۵۷ء کو دلی پر قابض ہو گیا۔ محل کے اندر جو دفینہ تھا نکلوایا، جس سے سولہ لاکھ روپئے ہاتھ لگے۔ پھر شہر کے دولت مندوں اور جوہریوں کو لوٹا۔ متھرا اور آگرہ کو اسی غرض سے اپنے دستے روانہ کیئے۔ اسی دوران میں تیمور شاہ کا نکاح عالمگیر ثانی کی بیٹی سے کروایا، اور محمد شاہ کی بیٹی سے خود نکاح کر لیا۔ ہندوستان سے واپسی کے وقت دولتِ کثیر اور گرفتار شدہ شہزادیوں کو ساتھ لے گیا۔

احمد شاہ نے ہندوستان پر سات حملے کیئے۔ ان میں ۱۷۶۱ء کا معرکہ، جو مرہٹوں کے خلاف پانی پت میں وقوع پذیر ہوا تھا، ایک نہایت اہم معرکہ ثابت ہوا۔ اس کے نتیجہ میں مغلیہ حکومت، جو بے حد کمزور ہو گئی تھی، بچ گئی اور مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اسلام کا وقار باقی رہ گیا۔ احمد شاہ نے سکھوں کی بھی خوب خبر لی اور مغلوب کر لیا۔ دار السلطنت کو لوٹا۔ اقبال مند اس عظیم فاتح کا انتقال ۱۷۷۲ء میں ہوا۔

احمد شاہ ابدالی بڑا نیک دل، خوش طینت اور جری بادشاہ تھا۔ انسانیت اور انکساری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ

عدل و انصاف کا دلدادہ اور بہترین ناظمِ مملکت تھا۔ اس نے ایک نورکنی مشاورتی مجلس تشکیل دی تھی تاکہ انتظامی امور میں اس کا تعاون حاصل ہو۔ اس کا طرزِ حکومت آمری نہیں جمہوری تھا۔ بہادری کے ساتھ ساتھ انکساری جیسی دو متضاد صفات اس کی طبیعت میں شامل تھیں۔ ہر لحاظ سے اس نے پاکیزہ اور نیک زندگی بسر کی۔ نظامِ حکومت کی حد تک وہ بادشاہ اور باقی اوقات میں ایک ہمدردِ خاص و عام اور اچھا انسان تھا۔ سب کے ساتھ سادگی سے ملتا تھا۔ اس کی رعایا پیار سے اس کو 'احمد شاہ بابا' کے نام سے پکارتی تھی۔ اور اسے ولی اللہ بھی تصور کرتی تھی۔

احمد شاہ کو شاہانہ سیر و تفریح سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اپنے فرصت کے اوقات اس نے ادبی مصروفیات کے لیے مختص کر لیے تھے۔ گو اس کی ادبی قابلیت اور زدق کا شہرہ نہ ہوا۔ وہ پشتو زبان کا اچھا شاعر تھا۔ ایک دیوان اس کی یادگار ہے۔ عربی زبان میں نظم و نثر میں بھی کافی حد تک مہارت رکھتا تھا۔ The Hundred Greate Muslims کے مصنف خواجہ جے احمد نے لکھا ہے کہ داؤد خان نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران میں احمد شاہ کا پشتو دیوان شائع کرایا تھا۔ یہ دیوان ایک ہزار غزلوں، رباعیات اور قطعات پر مشتمل ہے۔ محمد غوث نے 'شرح الشرح' میں جو فارسی کا مسودہ ہے۔ اس عظیم فاتح کی عربی تخلیقات پر تبصرہ کیا ہے۔ مردِ میدان، ناظم مملکت اور شاعر و نثار۔ ان تینوں خصوصیات کی ایک ہی شخصیت میں یکجائی ایک نادر الوقوع بات ہے۔ غرض ہر رنگ میں احمد شاہ نے ایک کامیاب زندگی بسر کی تھی۔

احمد شاہ ابدالی کے دل میں ماں کا بڑا احترام تھا۔ اس کی اطاعت شعاری کے باب میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کافی ہے۔ نادر شاہ نے قندھار کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنا کر تباہ کر دیا تھا۔ اس کی از سرِ نو تعمیر اور آباد کاری کا منصوبہ بناتے ہوئے احمد شاہ نے سب سے پہلے اس مقام کے اطراف ایک خندق

کمدلانے کا فیصلہ کیا۔ جب زرگونہ بی بی کو اس کی خبر ملی تو لکھ بھیجا کہ وہاں تک دشمن کی رسائی کا تصور کرنا بھی بڑی شرمناک بات ہے تو، اطاعت شعار بیٹے نے اس خیال کو فوراً ترک کر دیا۔

احمد شاہ ابدالی، جیسا کہ جاوید نامہ میں پیش کیا گیا ہے، افغانستان کے حالات پر متفکر پایا جاتا ہے۔ زندہ رود سے انقلاباتِ زمانہ اور افغانوں پر اس کے اثرات کے متعلق سوال کرتا ہے۔ زندہ رود نے ان کی باہمی کشاکش پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا، جب کہ دیگر اقوام آپسی رشتوں کو مضبوط کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں تو افغان خود اپنوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ نہ اپنی خودی سے مانوس ہیں نہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں اور امکانات کا ان کو علم ہے۔ نہ منزل کی خبر ہے نہ راستے سے واقف ہیں۔ افغانی نے کہا کہ یہ تو دل کی موت کی نشانی ہے۔ ایشیا میں افغانستان کی اہمیت جسمِ انسانی میں دل کے برابر ہے۔ فسادِ افغان ایشیا کا فساد اور اس کی آزادی سارے ایشیا کی آزادی کے برابر ہے۔

پھر تہذیبِ مغرب پر تبصرہ فرمایا کہ مغربی اقوام اگر قوی اور مستحکم نظر آتی ہیں تو یہ ان کے رنگ و روپ کے باعث ہے اور نہ ان کے لباس، وضع قطع اور رقص و سرود کو اس میں دخل ہے۔ ان کی برتری ان کے علم و ہنر کی برتری کے سبب ہے۔

افغانوں کو مغرب کے علم و ہنر سے استفادہ کرنا ہے نہ کہ طرزِ زندگی سے۔ زندہ رود نے بھی اپنے بیان میں مغربی تہذیب کی مذمت کی اور کہا کہ مشرق کی تقدیر کا انحصار آج نادر شاہ درانی اور رضا شاہ پہلوی پر ہے۔ انہوں نے زمانے کو خوب جانچا ہے۔ افغانوں کو آج خود پر بھروسہ کرنا چاہیئے اہلِ مغرب کی تقلید پر نہیں۔

ٹیپو سلطان شہیدؒ

نام صرف نام نہیں ہوتے، خصوصاً مشاہیر اور عظیم ہستیوں کے۔ ناموں کے پیچھے ان کی زندگی کے نشیب و فراز، ان کی مکمل شخصیت اور اول آخر سب آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ جاوید نامہ میں قدیم زمانے سے متعلق فرعون سے لے کر علامہ کے ہم عصروں کے نام تک آئے ہیں۔ گفتگو میں ان کے افکار اور کردار کی طرف کچھ اس انداز سے اشارے پیش ہوئے ہیں کہ ان کی مکمل شخصیت کے خاکے تشکیل پا جاتے ہیں۔

عارف ہندی (جہاں دوست) کا حلیہ الفاظ میں ڈھلا ہو بہو ایک رشی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ پُر مغز گفتگو سے افکار کی بلندی اور حقائق سے آگہی اور گہری دل چسپی و جستجو کا پتہ چلتا ہے۔ فلک عطارد میں دو مجاہدینِ اسلام کی فراست دینی اور حکمتِ قرآنی کو سامنے لایا گیا ہے۔ فلک مشتری میں دو سرفروش عاشقوں کے ساتھ ایک صوفی، بلند پایہ شاعر کو اس کے خاص رنگ میں دکھایا گیا ہے۔ پسرِ شمشیر نادر شاہ ایرانی، پرسسِ ملّتِ افغانیہ احمد شاہ ابدالی، اپنے وقت کے دو عظیم فاتحوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ تمام کاملینِ روزگار کے آخر میں حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کا ذکر آیا ہے۔ ایک خدا پرست، درویش منش جلال و جمال کے پیکر، اس بادشاہ کی زندگی اور موت دونوں ملک و ملّت کے لئے وجہِ ناز و افتخار ہیں۔

اپنی پہلی تصنیف "اسرارِ خودی" میں علامہ اقبال نے پہلی بار مسئلۂ خودی کو چھیڑا، اور اسی کی بنیاد پر باقی تمام تصانیف کے ذریعہ ایک فلک رس عمارت تعمیر کی۔ تمہید میں کہا ہے

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردہ، اسرارِ زیست

دردمندیٔ آدم میں فکری انہماک نے آپ پر اسرارِ زیست فاش کیے اور 'خودی' کو مرکزیت کا مقام دیا۔ احساسِ خودی، تربیت اور استحکام کے سلسلے میں آپ نے ایک ذہنی خاکہ پیش کرتے ہوئے اس میں خوب رنگ بھرے۔ اس نقش کا غور سے معائنہ کیا جائے تو سلطان شہیدؒ کا سراپا ابھر آتا ہے۔ وہی بلند مقاصد، عشق و اطاعتِ رسولؐ، عقیدتِ علی مرتضیٰؓ، صوم و صلوٰۃ کی پابندی زہد و تقویٰ کا لحاظ، غیرِ حق سے بے نیازی، لا الٰہ الا اللہ پر انحصار۔ مزید برآں سنتِ شبیریؓ کو اپناتے ہوئے دشمنوں کے نرغے میں شدتِ تشنگی میں جامِ شہادت کا نوش کرنا، آپ ہی کا حق تھا۔ شاہانِ سلف میں، میدانِ کارزار میں سپاہیانہ انداز سے آپ کے سوا کسی نے اپنی جان کی قربانی نہیں دی۔ اپنی سلطنت کو خداداد سلطنت کہہ کر فقط ایک محافظ کا کردار ادا کیا۔

؎ نہ شادی داد سامانے نہ غم آورد نقصانے
بدیں سلطاں کہ آمد شد دریں عالم چو مہمانے

ٹیپو سلطان نومبر ۱۷۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ دعاؤں کا یہ پھل حیدر علی کے لئے نہایت نیک شگون ثابت ہوا۔ چند ہی برسوں میں حیدر علی نائک کے عہدے سے ترقی کر کے ڈنڈیگل اور سرا کی گورنری پر فائز ہوئے۔ نیک بخت فرزند بڑا ذہین تھا۔ باپ نے اس کی تعلیم و تربیت کیلئے ملک کے ممتاز اور ماہر اساتذہ کا انتخاب کیا۔ سلطان نے رائج الوقت تمام زبانیں مثلاً ــــ فارسی، عربی، اردو، مرہٹی اور کنڑی زبانیں سیکھ لیں۔ قرآنِ پاک اور حدیث شریف کا علم بھی اچھی طرح حاصل کیا۔ بعد میں ضرورتاً انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بھی سیکھیں۔ حیدر علی نے مشاقانِ فن سے سپاہ گری اور تیر اندازی میں بھی اچھی تربیت کا انتظام کیا۔ دینی اور اخلاقی تربیت پر بھی خاص توجہ دی، اور ہر لحاظ سے خوب نکھارا۔ آخر میں خود ٹیپو سلطان کے ہاتھ سے ایک اقرار نامہ

کڑی شرائط پر مشتمل، نقل کروایا اور اس پر دستخط لے کر فرمانبردار بیٹے کو ان کی پابندی پر عمر بھر کے لیے جکڑ دیا۔

جب شاہ ابو سعیدؒ اور شاہ ابوالحسنؒ بغرضِ اصلاح و تبلیغ رائے بریلی سے میسور تشریف فرما ہوئے تو تحصیلِ فیوضِ روحانی کے دروازے کھل گئے۔ حیدر علی اور ان کا پورا خاندان ان بزرگوں کے ہاتھ پر بیعت سے مشرف ہوا۔ ٹیپو سلطان کے روحانی فیوض خصوصاً شاہ ابوالحسنؒ کے مرہونِ منت ہیں۔ سلطان اپنی پندرہ سالہ عمر ہی سے اپنے باپ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہونے لگے تھے۔ بدنور کی فتح میں ان کی سپہ سالاری کے جوہر کھلے۔

سلطنتِ مغلیہ کے تنزل کے ساتھ ہندوستان میں غیر ملکی طاقتیں سرگرم ہو کر نظامِ مملکت میں دشواریاں پیدا کرنے لگیں۔ بنگال میں اپنی ریشہ دوانیوں سے ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کو انگریزوں نے شکست دی اور بعد میں اس کو قتل کر دیا۔ میر جعفر اور میر قاسم کے پردے میں اپنی حکومت چلانے لگے۔ صرف دکن میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے ان کو بہت خوف تھا۔

ٹیپو سلطان نے نظام حیدر آباد اور مرہٹوں کے ساتھ اتحاد پیدا کر کے انگریزوں کے کالے منصوبوں کو ختم کرنا اور ان کو ملک سے باہر نکال دینا چاہا۔ لیکن بد اندیشوں کو اتنی دور اندیشی کہاں تھی۔ سارے ملک پر منڈلاتے ہوئے غلامی کے بادلوں کو انہوں نے کب دیکھا۔ خود ٹیپو سلطان کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور انگریزوں سے ساز باز کرتے ہوئے خود نیک دل سلطان کو مٹانے کے درپے ہو گئے۔ سلطنتِ خداداد کے غداروں کو بھی خرید لیا۔ اگرچہ کہ ہندو مسلم تمام رعایا ٹیپو کی فدائی تھی اور اس کی عمر اور سلطنت کی درازی کے لیے دعا گو بھی تھی۔ مگر ان غداروں کے بچھائے ہوئے جال کے آگے سب بے سود ثابت ہوا۔

ٹیپو سلطان سارے ہندوستان اور ساری قوم کا درد اپنے دل میں لئے ہوئے تنہا آگے بڑھے۔ والیٔ افغانستان زمان خان اور ترکوں سے بھی امداد طلب کی۔ فرانسیسی حکومت سے بھی مدد مانگی۔ مگر کہیں سے کوئی مدد نہیں پہنچی۔ اب پورے ہندوستان کی حمایت میں صرف لشکرِ سلطانی تھا اور ساری قوم کا نمائندہ ٹیپو، چاہتا تھا کہ انگریزوں کو ملک سے باہر نکال پھینکے۔ لارڈ کارنوالس کا کہنا ٹھیک ہے کہ اگر ٹیپو کو زندہ چھوڑ دیا جاتا تو انگریزوں کو ہندوستان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنا ہر ایک حربہ استعمال کیا۔ اتحادیوں اور غداروں نے مل کر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو سلطان کو میدانِ جنگ میں شہید کر دیا۔ ٹیپو سلطان کو ۱۷۹۴ء میں ایک خواب کے ذریعہ خود حضورؐ نے شہادت کی بشارت دیدی تھی۔ صبح اٹھ کر آپ نے نمازِ شکرانہ بھی ادا کی تھی۔

ٹیپو سلطان پر متعصب ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ رواداری میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ انہوں نے اپنی ہندو مسلم رعایا کو کبھی الگ الگ نظر سے نہیں دیکھا۔ کسی کے ساتھ تعصب نہیں برتا۔ مساجد اور منادر دونوں کے لئے آپ کی امداد جاری رہی۔ مرہٹوں نے جب سرنگیری پر دھاوا بول کر وہاں مندر اور مٹھ کو لوٹا اور شاردا دیوی کے مجسمے کی بے حرمتی کی تو سلطان نے اس کی آبادکاری کے لئے ضروری امداد بہم پہنچائی اور مندر کی ہر چیز کو بحال کر دینے کے احکامات جاری کئے۔ ننجنگڈھ کی دیول اور دیگر مندروں کو انہوں نے جو امداد دی تھی اس کی تفصیل جناب معین الدین نے اپنی کتاب The Sunset in Srirangapatnam میں دی ہے۔

مستشرقین اور متعصب مورخوں کا اکثر مسلم حکمرانوں پر یہ بے جا الزام ہے کہ انہوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو جبراً داخلِ اسلام کیا۔ اگر اس خیال میں رتی بھر بھی سچائی ہوتی تو تاریخ کے ایک طویل زمانے سے نہ صرف میسور

بلکہ ہندوستان کی اکثریتی آبادی غیر مسلم یا ہندو نہ ہوتی۔ ٹیپو نے کبھی کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان بنانا پسند نہیں کیا۔ انہوں نے ہمیشہ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ کی پابندی کی۔ البتہ کسی نے تبدیلیٔ مذہب کی برضا و رغبت خواہش ظاہر کی تو اسلام میں داخل ہونے کی سفارش کی۔

ٹیپو کی انصاف پسندی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے غداروں کو بھی بلا ثبوت کبھی کوئی سزا نہیں دی۔ جہاں تک رفاہِ عام کا معاملہ ہے سلطان نے کئی منصوبے بنائے اور ان پر عمل درآمد کروایا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ ملا۔ یہ ان کی زرعی پالیسی کا طفیل ہے کہ میسور میں زمینداری کو کبھی پنپنے کا موقع نہیں ملا۔ بیرونی ممالک کے ساتھ تجارت کے لئے سہولتیں پیدا کیں۔ ریشم کی صنعت کو بھرپور فروغ دیا۔ سلطان کو قدرت کی طرف سے ایک اختراعی ذہن ملا تھا۔ کئی ایک چیزوں کی اولیت کا سہرہ ان کے سر بندھتا ہے۔ دنیا میں پہلی راکٹ کے ایجاد کا سہرہ بھی سلطان کے سر رہا ہے۔ ٹیپو سلطان ہی وہ اولین بادشاہ ہیں جنہوں نے پنچایت راج اور پارلیمانی طرزِ حکومت کو باقاعدہ وجود میں لایا تھا۔ مردم شماری کی اہمیت کو سمجھ کر اس پر عمل کروایا۔ کاویری پر بند بنانے کا منصوبہ بھی آپ ہی کا ہے۔ اس کی بنیاد بھی آپ نے رکھ دی تھی۔ جس جگہ بنیاد رکھی گئی تھی ٹھیک اسی جگہ پر آج کرشنا راج ساگر ڈیم تعمیر کیا گیا ہے۔

جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے "پیامِ ٹیپو بنام کاویری" عنوان کے تحت ٹیپو سلطان کے نظریہ حیات سے بحث کی ہے، اور درج ذیل نتائج اخذ کئے ہیں:

۱۔ حرکت زندگی کی علامت ہے اور سکون موت کی۔ اس فلسفۂ حیات کی گونج ہمیں "پیامِ مشرق" میں بھی سنائی دیتی ہے..... یعنی زندگی

ایک تغیر پذیر ارتقائی عمل ہے۔ گذرے ہوئے کل سے آج کا بہتر ہونا زندگی کی دلیل ہے۔

۲۔ موت کے بارے میں کہا ہے کہ اس جہاں میں پیدا ہونے کا انجام موت ہے۔ لیکن موت ایک مختصر لمحہ کی بات ہے۔ زندگی اور موت بہار و خزاں کی طرح دوش بدوش واقع ہیں۔

۳۔ غلام خوفِ مرگ کے باعث مر مر کے جیتے ہیں۔ ان کے برعکس آزاد بندے موت کو خود اپنا شکار بنانے کے لئے اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔

۴۔ آدمی کو چاہئے کہ اس مختصر سی زندگی میں اپنے اندر قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لائے۔

۵۔ جو بھی آدمی جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہ کر جان دے، وہ شہید کہلائے گا۔ اس کے لئے موت صرف لمحہ بھر کی ہے پھر زندگی ہی زندگی۔ قرآنِ کریم شاہد ہے: (ترجمہ) "نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں" (البقرہ: ۱۵۴)۔ یہی سنتِ شبیری اور منزلِ عشق کی انتہا ہے۔

۶۔ جنگوں اور جہاد میں تمیز بتلائی ہے۔ جہاد بقولِ نبوی ؐ رہبانیتِ اسلام (ترکِ دنیا) کے مترادف ہے۔ یہ باطل کے خلاف معرکہ ہے۔ ہوسِ ملک و مال کی تحریک پر مبنی نہیں جو عام بادشاہوں کی جنگ ہے۔

۷۔ اس ضمن میں دو شعروں میں حضرت ٹیپو سلطان شہید کے مشہور اقوال کا اعادہ کیا گیا ہے ؎

زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات
از خدا کم خواستم طولِ حیات
زندگی را چیست رسم و دین کیش
یک دمِ شبری بہ از صد سالِ میش

پہلے شعر میں سلطان شہید کی گوناگوں مصروفیات کا ذکر مبہم انداز میں کیا گیا ہے — اسّی ہزار مربع میل سے زیادہ وسیع مملکت کا انتظام و انصرام، ملک کے اندر اور باہر کے دشمنوں پر نظر رکھنا۔ رعایا کے امن و سکون اور خوشحالی سے غفلت نہ برتنا، ترقیاتی منصوبے بنانا اور ان پر مستعدی سے عمل درآمد کروانا، غیر ممالک سے سفارتی رابطے برقرار رکھنا، تجارت کو فروغ دینا، علم و ادب میں دلچسپی لیتے ہوئے پینتالیس سے زیادہ کتابیں، ان میں سے خود کچھ تصنیف کرنا اور باقی اپنی سرپرستی میں لکھوانا، ساتھ ساتھ امورِ دین کی بجا آوری، اور جنگوں کے سلسلہ میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک ساری مملکت کو جولان گاہ بنانا۔۔۔۔۔۔۔ ان سارے کاموں کی انجام دہی کے لئے ٹیپو سلطان کو صرف سترہ سال کی حاکمانہ مہلت ملی۔ مختصر مدت اور سلطانی دائرۂ کار کی یہ وسعت انسانی عزم و استقلال کی ایک کرامت سے کم نہیں معلوم ہوتی۔ تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو سلطنتِ خداداد کا ہر شعبۂ حیات فعال اور متحرک نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ٹیپو کی فعال سیرت و کردار سلطنتِ خداداد کی رگوں میں گرم خون بن کر دوڑ رہے تھے۔ ایسے کارہائے نمایاں کی انجام دہی کے لئے کسی دوسرے کو ایک صدی کی مدت بھی ناکافی معلوم ہوتی ہے۔ جب ٹیپو سلطان ایک مختصر سی مہلت میں کارِ جہاں دراز انجام دے سکے تو پھر طویل عمر کی ضرورت کیا ہے؟

دوسرے شعر میں سلطان شہید کے ایک مشہورِ زمانہ قول کا آزاد ترجمہ کیا گیا ہے۔ یعنی "گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک روزہ زندگی بہتر ہے۔" سلطان کے قول و عمل میں کبھی کوئی تفاوت نہیں تھا۔ سلطان کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے۔ اس کی قدر کرتے ہوئے اس کو کام میں لائیں تو طویل عمر کی ضرورت بے معنی ہو گی۔ دراصل اسی میں تسخیرِ زبانی کا

راز پوشیدہ ہے۔ غرض ٹیپو سلطان کی زندگی اس کا بہترین نمونہ ہے جسے اپنا کر سرخ روئی حاصل کی جا سکتی ہے ہے

خوشا خاکِ دکن تو نے کیا کیسا جواں پیدا
نہیں ہوتے، نہیں ہوتے، زمیں سے آسماں پیدا

جنّت سے رخصتی

جنّت کی سیر اور خصوصاً سلطان شہید کی بارگاہ میں حضوری کا زندہ رود کی طبیعت پر گہرا اثر پڑا۔ صبر و سکون کھو گیا۔ عین اس عالم میں مولانا روم نے اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور بوجھل دل کے ساتھ زندہ رود ان کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں کاخِ سلاطین کے در پر پہنچے تو حوروں کے ایک ہجوم کو وہاں اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے مزید کچھ دیر رکنے کی درخواست کی۔ چوں کہ عاشقوں کا اصول کسی جگہ قیام نہیں، مسلسل سفر ہے۔ اس لیئے انہوں نے معذرت پیش کی۔ حوروں نے کم سے کم ایک غزل سنانے کی فرمائش کی۔ چنانچہ زندہ رود نے ایک غزل سنائی جو سیرِ افلاک اور ان کے مشاہدات کا نچوڑ معلوم ہوتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہے :— "ہم قلندر ہیں اور ہمارا کام جہاں بینی ہے۔ لہٰذا ہم صرف بصیرت (نگاہ) عطا کر سکتے ہیں۔ ہماری تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ عرفانِ حق، عرفانِ نفس پر منحصر ہے۔ عرفانِ نفس اور عرفانِ حق عاشقوں کی صحبت ہی سے ممکن ہے نہ کہ ریاکاروں کی صحبت سے، جو عارفوں کا لبادہ اوڑھے ہوئے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ عشق میں ہی فقیری کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے اور فقر کی پختگی کے لیئے بادشاہی، ہی کسوٹی ہے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ کاخِ سلاطین سے رخصت ہوتے ہیں۔

زندہ رود اپنی اس عارفانہ غزل کو سنانے کے بعد ہجومِ حوراں

سے نکل کر تنِ تنہا حضورِ حق میں پہنچ جاتا ہے۔ یہاں یہ بات کھٹکتی ہے کہ درمیان میں بارگاہ نبویؐ کا ذکر کیوں نہیں آیا۔ علامہ نے اس وسیلہ کے بغیر زندہ رود کو بارگاہِ حق میں کیوں پہنچا دیا؟ ایسا لگتا ہے کہ فلکِ مشتری میں جب حلاج کی زبانی مقامِ عبدہٗ کی وضاحت کروا دی تو پھر مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اس کے علاوہ کاخِ سلاطین میں یہ تذکرہ ہے کہ جب سلطان شہیدؒ کو سرورِ کائناتؐ کی حضوری نصیب ہوئی تو ان میں کچھ عرض کرنے کا یارا نہ پایا گیا۔ وہ صرف علامہ کے کچھ شعر گنگنا رہے تھے جن کو سن کر حضورؐ نے پوچھا: "یہ کلام کس کا ہے جس میں زندگی کی ہنگامہ خیزیاں پائی جاتی ہیں۔" اس کا بیان خود شہیدؒ کی زبان سے ہی اچھا لگتا ہے ؎

بودہ ام در حضرت مولائے کُل
آنکہ بے او طے نمی گردد سبل
گرچہ آن جا جرأتِ گفتار نیست
روح را کارے بجز دیدار نیست
سوختم از گرمیٔ اشعارِ تو
بر زبانم رفت از افکارِ تو
گفت ایں بیتے کہ برخواندی زکیست
اندرو ہنگامہ ہائے زندگیست

علامہ کے عاشقِ رسولؐ ہونے کا کسے انکار ہے۔ عاشق کے لئے وصال سے زیادہ ہجر مقدم ہوتا ہے۔ تاکہ اس کا شعلۂ عشق سرد نہ پڑ جائے اس سے بڑا نقصان اور کیا ہوگا۔ بارگاہِ رسولؐ میں آپ کے کلام کی رسائی ہی ایک عظیم سعادت تھی۔ اس کی پذیرائی بھی ہوئی۔ چنانچہ بہ تقاضائے

لحاظ و ادب خاموشی کے ساتھ زندہ رود کو آگے بڑھا دیا۔ وصال اندر فراق کی یہ اَن کہی کیفیت بیان سے باہر ہے ؏

باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

بارگاہِ حق میں علامہ اقبالؔ نے یہاں بھی ایک تمہید باندھتے ہوئے علم کو کج فطرت اور دیدارِ حق کی راہ میں حجابِ اکبر کہا ہے۔ یہی علم دنیائے رنگ و بو کے ایک جز کو دکھا کر اس کی حقیقت کی ٹوہ میں لگا دیتا ہے۔ اور منزلِ عشق تک رہبری کرنے کے بعد جبریلِ امینؑ کی طرح عاشق کو تنہا سفر کے لئے آگے بڑھا کر خود پیچھے رہ جاتا ہے۔ رومیؒ نے بھی یہی کیا۔ اکیلا زندہ رود دریائے نور میں اپنی کشتی کھیتے ہوئے آگے چلا اور چلتے ہوئے خود کو غرقِ جمالِ لایزال پایا۔ گوناگوں کیفیات اور نو بنو تجلیات سے دوچار ہوا۔ گویا ایک آئینہ سامنے آویزاں تھا۔ ماضی و مستقبل سب حال میں بدل گئے اور خود خالق، مخلوق کی آنکھوں سے اپنے جمال کا مشاہدہ کرنے لگا ؎

حق ہویدا با ہمہ اسرارِ خویش
با نگاہِ من کند دیدارِ خویش

عبد و معبود دونوں ایک دوسرے کے جمال کے مشتاق تھے۔ ایک عجیب عالم تھا کون کس کا شکار تھا معلوم کرنا دشوار ہو گیا۔ زندہ رود نے عشق کا شکریہ ادا کیا کہ ذوقِ دیدار اور طاقتِ گفتار اسی کا فیض تھا۔ اسی کی بدولت ایک جرأتِ رندانہ ملی۔ چنانچہ شاکی بندہ گستاخی کا احساس کھو کر بول اٹھا: "یہ تیری دنیا خود تیرے دامن پر ایک دھبہ ہے۔ افسوس کہ یہ تیری شایانِ شان نہیں۔ یہاں جو بھی غالب ہے عیش و عشرت میں مشغول ہے۔ کمزور بندے مصیبتوں میں گن گن کر دن کاٹ رہے ہیں۔ فرنگی تہذیب کے بت کدے

مضبوط خیبر کے قلعے بن گئے۔ اس لیے کہ انہیں اکھاڑ پھینکنے والا کوئی حیدرؓ باقی نہ رہا۔ حکمرانوں، ملاؤں، علماء اور پیروں نے موت کا روپ دھار لیا ہے۔ لہٰذا یہ تیری دنیا کسی کے بسنے بسانے کے قابل نہیں رہی۔"

خداوندِ تعالیٰ خالقِ کُل، قادرِ مطلق ہے۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد اس کی شان ہے۔ زندہ رود کے اس شکوۂ بے جا کے جواب میں ایک آواز آئی: "ہم مختار ہیں۔ بُرا یا بھلا، جس کو جیسا چاہا بنا دیا، تجھ کو چاہیے کہ ہماری طرح اپنی دنیا آپ پیدا کرے۔ تجھ میں صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ یہ دنیا فانی بھی ہے اور باقی بھی۔ سب اپنے ذوقِ جمال اور قوتِ تخلیق کی بات ہے۔ تُو جیسے چاہے توڑ سکتا ہے، بنا سکتا ہے۔ ہماری بھی یہی خواہش ہے کہ تُو اپنی قوتِ تخلیق کے کرشمے بروئے کار لائے۔ کیوں کہ ہماری نظر میں وہ کافر و زندیق ہے جو اپنی قوتِ تخلیق کو کام میں نہ لائے۔ وہ ہمارے جمال سے بے بہرہ رہا اور زندگی کا کوئی ثبوت نہ دیا۔" دوسرے الفاظ میں اگر فرد اپنی قوتِ تخلیق کو امکانی حد تک بروئے کار لائے تو اس دنیا کو ایک خوب صورت کاشانہ بنا سکتا ہے۔ امن و سکون اور راحت کا گہوارہ بنا سکتا ہے۔ اپنے ذوقِ جمال کی تسکین حاصل کر سکتا ہے۔ قبل ازیں فلکِ مشتری میں بھی دیدارِ حق کی وضاحت آئی ہے کہ اگر بندہ صبغت اللہ سے خود کو آراستہ کر کے وہی رنگ کائنات پر چڑھائے اور اس کا دیدار کرے تو وہ دیدارِ عام کے مترادف ہوگا۔

اس مکالمے میں زندہ رود نے دوسرا سوال یوں کیا: "عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جو پانی نہر سے بہہ جائے وہ پھر لوٹ کر نہیں آتا۔ کیا یہ بات اقوام کی نسبت سے بھی ٹھیک ہوگی کہ، کوئی قوم ایک مرتبہ اگر اپنا منصب اور اقتدار گنوا دے تو دوبارہ اس مقام کو نہیں پہنچ سکتی؟ افراد تو موت کی منزل

سے گزر کر حشر کے لئے دوبارہ زندہ کئے جاتے ہیں۔ جواب میں ندائے جمال آئی :
"زندگی کی نسبت "حیّ وقیوم" سے ہے اس لئے قربتِ حق اسے پائندگی عطا کرتی ہے۔ ملّتیں افراد کا مجموعہ ہیں۔ جو قوم اپنا مقام و مرتبہ کھو چکی ہو، اگر اس کے افراد توحید کو اپنا لیں اور یک نگاہی پیدا کر لیں تو وہ قوم بھی دوبارہ اپنا کھویا ہوا مقام پا سکتی ہے۔"

زندہ رود نے تیسرا سوال پوچھا: "مَیں کون ہوں اور تُو کون، اور یہ عالم کیا چیز ہے؟ ہمارے درمیان اتنی دوری کیوں ہے؟ تُو نہیں مرتا ہم کیوں مرتے ہیں؟" آواز آئی: "تُو پابند جہات ہے اور ہر کوئی جو جہات کی قید میں ہو اس کے لئے موت مقدر ہے۔ اگر حیاتِ جاوید چاہیئے تو خود جہات کو اپنے اندر جذب کرلے، پھر اپنی خودی پر نظر ڈال، معلوم ہو جائے گا کہ مَیں کون ہوں اور تُو کون ہے۔"

زندہ رود کا آخری سوال تھا: "مجھے بخش اگر پوچھوں کہ آج روس اور جرمنی میں جو انقلاب برپا ہے، اقوامِ مشرق مضطرب اور منتظرِ فردا ہیں۔ بتلا آخر ان کا انجام کیا ہوگا؟"

چوں کہ تقدیرِ خداوندی ایک سربستہ راز ہے، اس کا پردہ الٹنے کا مطالبہ کرنا ایک ناقابلِ معاف خطا ہے، اس لئے جلالِ خداوندی کی ایک تجلّی ہوئی، اور زندہ رود موسیٰؑ کی طرح مستِ جلوہ ہو کر زمین پر آرہا، اور ضمیرِ کائنات سے ایک نغمہ بلند ہوا جس کا خلاصہ درجِ ذیل ہے:

"مشرق و مغرب کی جھنجھٹ میں کیوں پڑا ہے۔ تُو اپنی خودی کو، جو ایک انمول شے ہے، ظالموں کی نذر کر کے خود خالی کیوں ہو گیا؟ تُو اپنی قوم کا ایک فرد ہے۔ ضروری ہے کہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور قوم کی فلاح کے لئے آمادہ ہو جائے۔ خود غرض شاہوں کا دور ختم ہو گیا۔

اب تُو کم حوصلہ بن کر جو بھی ہاتھ لگے اسے اپنا مال نہ سمجھ۔ اپنی ضرورت کی حد تک اپنا حصہ لے اور باقی دوسروں کا حق سمجھ کر اپنے ہاتھ اٹھالے۔"

اس مقام پر جاوید نامہ مکمل ہو گیا۔ آگے کے باب میں اس تصنیف کے اصل مقصد کو بیان کیا گیا ہے۔

جاوید سے خطاب

یہ کتاب کا آخری باب ہے۔ اس میں جاوید نامہ کی تصنیف کا اصل مقصد بیان کیا گیا ہے، جو در اصل نسل بعد نسل نوجوانانِ قوم کی صحیح رہنمائی ہے۔ اس میں نوجوانوں کے جسمانی، اخلاقی اور روحانی تینوں پہلوؤں کی اصلاح پر پوری توجہ مرکوز کی گئی ہے، تاکہ قوم کی تشکیل و تعمیر کے لئے موزوں اور مضبوط افراد فراہم ہو سکیں۔

یہ بات پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ علامہ اقبال کا فارسی کلام ایک طے شدہ منصوبے کے تحت تخلیق کیا گیا ہے۔ اس کا ثبوت ڈاکٹر نکلسن کے نام خود علامہ اقبال کا دوسرا مراسلہ ہے، جس میں انہوں نے "اسرارِ خودی" کے انگریزی ترجمہ The Secrets of Self کی انگریزی دانوں میں عام پذیرائی پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ صراحت کے ساتھ اپنی مثنویوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی تصنیف سے اسلام کی وکالت مقصود نہیں بلکہ دنیا کے سامنے ایک عالم گیر نصب العین پیش کرنا ہے، جس کے تحت ایک مثالی معاشرے کی تشکیل ہو، جس میں نہ ذات پات کے امتیاز کی گنجائش ہو نہ دولت، مرتبہ اور نسل و رنگ کی۔ (شرح اسرارِ خودی۔ سلیم چشتی)۔ اس قسم کے معاشرے کا ایک دھندلا سا خاکہ فلکِ مریخ میں شہرِ مرغدین کی سیر کے دوران میں پیش کیا گیا ہے۔

جاوید نامہ کی ابتدا میں تکمیلِ خودی کی جانچ کا ذکر آیا ہے جس

کی سند تین گواہوں کی شہادت پر مبنی ہے۔ جو شخصیت اپنے وجود پر تینوں گواہوں کی شہادت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ نیابتِ حق کی مستحق ہو جاتی ہے۔ وہی انسانِ کامل کہلائے گی۔ اور اسی سے حکومتِ الٰہیہ کا قیام ممکن ہے۔ علامہ اقبالؔ نے "اسرارِ خودی" میں اسی ہستی کو "سوارِ اشہبِ دوراں" کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ (در شرحِ اسرارِ اسمائے علیؓ)۔

نائبِ حق کے ظہور کی پہلی شرط یہ قرار دی ہے کہ "انسانیت جسمانی اور دماغی دونوں پہلوؤں سے ارتقائی منازل طے کرلے" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "انسانیت کا ارتقاء ایک مثالی قوم کے ظہور کی خبر ضرور دے رہا ہے۔" (شرح اسرارِ خودی)۔ چوں کہ معاشرے کی بنا افراد کی اجتماعیت پر مبنی ہوتی ہے اس لئے علامہ اقبالؔ نے مثالی معاشرے کی تشکیل کے لئے مطلوبہ موزوں افراد کی تربیت کے لئے اس باب میں ایک بہترین پند نامہ مرتب کیا ہے۔

مسلم معاشرے میں ہر نومولود کو آغوشِ مادر میں ہی توحید سے آشنا کر دیا جاتا ہے اور اسی نہج پر اس کی تربیت جاری رہتی ہے۔ لیکن توحید کے مفہوم کی گہرائی تک رسائی کے لئے پدرِ مشفق کی دور رس نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کتاب میں علامہ اقبالؔ نے اپنے زمانے کے حالات کا ذکر فرمایا ہے۔ انہیں اس بات پر افسوس ہے کہ عام طور سے مسلمان تعلیماتِ قرآنی اور دین سے غافل ہو چکے ہیں۔ ان کی عقل بے باک اور دل سنگینی کے شکار ہیں۔ فرنگی تہذیب اور تقلید میں منہمک ہو گئے ہیں اور ان کا علم انسانیت سے عاری ہے۔ شرم وحیا کا پاس کھو چکے ہیں، مادیت کا جنون سر پر سوار ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورۂ بالا خرابیوں کو معاشرے سے دور کرنے کے لئے ایک تو جسمانی و اخلاقی اور دوسرا روحانی علاج تجویز فرمایا ہے۔ جسمانی و اخلاقی علاج کے باب میں اکلِ حلال، صدقِ مقال، کم کھانے، کم سونے اور کم بولنے کو ضروری قرار دیا ہے۔

کافر و مومن سب کو دودۂ آدم ہونے کی بنا پر بدگوئی پر روک لگائی ہے۔ محبت اور رواداری کو ضروری قرار دیا ہے۔ ستر زن و مرد کی اصلیت سے آشنا کرایا ہے۔ غم کو نصف پیری اور حرص کو فقرِ حاضر کا نام دیا ہے اور کہا ہے کہ ؎

آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

روحانی علاج کے سلسلہ میں درویشانہ زندگی اور بزرگوں کی صحبت اختیار کر کے ان کے اقوال و افعال سے استفادہ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ایسی صحبت میسر نہ ہونے کی صورت میں، خود علامہ نے اپنے بزرگوں سے جو فیض حاصل کیا ہے اسی پر عمل کر کے عشقِ الٰہی سے بہرہ ور ہونے کو کہا ہے۔ فرمایا کہ اس کے نتیجہ میں دین کی فہم حاصل ہوگی اور وہ ان کے لئے دعاگو رہیں گے ؎

سرِّ دین مصطفیٰؐ گویم ترا
ہم بہ قبر اندر دعاگویم ترا

غرض جاوید نامہ علامہ اقبال کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے، جس میں آپ نے اپنے افکار و تجربات کی بنا پر ایک صحت مند مثالی معاشرے کی تشکیل کے لئے گرانقدر معلومات فراہم کئے ہیں۔

سیّد احمد ایثار

نمبر 967، شیر خان اسٹریٹ
نگرتھ پیٹ، بنگلور ۵۶۰۰۰۲
فون: 2217815

حضرت علامہ اقبال کی مشہور زمانہ تصنیف

جاوید نامہ

کا مکمل اور منظوم اردو ترجمہ مع متن

از

سید احمد ایثار

دیباچہ

خیالِ من بتماشائے آسماں بوداست
بدوشِ ماہ و بآغوشِ کہکشاں بوداست
گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست
کہ ہر ستارہ جہانِ ست یلیہاں بوداست!

اقبالؔ

ابتدا

خیال سیرِ سمٰوات میں ہے محو ابھی
سوارِ ماہ کبھی ہے تو کہکشاں میں کبھی
نہ کر گماں کہ یہی خاکداں ہے اپنا جہاں
ہے ہر ستارہ جہاں، یا کبھی جہاں تھے سبھی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مناجات

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ — ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ!
آرزوئے ہم نفس می سوزدش — نالہ ہائے دل نواز آموزدش
لیکن ایں عالم کہ از آب و گل است — کے تواں گفتن کہ دارائے دل است!
بحر و دشت و کوہ و کہ خاموش و کر — آسمان و مہر و مہ خاموش و کر!
گرچہ بر گردوں ہجومِ اختر است — ہر یکے از دیگرے تنہا تر است!
ہر یکے مانندِ ما بیچارہ ایست — در فضائے نیلگوں آوارہ ایست!
کارواں بر گِ سفر ناکردہ ساز! — بیکراں افلاک و شب ہا دیر باز!
ایں جہاں صید است و صیّادیم ما؟ — یا اسیرِ رفتہ از یادیم ما؟

زار نالیدم صدائے برنخواست
ہم نفس فرزندِ آدم را کجاست؟

دیدہ ام روزِ جہانِ چار سوے — آنکہ نورش بر فروزد کاخ و کوے
از رمِ سیارۂ او را وجود — نیست الّا اینکہ گوئی رفت و بود

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مناجات

ہفت رنگ عالم میں انساں ہر زماں
چنگ کے مانند ہے گرم فغاں

شوق ہم دم کا جلاتا ہے اُسے
دل نواز آہیں سکھاتا ہے اُسے

باوجود اس کے جہانِ آب و گل
کہہ نہیں سکتے کہ ہے دارائے دل

دشت و دریا، کوہ و کہ بہرے خموش
آسمان و مہر و مہ بہرے خموش

یوں تو تارے ہیں فلک پر بے شمار
سب اکیلے دور دور ان کے مدار

ہر کوئی اپنی طرح بیچارہ ہے
وسعتِ افلاک میں آوارہ ہے

کارواں گرمِ سفر بے برگ و ساز
بیکراں افلاک اور راتیں دراز

یہ جہاں ہے صید اور صیاد ہم
یا بھلا بیٹھے ہیں سب روداد ہم

دی صدائیں کوئی بھی بولا نہ ہاں
ہم نفس فرزندِ آدم کا کہاں

روز روشن میں نے دیکھے چار سو
جن سے روشن ہیں جہاں کے کاخ و کو

حرکتِ سیارہ سے ان کا وجود
یعنی ان کی کل حقیقت رفت و بود

اے خوش آں روزے کہ از ایام نیست — صبح او را نیم روز و شام نیست
روشن از نورش اگر گردد رواں — صوت را چوں رنگ دیدن می تواں
غیبہا از تابِ او گردد حضور — نوبتِ او لایزال و بے مرور!

اے خدا روزی کُن آں روزے مرا
وارہاں زیں روزِ بے سوزے مرا

آیۂ تسخیر اندر شانِ کیست؟ — ایں سپہرِ نیلگوں حیرانِ کیست؟
رازدانِ علّم الاسما کہ بُود؟ — مستِ آں ساقی و آں صہبا کہ بُود؟
برگزیدی از ہمہ عالم کرا؟ — کردی از رازِ درون محرم کرا؟
اے ترا تیرے کہ مارا سینہ سفت — حرفِ "اُدعُونِی" کہ گفت و با کہ گفت؟
روئے تو ایمانِ من قرآنِ من — جلوہ داری دریغ از جانِ من؟

از زیانِ صد شعاعِ آفتاب
کم نمی گردد متاعِ آفتاب

عصرِ حاضر را خرد زنجیرِ پاست — جانِ بے تابے کہ من دارم کجاست؟
عمرہا بر خویش می پیچد وجود — تا یکے بے تاب جاں آید فرود
گر نرنجی ایں زمینِ شورہ زار — نیست تخمِ آرزو را سازگار
از درونِ ایں گلِ بے حاصلے — بس غنیمت داں اگر روید دلے!
تو مہی اندر شبستانم گزر — یک زماں بے نوریِ جانم نگر

شعلہ را پرہیز از خاشاک چیست

خوب وہ دن جو نہیں ایام سے جو نہیں وابستہ صبح و شام سے
نور سے اس کے جو روشن ہو گی جاں رنگ بن کر ہوں گی آوازیں عیاں
غیب اس کے نور سے ہوں گے حضور وقت اس کا لایزال و بے مرور
اے خدا کر مجھ کو ویسا دن عطا
اس زمانِ سرد خوں سے کر رہا

آیۂ تسخیر ہے کس سے خطاب آسماں ہے کس سے حیران و خراب
رازدانِ علّم الاسمٰا ہے کون؟ اس مے و ساقی کا متوالا ہے کون؟
کون بھایا سارے عالم میں تجھے؟ راز اپنے تُو نے بتلائے کسے؟
اے! وہ تیرا تیرِ دل کے پار تھا تُو نے "اُدعُونِی" بتا کس کو کہا؟
تیرا رخ ایماں مرا، قرآں مرا جلوہ اس جاں سے ہے کیوں پنہاں ترا؟
فوت ہوں گی سو شعاعِ آفتاب
پر نہ ہو گی کم متاعِ آفتاب

عقل ہے اس دَور کی زنجیر پا ہے کوئی بے چین مجھ سا دوسرا؟
رہتا ہے بے چین صدیوں تک وجود تا کہ اک بے تاب جاں کی ہو نمود
بخش! اگر میں یہ کہوں بنجر زمیں بہرِ تخمِ آرزو شایاں نہیں
کچھ بھی پیدا کر نہیں سکتی یہ گِل ہے غنیمت مل سکے گر ایک دل
چاند تُو میرے شبستاں سے گذر میری بے نوری کا بھی نظارہ کر
آگ کو خاشاک سے کیسا حذر؟

برق را از برفتادن باک چیست

زیستم تا زیستم اندر فراق — وانما آنسوے ایں نیلی رواق!
بستہ درہا را بروئیم باز کن — خاک را با قدسیاں ہمراز کن!
آتشے در سینۂ من برفروز — عود را بگذار و ہیزم را بسوز
باز بر آتش بنہ عودِ مرا — در جہاں آشفتہ کن دودِ مرا
آتشِ پیمانۂ من تیز کن — با تغافل یک نگہ آمیز کن
ما ترا جوئیم و تو از دیدہ دور — نے غلط، ما کور و تو اندر حضور!
یا کشا ایں پردۂ اسرار را — یا بگیر ایں جانِ بے دیدار را
تخلِ فکرم نا امید از برگ و بر — یا تبر بفرست یا باد سحر
عقل دادی ہم جنونے دہ مرا — رہ بجذب اندرونے دہ مرا
علم در اندیشہ می گیرد مقام — عشق را کاشانہ قلب لاینام
علم تا از عشق برخوردار نیست — جز تماشا خانۂ افکار نیست
ایں تماشا خانہ سحر سامری است — علم بے روح القدس افسونگری است
بے تجلّی مردِ دانا رہ نبرد — از لگد کوبِ خیالِ خویش مُرد
بے تجلّی زندگی رنجوری است — عقل مہجوری و دیں مجبوری است
ایں جہانِ کوہ و دشت و بحر و بر! — ما نظر، خواہیم و او گوید خبر
منزلے بخش ایں دلِ آوارہ را — باز دہ با ماہ ایں ماہ پارہ را
گرچہ از خاکم نروید جز کلام — حرفِ مہجوری نمی گردد تمام!

برق کو گرنے سے کیوں لگتا ہے ڈر؟

عمر بھر سہتا رہا دردِ فراق
بس اٹھا دے پردۂ نیلی رواق

کھول دے میرے لئے سب بستہ در
قدسیوں کا مجھ کو تو ہمراز کر

میرے دل کی آگ کو دے اشتعال
عود کو چھوڑ، آگ میں ایندھن کو ڈال

ڈال پھر آتش میں میرے عود کو
اس کی بُو سے کر معطر چار سُو

میری صہبا کو بنا دے تیز تر
گھول کر اس میں تغافل کی نظر

ہم ترے دیوانے تو نظروں سے دور
نے غلط، ہم کور تو اندر حضور

چاک کر دے پردۂ اسرار کو
یا تو لے لے جانِ بے دیدار کو

فکر میری نا امیدِ برگ و بر
قطع کر یا بھیج دے بادِ سحر

عقل دی ہے دے جنوں بھی اک ذرا
جذبِ دل سے بھی مجھے کر آشنا

علم اندیشوں میں بستا ہے مدام
ہے دل بیدار الفت کا مقام

علم جب تک عشق سے بیگانہ ہے
فکرِ انساں کا تماشا خانہ ہے

یہ تماشا گہ ہے سحرِ سامری
علمِ بے جبریلؑ ہے افسوں گری

بے تجلی راہ دانا بھی نہ پائے
ضربتِ افکارِ خود میں جاں گنوائے

بے تجلی زندگی دردِ دوام
عقل دوری، دین مجبوری تمام

یہ جہانِ کوہ و دشت و بحر و بر
چاہیئے ہم کو نظر، دے گا خبر

اک ٹھکانہ دے دلِ آوارہ کو
پھر ملا دے ماہ سے مہ پارہ کو

مجھ سے کچھ بنتا نہیں غیر از کلام
ہجر کا قصہ نہیں ہوتا تمام

زیرِ گردوں خویش را یابم غریب — ز آنسوے گردوں بگو اِنِّی قَرِیب
تا مثالِ مہر و ماہ گردد غروب — ایں جہات و ایں شمال و ایں جنوب
از طلسمِ دوش و فردا بگذرم
از مہ و مہر و ثریا بگذرم!

تو فروغِ جاوداں ما چوں شرار — یک دو دم داریم و آں ہم مستعار!
اے تو نشناسی نزاعِ مرگ و زیست — رشکِ یزداں برد ایں بندہ کیست؟
بندۂ آفاق گیر و ناصبور — نے غیاب او را خوش آید نے حضور
آنِ نیم من جاودانی کن مرا — از زمینی آسمانی کن مرا
ضبط در گفتار و کردارے بدہ — جادہ ہا پیداست رفتارے بدہ
آنچہ گفتم از جہانے دیگر است — ایں کتاب از آسمانے دیگر است
بحرم دار از من کم آشوبی خطاست — آں کہ در قعرم فرو آید کجاست؟
یک جہاں بر ساحلِ من آرمید — از کراں غیر از رمِ موجے ندید
من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن — دارم از روزے کہ می آید سخن!
بر جواناں سہل کُن حرفِ مرا
بہر شاں پایاب کن ژرفِ مرا

خود کو مَیں دنیا میں پاتا ہوں غریب — از ورائے چرخ کہہ اِنِّی قَرِیب
چاند سورج کی طرح تاہوں غروب — یہ جہات و یہ شمال و یہ جنوب
تا طلسم دوش و فردا توڑ دوں
بڑھ کے مہر و ماہ و پروین سے چلوں

تو سدا کی روشنی ہم جوں شرار — یک دو دم حاصل ہیں وہ بھی مستعار
واسطہ کیا تجھ کو مرگ و زیست سے — بندہ کیا جو رشک یزداں پر کرے
بندہ یہ آفاق گیر و نا صبور — غیب اسے موزوں، نہ راس آئے حضور
مَیں ہوں آنی، جاودانی کر مجھے — ہوں زمینی، آسمانی کر مجھے
ضبطِ قول و قوت کردار دے — راستے ہیں لذتِ رفتار دے
عالم دیگر سے ہے میرا بیاں — اس نوشتہ کا ہے دیگر آسماں
بحر ہوں طوفاں سے دوری ہے خطا — کیا کوئی میرے عمق کو پائے گا؟
کرتے ہیں ساحل سے نظارا مرا — کیا دکھے گا میری موجوں کے سوا!
مجھ کو ہے امید پیروں سے نہ کام — آنے والوں کیلئے ہے یہ کلام
اب جوانوں پر تُو فتح باب کر
اُن پہ گہرائی مری پایاب کر

تمہید آسمانی
نخستیں روزِ آفرینش
نکوہش می کند آسماں زمیں را

زندگی از لذّتِ غیب و حضور
بست نقشِ ایں جہانِ نزد و دُور

آں چناں تارِ نفس از ہم گسیخت
رنگِ حیرت خانۂ ایّام ریخت

ہر کجا از ذوق و شوقِ خود گری
نعرۂ من دیگرم تو دیگری

ماہ و اختر را خرام آموختند
صد چراغ اندر فضا افروختند!

بر سپہرِ نیلگوں زد آفتاب
خیمۂ زر بفت با سیمیں طناب

از افقِ صبحِ نخستیں سر کشید
عالمِ نوزادہ را در بر کشید

ملکِ آدم خاکدانے بود و بس
دشتِ او بے کاروانے بود و بس

نے بکوہے آبجوئے در ستیز
نے بصحرائے سحابے ریز ریز

نے سرودِ طائراں در شاخسار
نے رمِ آہو میانِ مرغزار

بے تجلی ہائے جاں بحر و برش
دُودِ پیچاں طیلسانِ پیکرش

سبزہ بادِ فرودیں نا دیدۂ
اندر اعماقِ زمیں خوابیدۂ

طعنۂ زد چرخِ نیلی بر زمیں
"روزگارِ کس ندیدم ایں چنیں

تمہید آسمانی
تخلیق کا پہلا دن
آسمان زمین پر طعنے کستا ہے

بھائی حق کو لذتِ غیب و حضور — لایا ہستی میں جہانِ نزد و دُور
اَن گنت پاروں میں یوں ہستی بٹی — پڑ گئی بنیاد حیرت خانہ کی
ہر کوئی بد مست پندارِ خودی — ہر کہیں 'من دیگرم تو دیگری'
ماہ و اختر کو ملا ذوقِ خرام — روشنی ہی روشنی عالم تمام
چرخِ نیلی پر تھا روشن آفتاب — خیمہ تھا کمخواب کا سیمیں طناب
آشکارا صبحِ اوّل ہو گئی — پرورش کی عالمِ نو زادہ کی
حق میں انسانوں کے آیا خاکداں — دشت و در تھے بے نصیب کارواں
کوہسار اس میں تھے بے جوئے رواں — کچھ نہ تھا صحرا میں بارش کا نشاں
جھاڑیاں تھیں مرغِ نغمہ خواں نہ تھے — آہو سبزہ زار میں رقصاں نہ تھے
اس کے بحر و بر میں بھی مفقود جاں — تھا زمیں کے تن پہ بَل پر بَل دھواں
سبزہ سطحِ خاک پر پیدا نہ تھا — خاک کی گہرائیوں میں خفتہ تھا
تھا زمیں پر طعنہ زن چرخِ فلک — ایسی اک ہستی نہ دیکھی آج تک

چوں تو در پہنائے من کور سے کجا — جز بقندیلم ترا نور سے کجا
خاک اگر الوند شد جز خاک نیست — روشن و پائندہ چوں افلاک نیست
یا بزی با ساز و برگِ دلبری — یا بمیر از ننگ و عارِ کمتری"
شد زمیں از طعنۂ گردوں خجل — ناامید و دل گران و مضمحل

پیشِ حق از دردِ بے نوری تپید
تا ندائے زآنسوئے گردوں رسید

"اے امینے از امانت بے خبر — غم مخور، اندر ضمیرِ خود نگر
روزہا روشن زغوغائے حیات — نے ازاں نورے کہ بینی در جہات
نورِ صبح از آفتابِ داغدار — نورِ جاں پاک از غبارِ روزگار
نورِ جاں بے جادہ ہا اندر سفر — از شعاعِ مہر و مہ سیّارتر
شستۂ از لوحِ جاں نقشِ امید؟ — نورِ جاں از خاکِ تو آید پدید!
عقلِ آدم بر جہاں بشخون زند — عشقِ او بر لامکاں بشخون زند!
راہ داں اندیشۂ او بے دلیل — چشمِ او بیدارِ تر از جبرئیل!
خاک و در پرواز مانندِ ملک — یک رباطِ کہنہ در راہش فلک!
می خلد اندر وجودِ آسماں — مثلِ نوکِ سوزنِ اندر پرنیاں!
داغہا شوید ز دامانِ وجود — بے نگاہِ او جہاں کور و کبود!
گرچہ کم تسبیح و خونریز است او — روزگاراں را چو تہمیز است او
چشمِ او روشن شود از کائنات — تا بہ بیند ذات را اندر صفات

کور تُو، تجھ سی نہیں ہستی کوئی — میری قندیلوں سے تیری روشنی
خاک اگر آلودہ بھی ہو خاک ہی — روشنی اس میں نہ یہ پائندگی
یا تو جی بارنگِ دشانِ دلبری — یا کہیں جامہ بہ ننگِ کمتری"
تھی زمیں گردوں کے طعنوں سے خجل — "نا امید و دل گراں و مضمحل"

پیشِ حق دکھڑا بیاں اس نے کیا
چرخ کے اُس پار سے آئی صدا

تُو امانت سے ہے اپنی بے خبر! — غم نہ کھا ڈال اپنے باطن پر نظر
دیکھ خود میں نورِ غوغائے حیات — وہ نہیں ہے روشنیٔ شش جہات
صبحِ نو آفتابِ داغدار — نورِ جاں ہے بے غبارِ روزگار
ہے بلا راہوں کے نورِ جاں رواں — تیز تر کرنوں سے ہے رفتارِ جاں
دھو نہ امیدوں سے اپنی لوحِ جاں — خود تجھی سے ہوگا نورِ جاں عیاں
مارے شب خوں عقلِ آدم دہر پر — لامکاں پر عشق جھپٹے گا ادھر
ڈھونڈلے گا راستے وہ بے دلیل — اس کی روشن آنکھ رشکِ جبرئیلؑ
خاک وہ، پرواز مانندِ ملک — ایک ٹھکانا راہ میں اس کی فلک
پُرخلش اس سے رہے گا آسماں — نوکِ سوزن جیسے مخمل میں نہاں
دھوئے گا وہ داغِ دامانِ وجود — اور جہاں اس کے بنا کور و کبود
ہے عبادت میں کم اور خوں ریز وہ — ہر زمانے کے لئے مہمیز وہ
دے گی بینائی اسے خود کائنات — ذات کو پالے گا وہ اندر صفات

ہر کہ عاشق شد جمالِ ذات را
اوست سیّد جملہ موجودات را

(رومی)

نغمۂ ملایک

فروغ مشتِ خاک از نورِیاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیر او گردوں شود روزے
خیالِ او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد
ز گردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے!
یکے در معنیٔ آدم نگر! از ما چہ می پرسی
ہنوز اندر طبیعت می جلد موزوں شود روزے!
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پُر خوں شود روزے!

جو بھی عاشق ہے جمالِ ذات کا
وہ ہے سیّد جملہ موجودات کا
(رومی)

نغمۂ ملایک

چمک مٹی کے پُتلے کی فرشتوں سے سوا ہوگی
یہ قسمت کا ستارہ ہے زمیں عرش آشنا ہوگی
یہ اپنی فکرمندی جس کو طوفانوں نے پالا ہے
کسی دن حلقۂ گردابِ گردوں سے رہا ہوگی
ہے مستی بشر کیا دیکھ خود، یوں پوچھتا کیا ہے
سنورنا ہے ابھی، تکمیل پر یہ کیا سے کیا ہوگی
ہے اک فرسودہ شئے اب ڈھل کے ہو جائیگی جب موزوں
کشش پیدا کرے گی وہ کہ محبوبِ خدا ہوگی

تمہیدِ زمینی

آشکارا می شود روحِ حضرتِ رومی و شرح می دہد اسرارِ معراج را

عشقِ شور انگیز بے پروائے شہر
شعلۂ او میرد از غوغائے شہر

خلوتے جوید بدشت و کوہسار
یا لبِ دریائے ناپیدا کنار

من کہ دریا راں ندیدم محرمے
بر لبِ دریا بیا سودم دمے

بحر و ہنگامِ غروبِ آفتاب
نیلگوں آب از شفق لعلِ مذاب

کور را ذوقِ نظر بخشد غروب
شام را رنگِ سحر بخشد غروب!

با دلِ خود گفتگوہا داشتم
آرزوہا جستجوہا داشتم

آنی و از جاودانی بے نصیب!
زندہ و از زندگانی بے نصیب!

تشنہ و دُور از کنارِ چشمہ سار
می سرودم ایں غزل بے اختیار

تمہیدِ زمینی

مرشدِ رومی کی روح آشکار ہو کر اسرارِ معراج کی شرح فرماتی ہے

عشقِ پُرشورش کو کیا پروائے شہر
سرد اسے کر دیتا ہے غوغائے شہر

بہرِ خلوت چاہیے دشت و کوہسار
"یا لبِ دریائے ناپیدا کنار"

مَیں کہ یاروں میں نہ تھا کوئی مرا
تھا لبِ دریا جو میں لیٹا ہوا

بحر اور وقتِ غروبِ آفتاب
تھا شفق سے آب جوں لعلِ مذاب

کور کو ذوقِ نظر بخشے غروب
شام کو رنگِ سحر بخشے غروب

دل ہی دل میں ہو رہی تھی گفتگو
ہر گھڑی اک آرزو اک جستجو

آنی اور پائندگی سے بے نصیب
زندہ لیکن زندگی سے بے نصیب

دور پانی سے مثالِ تشنہ سار
گا رہا تھا یہ غزل بے اختیار

غزل

"بکشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزوست — بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست
یک دست جامِ بادہ و یک دست زلفِ یار — رقصِ چنیں میانۂ میدانم آرزوست
گفتی ز ناز بیش مرنجاں مرا، برو — آں گفتنت کہ بیش مرنجانم آرزوست
اے عقل تو ز شوق پراگندہ گوئے شو — اے عشق نکتہ ہائے پریشانم آرزوست
ایں آب و نانِ چرخ چو سیل است بے وفا — من ماہیم نہنگم و عمانم آرزوست
جانم ملول گشت ز فرعون و ظلمِ او — آں نورِ جیبِ موسیِ عمرانم آرزوست
دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست!" (رومی)

موجِ مضطر خفت بر سنجابِ آب — شد افق تار از زیانِ آفتاب
از متاعش پارۂ دزدید شام — کوکبے چوں شاہدے بالائے بام!
روحِ رومی پردہ ہا را بر درید — از پسِ کہ پارۂ آمد پدید!
طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب — شبِ او فرخندہ چوں عہدِ شباب
پیکرے روشن ز نورِ سرمدی — در سراپایش سرورِ سرمدی!

غزل

لب کھول مجھ کو شہد کا سامان چاہیئے
صورت دکھا گل اور گلستان چاہیئے

اک ہاتھ میں ہو جام تو دیگر میں زلفِ یار
میداں میں رقص یوں علی الاعلان چاہیئے

کس ناز سے کہا کہ "نکل اور دکھ نہ دے"
پھر بول یوں ہی مجھ کو یہ فرمان چاہیئے

اے عقل گیند بن کے تو آوارہ گرد رہ
اے عشق کچھ رموز پریشان چاہیئے

یہ رزقِ چرخ سیل ہے کیا اس کا اعتبار
ماہی ہوں میں نہنگ اور عمان چاہیئے

فرعون اور اس کے ستم سے ملول ہوں
وہ نورِ جیبِ موسیٰ عمران چاہیئے

کل شب چراغ لے کے پھرا گردِ شہر شیخ
دکھی ہوں دیو و دد سے دوا اک انسان چاہیئے

یارانِ پا شکستہ مرے دل کا بوجھ ہیں
رستم سا یا علیؓ سا پہلوان چاہیئے

بولا کہ ہم جو ڈھونڈتے ہیں وہ نہ پائیں گے
بولا کہ خون ہو جس کا وہ ارمان چاہیئے

موجِ مضطر گم تھی سطحِ آب پر
ڈوبا سورج دن ہوا تاریک تر

پارۂ نور اک اڑائی تھی جو شام
وہ ستارہ ہو گیا بالائے بام

روحِ رومی پھاڑتی پردے سبھی
اوٹ سے ٹیلے کے ظاہر ہو گئی

روشن ان کا چہرہ مثلِ آفتاب
آہ وہ پیری میں بھی شانِ شباب!

جسم روشن جیسے نورِ سرمدی
سر بہ سر غرقِ سرورِ سرمدی

بر لبِ او سرِّ پنہانِ وجود — بند ہائے حرف و صوت از خود کشود
حرفِ او آئینۂ آویختہ — علم با سوزِ دروں آمیختہ!
گفتمش موجود و ناموجود چیست؟ — معنیٔ محمود و نامحمود چیست؟
گفت "موجود آنکہ می خواہد نمود — آشکارائی تقاضائے وجود
زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجودِ خود شہادت خواستن
انجمن روزِ الست آراستند — بر وجودِ خود شہادت خواستند!
زندہ یا مردہ یا جاں بلب — از سہ شاہد کن شہادت را طلب
شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن — خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے — خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
پیشِ ایں انوار ایمانی استوار — حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار
بر مقامِ خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مردِ مومن در نسازد با صفات — مصطفےٰ راضی نشد الّا بذات
چیست معراج آرزوئے شاہدے — امتحانے روبروئے شاہدے
شاہدِ عادل کہ بے تصدیق او — زندگی ما را چو گل را رنگ و بو
در حضورش کس نماند استوار — در بماند ہست او کامل عیار
ذرّہ از کف مدہ تا بے کہ ہست — پختہ گیر اندر گرہ تا بے کہ ہست
تابِ خود را بر فزودن خوشتر است — پیش خورشید آزمودن خوشتر است

ان کے لب پر سرِّ پنہانِ وجود — تھی بنا بولے معانی کی کشود
تھا مثالِ آئینہ ان کا کلام — دانش و سوزِ دروں کا اک رقوم؟
پوچھا کیا موجود، ناموجود کیا؟ — معنیٔ محمود و نامحمود کیا؟
بولا وہ موجود جو چاہے نمود — خود نمائی ہے تقاضائے وجود
بے خودی سے خود سنورنا زندگی — چاہنا ہونے پہ شاہد بھی کوئی
روزِ پیماں انجمن آرائی کی — اپنے ہونے پر گواہی اس نے لی
زندہ ہے یا مردہ ہے یا جاں بہ لب — ان گواہوں سے گواہی کر طلب
شاہدِ اوّل ہے اپنا ہی شعور — یعنی اپنا امتحاں اپنا ہی نور
شاہدِ ثانی ہے ادراکِ دگر — جانچ اپنی، اور دیگر کی، نظر
تیسرا شاہد شعورِ ذاتِ حق — امتحاں اپنا بہ نورِ ذاتِ حق
ان کے آگے رہ سکے گر استوار — زندہ و پائندہ کر خود کو شمار
اپنا منصب آپ پالینا حیات — دیکھتے رہنا عیاں خود نورِ ذات
مردِ مومن کو نہیں کافی صفات — مصطفیٰؐ تھے طالبِ دیدارِ ذات
کیا ہے معراج اک گواہ کی آرزو — آزمانا خود کو اس کے روبرو
شاہدِ عادل گواہی گر نہ دے — زیست ہے جوں رنگ و بوئے گل کیلئے
اس کے آگے کون ٹھہرے استوار — جو ٹھہر جائے وہی کامل عیار
ذرہ تو، جو روشنی ہے کھو نہ دے! — تو گرہ میں اس کو کس کر باندھ لے
روشنی اپنی بڑھانا خوب ہے — پیشِ خورشید آزمانا خوب ہے

پیکرِ فرسودہ را دیگر تراش امتحانِ خویش کن 'موجود' باش

ایں چنیں 'موجود' 'محمود' است و بس
ورنہ نارِ زندگی دود است و بس"

باز گفتم پیشِ حق رفتن چساں؟ کوہِ خاک و آب را کفتن چساں؟
آمر و خالق بر ولی از امر و خلق ماز شستِ روزگاراں خستہ حلق
گفت "اگر سلطان، ترا آید بدست می تواں افلاک را از ہم شکست
باش تا عریاں شود ایں کائنات شوید از دامانِ خود گردِ جہات
در وجودِ او نہ کم بینی نہ بیش خویش را بینی از و او را ز خویش
نکتہ مرد "اِلّا بسلطاں" یاد گیر ورنہ چوں مور و ملخ در گِل بمیر
از طریقِ زادن اے مردِ نکوے آمدی اندر جہانِ چار سوے
ہم بروں جستن، بزادن می تواں بندہا از خود کشادن می تواں
لیکن ایں زادن نہ از آب و گل است دامنِ آں مردے کہ او صاحبدل است
آں ز مجبوری است ایں از اختیار آں نہاں در پردہ ہا ایں آشکار
آں یکے با گریہ ایں با خندہ ایست یعنی آں جوینده ایں یابندہ ایست
آں سکون و سیر اندر کائنات ایں سراپا سیر بیروں از جہات
آں یکے محتاجِ روز و شب است واں دگر روز و شب او را مرکب است
زادنِ طفل از شکستِ اشکم است زادنِ مرد از شکستِ عالم است
ہر دو زادن را دلیل آمد اذاں آں بلب گویند و ایں از عینِ جاں

شکلِ نو دے پیکرِ فرسودہ کو آزما کر خود کو یوں، موجود ہو
وہ جو مستحکم ہو یوں محمود ہے
ورنہ تارِ زندگی بس دود ہے

پوچھا پھر کیوں جائیں ہم حق کے حضور؟ آب و گل سے ہو سکیں ہم کیسے دور؟
آمر و خالق وہ، امر و خلق ہم گل سے ہستی کی دریدہ حلق ہم
بولا تا سلطاں پہنچ سکتے ہے گر تری چیر کر جائے گا تو افلاک بھی
ٹھہر! تا ہو فاش تجھ پر کائنات دھوئے وہ دامن سے تا گردِ جہات
بیش و کم سے اُس کی ہستی ہی پرے اس میں خود کو دیکھے تو، خود میں اسے
چاہیے "اِلّا بسلطاں" پر نظر ورنہ جا مور و ملخ کی طرح مر
از رہِ تولید اے مردِ نکو آیا ہے اندر جہانِ چار سو
پھر ولادت سے جہاں چھوڑے گا تو! بندشوں کو آپ خود توڑے گا تو!
پر یہ پیدائش نہیں از آب و گل اس سے ہیں آگاہ جو ہیں اہلِ دل
اس میں مجبوری ہے، اس میں اختیار وہ ہے پردوں میں نہاں، یہ آشکار
گریہ ہے اِس وقت، اور اُس دم خوشی وہ سبھی ارمان، حاصل یہ سبھی
وہ سکوں کے ساتھ سیرِ کائنات یہ سراسر سیرِ بیرونِ جہات
رات دن پر اُس کا سارا انحصار روز و شب اُس کی سواری وہ سوار
بچّہ آتا ہے شکم کو پھاڑتا سارا عالم پھاڑ کر مرد آئے گا
یوں تو دونوں وقت ہوتی ہے اذاں پر یہاں لب سے وہاں از عینِ جاں

جانِ بیدارے چو زاید در بدن
لرزہ ہا افتد دریں دیر کہن"

گفتم ایں زادن نمی دانم کہ چیست؟ گفت "شانے از شؤنِ زندگی است

شیوہ ہائے زندگی غیب و حضور آں یکے اندر ثبات آں در مرور

گہ بخلوت می گداز د خویش را گہ بخلوت جمع سازد خویش را

جلوتِ او روشن از نورِ صفات خلوتِ او مستنیر از نورِ ذات

عقل او را سوئے جلوت می کشد عشق او را سوئے خلوت می کشد

عقل ہم خود را بدیں عالم زند تا طلسمِ آب و گل را بشکند

می شود ہر سنگ رہ او را ادیب می شود برق و سحاب او را خطیب

چشمش از ذوق نگہ بیگانہ نیست لیکن او را جراتِ رندانہ نیست!

پس ز ترسِ راہ چوں کورے رود نرم نرمک صورتِ مورے رود

تا خرد پیچیدہ تر بر رنگ و بوست می رود آہستہ اندر راہِ دوست

کارش از تدریج می یابد نظام من نہ دانم کے شود کارش تمام!

می نداند عشق سال و ماہ را دیر و زود و نزد و دورِ راہ را

عقل در کوہے شگافے می کند یا بگرد او طوافے می کند

کوہ پیشِ عشق چوں کاہے بود دل سریع السیر چوں ماہے بود

عشق شبخونے زدن بر لامکاں گور را نادیدہ رفتن از جہاں!

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست قوتش از سختیٔ اعصاب نیست

تن میں ہوتی ہے جہاں بیدار جاں
کانپ اٹھتے ہیں زمین و آسماں

پوچھا اس تولید کے معنی ہیں کیا؟ بولے یہ بھی رنگ ہے اک زیست کا
زندگی کے رنگ ہیں غیب و حضور ایک ثابت اور دگر وقفِ مرور
خود گدازی اس کی جلوت میں کبھی جمع خود سازی کو خلوت میں کبھی
اس کی جلوت میں ہے گر نورِ صفات اس کی خلوت میں ہے فیضِ نورِ ذات
کھینچتی ہے عقل اسے جلوت کی سمت عشق کی دعوت اسے خلوت کی سمت
عقل ہے مشغول عالم آپ سے تا حقیقت آب و گل کی پا سکے
سنگ پارے راہ کے اس کو ادیب اس کے حق میں بجلیاں، بادل خطیب
دید کی لذت سے بیگانہ نہیں اس کی جرأت پھر بھی رندانہ نہیں
ڈر سے رکھتی ہے قدم مانندِ کور سمت وہ رفتار میں مانندِ مور
رنگ و بو میں پھنس رہے گی عقل اگر سوئے جاناں جائے گی آہستہ تر
ہیں بہ تدریج اس کے کاروبار سب میں نہ جانوں پورے ہوں گے کام کب
عشق ہے آزاد سال و ماہ سے دیر و زود و نزد و دورِ راہ سے
ڈالتی ہے عقل، پتھر میں شگاف یا اسی کے گرد کرتی ہے طواف
کوہ آگے عشق کے جوں کاہ ہے تیز رو دل اپنا مثلِ ماہ ہے
لامکاں پر دل لپکتا ہے بزور چھوڑ دیتا ہے جہاں، نادیدہ گور
عشق ہے آزاد خاک و آب سے وہ نہیں ہے زور ور اعصاب سے

عشق بانانِ جویں خیبر کشاد — عشق در امدامِ مہ چاکے نہاد!
کلمۂ نمرود بے ضرب شکست — لشکرِ فرعون بے حربے شکست!
عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر — ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است — کارِ او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برہانِ مبیں — ہر دو عالم عشق را زیرِ نگیں
لا زمان و دوش فردائے ازو — لامکان و زیر و بالائے ازو
چوں خودی را از خدا طالب شود — جملہ عالم مرکب او راکب شود
آشکارا تر مقامِ دل ازو — جذبِ ایں دیرِ کہن باطل ازو
عاشقاں خود را بیزداں می دہند — عقلِ تاویلی بقرباں می دہند
عاشقی؟ از سُو بہ بے سوئی خرام — مرگ را بر خویشتن گرداں حرام
اے مثالِ مردہ در صندوقِ گور — می تواں برخاستن بے بانگِ صور!
در گلو داری نواہا خوب و نغز — چند اندر گل بنالی مثلِ چغز
بر مکان و بر زماں اسوار شو — فارغ از پیچاکِ ایں زنّار شو
تیز تر کن ایں دو چشم و ایں دو گوش — ہر چہ می بینی بنوشش از رہ ہوش
'آں کسے کو بانگِ موراں بشنود — ہم ز دوراں سرِّ دوراں بشنود'
آں نگاہِ پردہ سوز از من بگیر — کونِ چشم اندر نمی گردد اسیر

'آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

کھائے جَو اور ڈھائے وہ خیبر کا در
شق کرے وہ اک اشارے سے قمر

توڑے سر نمرود کا بے ضرب ہی
مارے یوں ہی لشکرِ فرعون بھی

عشق ایسا جیسے آنکھوں میں نظر
گھر کے اندر رہ کے ہے بیرونِ در

عشق چنگاری بھی خاکستر بھی ہے
علم و دیں سے کام میں برتر بھی ہے

عشق سلطاں، عشق برہانِ مبیں
دونوں عالم عشق کے زیرِ نگیں

آج کل اس سے ہیں وہ خود لازماں
تحت و فوق اس سے ہیں وہ بیرونِ مکاں

مانگتا ہے جب خدا سے وہ خودی
سارا عالم مرکب اور راکب وہی

اس سے واضح تر مقامِ دل کا حال
دل سے مٹ جاتا ہے دنیا کا خیال

ہوتے ہیں عاشق سپردِ اللہ کے
عقلِ تاویلی کو قربانی میں دے

گر ہے عاشق تو نہ رکھ جہتوں سے کام
موت کو کر اپنی ہستی پر حرام

اے کہ تو جوں مردہ اندر قعرِ گور
زندہ اُٹھ سکتا ہے تو بے بانگِ صُور

اے کہ تو ہے مطربِ نادر نوا
خاک میں مینڈک سا تو کب تک بھلا

اِس زمان و اِس مکاں پر ہو سوار
اور اس زُنّار کو تن سے اتار

اپنے چشم و گوش کو کر تیز تر
سامنے جو بھی ہو اس پر غور کر

سن سکے جو بات چیونٹی کی یہاں
فاش ہیں اس پر سب اسرارِ زماں

مجھ سے آلے وہ نگاہِ پردہ در
بند آنکھوں کا نہیں اس پر اثر

آدمی ہے دید باقی پوست ہے
دید بھی وہ جو لقائے دوست ہے

جملہ تن را در گداز اندر بصر
در نظر رو در نظر رو در نظر" (رومی)

تو ازیں نہ آسماں ترسی ؟ مترس — از فراخائے جہاں ترسی ؟ مترس
چشم بکشا بر زمان و بر مکاں — ایں دو یک حال است از احوالِ جاں
تا نگہ از جلوہ پیش افتادہ است — اختلافِ دوش و فردا زادہ است
دانہ اندر گل بظلمت خانۂ — از فضائے آسماں بیگانۂ
ہیچ می داند کہ در جائے فراخ — می تواں خود را نمودن شاخ شاخ ؟
جوہرِ او چیست ؟ یک ذوقِ نموست
ہم مقامِ اوست ایں جوہر ہم اوست

اے کہ گوئی محملِ جان است تن — سرِّ جاں را در نگر بر تن متن
محملے نے، حالے از احوالِ اوست — محملش خواندن فریبِ گفتگوست !
چیست جاں ؟ جذب و سرور و سوز و درد — ذوقِ تسخیرِ سپہر گرد گرد !
چیست تن ؟ با رنگ و بو خو کردن است — با مقامِ چار سو خو کردن است
از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور — چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق — وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق
ایں بدن با جانِ ما انباز نیست
مشتِ خاکے مانعِ پرواز نیست"

جملہ تن کو آنکھ میں تبدیل کر
خود نظر بن، خود نظر بن، خود نظر

آسمانوں سے تو ڈرتا ہے نہ ڈر وسعتِ عالم سے بے جا ہے حذر
یہ زماں کیا چیز ہے، کیا ہے مکاں؟ دونوں ہیں اک حال از احوالِ جاں
مات جلوؤں سے نظر جب کھائے گی اختلافِ دوش و فردا پائے گی
خاک کی ظلمت میں گم جو دانہ ہے وہ فضائے چرخ سے بیگانہ ہے
جانتا ہے، پائے گر جائے فراخ آشکارا ہوگا اندر شاخ شاخ
اس کا جوہر کیا ہے؟ بس بالیدگی
ہے مقام اس کا وہی، جو ہر وہی

اے کہ تجھ کو محملِ جاں ہے بدن! جان کیا ہے دیکھ تو تن پر نہ تن!
تن نہیں اک حال ہے احوال سے دھوکا ہے محمل اگر کہیئے اسے
ہے سرور و جذب و سوز و دردِ جاں لذتِ تسخیرِ چرخِ آسماں
جسم کیا ہے؟ رنگ و بو سے بستگی اس جہانِ چار سو سے بستگی
ہے شعور اپنا اساسِ نزد و دور اصلِ معراج انقلاب اندر شعور
ہے سمجھ کا فرق جذب و شوق سے اس میں چھٹکارا ہے تحت و فوق سے
جسم اپنا جاں کا ہم منزل نہیں
مانعِ پروازِ مشتِ گل نہیں

زروان کہ روحِ زمان و مکان است
مسافر را بسیاحتِ عالمِ علوی می برد

از کلامش جانِ من بے تاب شد — در تنم ہر ذرہ چوں سیماب شد
ناگہاں دیدم میانِ غرب و شرق — آسماں در یک سحابِ نور غرق
زاں سحاب افرشتۂ آمد فرود — باد و طلعت ایں چو آتش آں چو دود!
آں چو شب تاریک و ایں روشن شہاب — چشمِ ایں بیدار و چشمِ آں بخواب
بال او را رنگہائے سرخ و زرد — سبز و سیمین و کبود و لاجورد
چوں خیال اندر مزاجِ او رمے — از زمیں تا کہکشاں او را دمے
ہر زماں او را ہوائے دیگرے — پر کشادن در فضائے دیگرے
گفت "زروانم جہاں را قاہرم — ہم نہانم از نگہ ہم ظاہرم
بستہ ہر تدبیر با تقدیرِ من — ناطق و صامت ہمہ نخچیرِ من
غنچہ اندر شاخ می نالد ز من — مرغک اندر آشیاں نالد ز من
دانہ از پروازِ من گردد نہاں — ہر فراق از فیضِ من گردد وصال
ہم عتابے ہم خطابے آورم — تشنہ سازم تا شرابے آورم

زمان و مکان کی روح زروان مسافر کو
عالمِ بالا کی سیر کیلئے لے جاتی ہے

ان کو سن کر سب قرارِ جاں گیا
جسم کا ہر ذرہ تھا سیماب سا

ناگہاں دیکھا میانِ غرب و شرق
آسماں تھا نور کے بادل میں غرق

اک فرشتہ ابر سے اترا وہاں
اس کے دو رخ، آگ سا اک، اک دھواں

ظلمتِ شب اس میں وہ روشن شہاب
چشم بیدار اس کی، اس کی محوِ خواب

رنگ بھی اس کے پروں کا سرخ و زرد
"سبز و سیمیں اور کبود و لاجورد"

جوں تخیل تیزیٔ رفتار بھی
بس زمیں تا کہکشاں اک لحہ ہی

لحظہ لحظہ خواہشیں اس کی جدا
اک دگر عالم میں ہر دم پر کشا

بولا، مَیں زروآں ہوں مختارِ جہاں
ہوں نگاہوں سے نہاں بھی، ہوں عیاں

ساری تدبیریں مری تقدیر ہیں
گونگے، گویا سب مرے نخچیر ہیں

شاخ سے غنچے نکلواتا ہوں میں
بلبلوں کو نالہ سکھلاتا ہوں میں

ہے نوازش سے مری دانہ نہال
ہجر میرے دم سے ہوتا ہے وصال

مجھ سے انعامات مجھ ہی سے عتاب
کرتا ہوں پیاسا پلانے کو شراب

من حیاتم، من مماتم، من نشور — من حساب و دوزخ و فردوس و حور!
آدم و افرشتہ در بندِ من است — عالمِ شش روزہ فرزندِ من است!
ہر گُلے گز شاخ می چینی منم — اُمِّ ہر چیزے کہ می بینی منم!
در طلسمِ من اسیر است ایں جہاں — از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں
لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست — آں جوانمردے طلسمِ من شکست

گر تو خواہی من نباشم در میاں
لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں"

در نگاہِ او نمی دانم چہ بود — از نگاہم ایں کہن عالم ربود
یا نگاہم بر دگر عالم کشود — یا دگرگوں شد ہماں عالم کہ بود
مردم اندر کائناتِ رنگ و بو — زادم اندر عالمِ بے ہائے و ہو
رشتۂ من زاں کہن عالم گسست — یک جہانِ تازہ آمد بدست
از زیانِ عالمے جانم تپید — تا دگر عالم ز خاکم بر دمید
تن سبک تر گشت و جاں سیّار تر — چشمِ دل بیننده و بیدار تر

پردگی ہا بے حجاب آمد پدید
نغمۂ انجم بگوشِ من رسید!

مَیں حیات و موت بھی مَیں ہی نشور — مَیں حساب و دوزخ و فردوس و حور
میرے قابو میں فرشتے اور بشر — عالمِ فانی یہ خود میرا پسر
گل جو چنتے ہو تو دیکھو اس میں ہوں — اصل کو ہر شے کی جانچو اس میں ہوں
یہ جہاں ہے میرے افسوں میں اسیر — ہو رہا ہے میری سانسوں سے یہ پیر
لی مع اللہ کا ہے جو بھی راز دار — سحر پر میرے ہے کاری اس کا وار

تو جو چاہے مَیں نہ آؤں درمیاں
لی مع اللہ کہہ ذرا از عین جاں

کیا کہوں مَیں اس کی آنکھوں میں تھا کیا! — میری نظروں سے جہاں گم ہو گیا
یا نظر میری دگر عالم میں تھی — یا یہ دنیا ہی بدل کر رہ گئی
کائناتِ رنگ و بو سے چل بسا — اک جہانِ بے صدا میں جی اٹھا
رشتہ میرا اس جہاں سے کٹ گیا — اک جہانِ تازہ سے واصل ہوا
دل پہ اس دنیا کا نقصاں تھا گراں — بن گیا اس خاک سے دیگر جہاں
تن ہوا ہلکا سا، جاں سیّار تر — چشمِ دل تھی روشن اور بیدار تر

اُٹھ گئے پردے تھے جو بھی درمیاں
سامنے تاروں کو پایا نغمہ خواں

زمزمۂ انجم

عقلِ تو حاصلِ حیات عشقِ تو سرِّ کائنات
پیکرِ خاک! خوش بیا ایں سوئے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ و مشتری از تو رقیب یک دگر
از پئے یک نگاہِ تو کشمکشِ تجلّیات
در رہِ دوست جلوہ ہاست تازہ بتازہ نَو بنَو
صاحبِ شوق و آرزو دل نہ دہد بکلّیات
صدق و صفاست زندگی، نشو و نماست زندگی
تا ابد از ازل بتاز ملکِ خدا ست زندگی"
شوقِ غزلسرائے را رخصتِ ہائے و ہو بدہ
باز بہ رند و محتسب بادہ سبو سبو بدہ
شام و عراق و ہند و پارس خو بہ نبات کردہ اند
خو بہ نبات کردہ را تلخیٔ آرزو بدہ

زمزمۂ انجم

عقل ہے حاصلِ حیات، عشق ہے سرِّ کائنات
پیکرِ خاک آ ذرا چھوڑ کے عالمِ جہات
زہرہ و ماہ و مشتری تجھ سے رقیب اک دگر
دعوتِ دید ہے تجھے کش مکشِ تجلیات
جلوے ہیں راہِ یار میں تازہ بہ تازہ نو بہ نو
صاحبِ شوق کے لئے کافی نہیں ہیں کلیات
صدق و صفا ہے زندگی، نشوونما ہے زندگی
دوڑ ازل سے تا ابد، مِلکِ خدا ہے زندگی
شوقِ غزل سرائی کو لذّتِ ہائے و ہو بھی دے
رند کو محتسب کو تو بادہ سبو سبو بھی دے
شام و عراق و ہند و پارس دلدادہ شہد کے رہے
دلدادگانِ شہد کو تلخیٔ آرزو بھی دے

تا بہ یمِ بلند موج معرکۂ بنا کند
لذّتِ سیلِ تند رو با دلِ آبجو بدہ
مردِ فقیر آتش است، میری و قیصری خس است
فال و فرِ ملوک را حرفِ برہنۂ بس است!
دبدبۂ قلندری طنطنۂ سکندری
آں ہمہ جذبۂ کلیم ایں ہمہ سحرِ سامری
آں بنگاہ می کُشد ایں بہ سپاہ می کُشد
آں ہمہ صلح و آشتی ایں ہمہ جنگ و داوری
ہر دو جہاں کشاستند ہر دو دوام خواستند
ایں بہ دلیلِ قاہری آں بہ دلیلِ دلبری
ضربِ قلندری بیار سدِّ سکندری شکن
رسمِ کلیم[۱۵] تازہ کن رونقِ ساحری شکن!

تا وہ مقابلہ کرے بحرِ بلند موج کا
تو آبِ جو کو تیزیٔ سیل کی آرزو بھی دے
مردِ فقیر آگ ہے میری و بادشاہی خس
خاتمۂ ملوک کو ان کی برہنہ بات بس
"دبدبۂ قلندری، یہ سطوتِ سکندری"
وہ جذبہ ہے کلیمؑ کا اور یہ سحرِ سامری
وہ ضرب ہے نگاہ کی، یہ جنگ ہے سپاہ کی
اُس میں ہے صلح و آشتی، اس میں جنونِ داوری
دونوں ہیں فاتحِ جہاں بہرِ بقا رواں دواں
اِس کا طریقہ قاہری، اُن کا طریقہ دلبری
ضربِ قلندری لگا، سدِ سکندری کو ڈھا
رسمِ کلیمؑ تازہ کر رونقِ ساحری مٹا

فلکِ قمر

فلکِ قمر

ایں زمین و آسماں مِلکِ خداست
ایں مہ و پروین ہمہ میراثِ ماست!

اندریں رہ ہر چہ آید در نظر
با نگاہِ محرمے او را نگر

چوں غریباں در دیارِ خود مرو
اے ز خود گم اندکے بیباک شو!

این و آں حکمِ ترا بر دل زند
گر تو گوئی ایں مکن آں کن، کند

نیست عالم جز بتانِ چشم و گوش
اینکہ ہر فردائے او میرد چو دوش!

در بیابانِ طلب دیوانہ شو!
یعنی ابراہیمِ این بتخانہ شو!

چوں زمین و آسماں را طے کنی
ایں جہان و آں جہاں را طے کنی

از خدا ہفت آسماں دیگر طلب
صد زمان و صد مکاں دیگر طلب

بے خود افتادن لبِ جوئے بہشت
بے نیاز از حرب و ضرب خوب و زشت

گر نجاتِ ما فراغ از جستجوست
گور خوشتر از بہشتِ رنگ و بوست!

فلکِ قمر

مِلک اللہ کی زمین و آسماں اپنا ورثہ مہر و ماہ و کہکشاں
راہ میں اپنی تو پائے گا جنہیں بانگاہِ محرمانہ دیکھ انہیں
اپنی دنیا میں نہ پھر بیگانہ وار چل ذرا بیباک اے غفلت شعار
ہیں سبھی پابند تیرے حکم کے گر کہے تو یہ نہ کر وہ کر، کرے
ہیں جہاں میں سب بتاں چشم و گوش تیرا فردا بھی ہے فانی مثلِ دوش
جوں براہیم عشق میں دیوانہ بن ہے جہاں بت خانہ ہو جا بت شکن
جب زمین و آسماں کو طے کرے اِس جہاں اور اُس جہاں کو طے کرے
مانگ پھر اللہ سے سات آسماں پھر طلب کر ہفت زمیں اور ہفت مکاں
خود میں گم رہنا لبِ جوئے بہشت ترک کرنا حرب و ضرب و خوب و زشت
جستجو سے گر ہمیں رہنا ہے دور ایسی جنت سے ہے بہتر ہم کو گور

اے مسافر جاں نمیرد از مقام
زندہ تر گردد ز پروازِ مدام!

ہم سفر با اختراں بودن خوش است — در سفر یک دم نیاسودن خوش است
تا شدم اندر فضا ہا پے سپر — آنچہ بالا بود زیر آمد نظر
تیرہ خاکے برتر از قندیلِ شب! — سایۂ من بر سرِ من اے عجب!
ہر زماں نزدیک تر نزدیک تر — تا نمایاں شد کہستانِ قمر
گفت رومی "از گماں ہا پاک شو — خوگرِ رسم و رہِ افلاک شو
ماہ از ما دور و با ما آشنا ست — ایں نخستیں منزل اندر راہ ماست

دیر و زودِ روزگارش دیدنی است
غار ہائے کوہسارش دیدنی است!

آں سکوت آں کوہسارِ ہولناک — اندروں پُر سوز و بیروں چاک چاک
صد جبل از خاطفین و یلدرم — بر دہانش دود و نار اندر شکم
از درونش سبزۂ سر بر نزد — طائرے اندر فضایش پر نزد
ابر ہا بے نم ہوا ہا تند و تیز — با زمینِ مردۂ اندر ستیز
عالمے فرسودۂ بے رنگ و صوت — نے نشانِ زندگی در وے نہ موت!
نے بنافش ریشۂ نخلِ حیات — نے بہ صُلبِ روزگارش حادثات!

گرچہ ہست از دودمانِ آفتاب
صبح و شامِ او نزاید انقلاب!

اے مسافر موت ہے جاں کی مقام
ہے فروغِ زندگی پروازِ مدام

ساتھ سیاروں کے چلنا خوب ہے
چلتے ہی رہنا ہمیشہ خوب ہے

کر رہا تھا میں سفر اندر فضا
جو تھا سر پر اس کو پایا زیرِ پا

خاکِ تیرہ ضو فشاں رشکِ قمر
اب مرا سایہ چلا بالائے سر

ہر گھڑی تھا چاند سے نزدیک تر
اب نمایاں تھا کہستانِ قمر

بولے رومیؒ دور کر دل سے گماں
سیکھ آدابِ ورسومِ آسماں

دور ہے پر اپنا محرم ہے قمر
منزلِ اوّل یہ اپنی راہ پر

ہیں بہت دل کش یہاں کے کار و بار
دیدنی ہیں اس کے غار و کوہسار

وہ سکوت اور وہ کہستاں ہولناک
آگ اندر سطح باہر چاک چاک

کوہ جیسے خائفینِ یلدرم
منہ دھوئیں سے پُر تو شعلوں سے شکم

سبزہ ان کی خاک سے پیدا نہیں
اک پرندہ ان پہ منڈلایا نہیں

خشک بادل تند صرصر سی ہوا
مردہ خاکستر سے ان کا معرکہ

بے صدا، بے رنگ، فرسودہ جہاں
گم اجل، ناپید ہستی کا نشاں

غیر موجود اس میں آثارِ حیات
روز و شب نا آشنائے حادثات

اصل اس کی بھی ہے گرچہ آفتاب
اس کے صبح و شام ہیں بے انقلاب

گفت رومی "خیز وگامے پیش نہ — دولتِ بیدار را از کف مدہ
باطنش از ظاہرِ او خوشتر است — در قفارِ او جہانے دیگر است!
ہر چہ پیش آید ترا اے مردِ ہوش — گیر اندر حلقہ ہائے چشم و گوش
چشم اگر بینا ست ہر شے دیدنی است — در ترا از روئے نگہ سنجیدنی است
ہر کجا رومی برد آنجا برو — یک دو دم از غیرِ او بیگانہ شو"

دستِ من آہستہ سوئے خود کشید
تند رفت و بر سرِ غارے رسید

بولے رومیؒ اٹھ! قدم آگے بڑھا دولتِ بیدار لے خالی نہ جا
اس کے ظاہر سے ہے باطن خوب تر اس کے غاروں کا ہے عالم ہی دگر
جو بھی آگے آئے دیکھ اے مردِ ہوش رکھ کھلے اطراف اپنے چشم و گوش
ہے نظر والوں کو ہر شے دیدنی قدر ہے ان کی نظر سے جانچنی
لے چلے رومیؒ جدھر تو جا اُدھر اک دو دم غیروں کو رکھ دور از نظر

لے چلے آہستہ تھامے میرا ہاتھ
غار پر ہم آ کے پہنچے ایک ساتھ

عارفِ ہندی کہ بہ یکے از غارہائے قمر خلوت گرفتہ و اہلِ ہند او را "جہاں دوست" می گویند

من چو کوران دست بر دوش رفیق
پا نہادم اندران غارِ عمیق

ماہ را از ظلمتش دل داغ داغ
اندرو خورشید محتاجِ چراغ!

وہم و شک بر من شبیخوں ریختند
عقل و ہوشم را بدار آویختند!

راہ رفتم رہزناں اندر کمیں
دل تہی از لذّتِ صدق و یقیں!

تا نگہ را جلوہ باشد بے حجاب
صبحِ روشن بے طلوعِ آفتاب!

وادیٔ ہر سنگِ او زنّار بند
دیو سار از نخلہائے سربلند

از سرشتِ آب و خاک است این مقام
یا خیالم نقش بندد در منام!

در ہوائے او چو مے ذوق و سرور
سایہ از تقبیلِ خاکش عینِ نور

عارفِ ہندی سے ملاقات

جو چاند کے غاروں میں سے ایک غار میں خلوت گزیں تھا۔ ہند والے جسکو جہاں دوست کہتے ہیں

جیسے اندھا دوشِ ہمدم تھام کر
غار کے اندر چلا میں بے خطر

اس کی ظلمت چاند کے سینے کا داغ
چاہیے سورج کو بھی اس میں چراغ

ہو گیا شک و گماں میں مبتلا
ہاتھ عقل و ہوش سے دھونا پڑا

گھات میں گویا کہ رہزن ہر کہیں
دل ہوا بیگانۂ صدق و یقیں

ہو گئے اک لخت جلوے بے نقاب
صبح نکلی بے طلوعِ آفتاب

غار کے پتھر سبھی زنّار بند
جھاڑ دیوؤں کی طرح تھے سر بلند

سوچا کیا ہے یہ جہانِ خاک و آب
یا خیالی صورتیں ہیں اور خواب

تھا ہوا میں اس کی صہبا کا سرور
سایہ مٹی چوم کر بنتا تھا نور

نے زمینش را سپہرِ لاجورد — نے کنارش از شفقہا سرخ و زرد
نور در بندِ ظلام آنجا نبود — دود گردِ صبح و شام آنجا نبود
زیرِ نخلے عارفِ ہندی نژاد — دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد
موے بر سر بستہ و عریاں بدن — گردِ او مارے سفیدے حلقہ زن!
آدمے از آب و گل بالاترے — عالم از دیرِ خیالش پیکرے!
وقتِ او را گردشِ ایّام نے — کارِ او با چرخِ نیلی فام نے
گفت یارومی کہ ہمراہِ تو کیست؟ — در نگاہش آرزوئے زندگی است!

رُومی

مردے اندر جستجو آوارہ — ثابتے با فطرتِ سیّارہ
پختہ تر کارش ز خامی ہائے او — من شہیدِ ناتمامی ہائے او
شیشۂ خود را بگردوں بستہ طاق — فکرش از جبریل می خواہد صداق
چوں عقاب افتد بصیدِ مہ و مہر — گرم رو اندر طوافِ نہ سپہر
حرف با اہلِ زمیں رندانہ گفت — حور و جنّت را بت و بتخانہ گفت
شعلہ ہا در موجِ دودش دیدہ ام — کبریا اندر سجودش دیدہ ام
ہر زماں از شوق می نالد چو نال — می کشد او را فراق و ہم وصال

نے زمیں پر اس کی نیلا آسماں
نے کناروں پر شفق کی سرخیاں

نور پھندے میں نہ تھا ظلمات کے
اور دھواں تھا دورِ صبح و شام سے

عارفِ ہندی وہاں زیرِ شجر
فیض سے سرمہ کے کتنا خوش نظر

اس کے سر پر اک جٹا ننگا بدن
سانپ اجلا گرد تن کے حلقہ زن

آب و گل سے بے نیاز اک آدمی
عالم اک تصویر اس کے ذہن کی

دور تھا وہ گردشِ ایّام سے
ماورا تھا چرخِ نیلی فام سے

پوچھا رومی نے کہ کون ہے یہ ہمرہی؟
اس کی آنکھوں میں ہے ذوقِ زندگی

رُومی

جستجو میں محو اک آوارہ گرد
رہ کے ثابت ہی سفر میں ہے یہ مرد

خامیوں سے اپنی ہی وہ پختہ کار
اس کی خامی پر مجھے آتا ہے پیار

اس کا دل وابستۂ عرشِ بریں
فکر اس کی ہمدم روح الامینؑ

اس کے دھاوے چاند سورج پر ہیں صاف
کام اس کا آسمانوں کا طواف

گفتگو اس کی بڑی رندانہ ہے
حور بت، جنّت اسے بتخانہ ہے

ہے بہ باطن شعلہ و ظاہر دھواں
عشقِ یزداں اس کے سجدوں سے عیاں

ہر گھڑی شور و فغاں نے کی مثال
جان لیوا اس کو ہے یہ ہجر و وصال

من ندانم چیست در آب و گلش
من ندانم از مقام و منزلش!

جہاں دوست

عالم از رنگ است و بے رنگی است حق
چیست عالم؟ چیست آدم؟ چیست حق؟

رُومی

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم این شمشیر را سنگِ فسن!
شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید، از حق رمید
چشم بر حق باز کردن بندگی است
خویش را بے پردہ دیدن زندگی است!
بندہ چوں از زندگی گیرد برات
ہم خدا آں بندہ را گوید صلوات!

ہر کہ از تقدیرِ خویش آگاہ نیست
خاک او با سوزِ جاں ہمراہ نیست!

اس کے آب و گل سے مَیں واقف نہیں
موقع و منزل سے مَیں واقف نہیں

جہاں دوست

رنگ رنگ عالم ہے بے رنگی خدا
کیا ہے عالم، کیا ہے آدم، حق ہے کیا؟

رُومی

آدمی شمشیر، حق شمشیر زن
عالم اس کے واسطے سنگِ فسن

شرق دُور عالم سے اور حق آشنا
غرب حق سے دور دنیا پر فدا

دیدِ حق ہے در حقیقت بندگی
فاش خود کو دیکھنا ہی زندگی

بہرہ ور جب زیست سے بندہ ہوا
اس کو آتا ہے سلام اللہ کا

جو نہیں قسمت سے اپنی باخبر
سوزِ جاں سے وہ نہ ہوگا بارور

جہاں دوست

بر وجود و بر عدم پیچیدہ است
مشرق ایں اسرار را کم دیدہ است

کارِ ما افلاکیاں جز دید نیست
جانم از فردائے او نومید نیست!

دوش دیدم بر فرازِ قشمرود
ز آسماں افرشتۂ آمد فرود

از نگاہش ذوقِ دیدارے چکید
جز بسوئے خاکدانِ ما ندید

گفتمش از محرماں رازے بپوش
تو چہ بینی اندر آں خاکِ خموش؟

از جمالِ زہرۂ بگداختی؟
دل بہ چاہِ بابلے انداختی؟

گفت "ہنگامِ طلوعِ خاور است
آفتابِ تازہ او را در بر است

لعلہا از سنگِ رہ آید بروں
یوسفانِ او ز چہ آید بروں!

رستخیزے در کنارش دیدہ ام
لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام

رخت بندد از مقامِ آذری
تا شود خود گر ز ترکِ بُت گری

اے خوش آں قومے کہ جانِ او تپید
از گلِ خود خویش را باز آفرید!

عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملتے!"

پیرِ ہندی اندکے دم در کشید
باز در من دید و بے تابانہ دید

گفت مرگِ عقل؟ گفتم ترکِ فکر
گفت مرگِ قلب؟ گفتم ترکِ ذکر

جہاں دوست

ہے ابھی بود و عدم میں مبتلا — شرق کو کیا علم ان اسرار کا
مشغلہ ہم آسماں والوں کا دید — میری جاں ان سے نہیں ہے ناامید
مَیں نے دیکھا ہے بہ اوجِ قشمرود — اک فرشتہ کا ہوا کل شب وُرود
دیکھنا وہ! انہماک اس میں وہاں! — دیکھتا تھا صرف سوئے خاکداں
بولا کچھ ہم محرموں کو بھی بتا — تجھ کو دنیا میں نظر آتا ہے کیا؟
کیا نظر آیا کوئی زہرہ لقا؟ — چاہِ بابل میں تیرا دل پھنس گیا؟
بولا مشرق میں ہے ہنگامِ سحر — اک نیا سورج طلوع ہوگا ادھر
سنگِ رہ سے لعل باہر آئیں گے — چاہ سے یوسف بھی باہر آئیں گے
شرق کو دیکھا ہے محشر در کنار — لرزہ بر تن زلزلوں سے کوہسار
چھوڑ کر اپنا مقامِ آذری — ہوگا وہ خود گر، بھلا کر بُت گری
مرحبا! وہ ملّتِ بے تاب جاں — مٹ کے پھر مٹی سے جو ہوگی عیاں

عید وہ دن عرش والوں کے لئے
کوئی ملّت خواب سے گر جاگ اُٹھے

پیرِ ہندی اب ذرا چپ ہو رہا — تجھ کو پھر جلدی سے دیکھا آنکھ اٹھا
پوچھا مرگِ عقل؟ بولا ترکِ فکر — پوچھا مرگِ قلب؟ بولا ترکِ ذکر

گفت تن؟ گفتم کہ زاد از گردِ رہ گفت جان؟ گفتم کہ رمزِ لاالٰہ
گفت آدم؟ گفتم از اسرارِ اوست گفت عالم؟ گفتم او خود روبروست
گفت ایں علم و ہنر؟ گفتم کہ پوست گفت محبّت چیست؟ گفتم روئے دوست
گفت دینِ عامیاں؟ گفتم شنید گفت دینِ عارفاں؟ گفتم کہ دید

از کلامم لذّتِ جانش فزود
نکتہ ہائے دل نشیں بر من کشود

پوچھا تن؟ بولا ذرا سی گردِ راہ پوچھا جاں؟ بولا وہ رمزِ لا الٰہ
پوچھا آدم؟ بولا ئیں اسرارِ ہُو پوچھا عالم؟ بولا جو ہے رو برو
پوچھا سب علم و ہنر؟ بولا کہ پوست پوچھا حجّت اس پہ؟ بولا روئے دوست
پوچھا دینِ عامیاں؟ بولا شنید پوچھا دینِ عارفاں؟ بولا کہ دید

تازہ جاں باتیں مری سُنکر ہوا
رازہائے دل نشیں کہنے لگا

نُہ تا سر سخن از عارفِ ہندی

۱

ذاتِ حق را نیست ایں عالم حجاب
غوطہ را حایل نگردد نقشِ آب!

۲

زادن اندر عالمے دیگر خوش است
تا شبابِ دیگرے آید بدست!

۳

حق در لائے مرگ و عینِ زندگی است
بندہ چوں میرد نمی داند کہ چیست!
گرچہ ما مرغانِ بے بال و پریم
از خدا در علمِ مرگ افزوں تریم!

عارفِ ہندی کے نوزکات

۱

ذاتِ حق کو یہ جہاں کب ہے حجاب
آڑ غوطے کو نہیں ہے نقشِ آب

۲

خوب ہے لینے جنم دیگر جہاں
ہو سکیں تا از سرِ نو ہم جواں

۳

مرگ نادیدہ خدا عین حیات
مرنے والا بندہ کیوں پائے یہ بات
گرچہ ہم ہیں طائرِ بے بال و پر
موت سے رکھتے ہیں ہم پوری خبر

۴

وقت ؛ شیرینی بزہر آمیختہ
رحمتِ عالمے بقہر آمیختہ!
خالی از قہرش بہ تلینی شہر و دشت
رحمتِ او اینکہ گوئی در گذشت!

۵

کافری مرگ است اے روشن نہاد
کے سزد با مُردہ غازی را جہاد!
مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ
بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ!

۶

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم!

۷

چشمِ کور ست اینکہ بیند ناصواب
ہیچگہ شب را نہ بیند آفتاب!

۴

وقت ہم کو جیسے شیرینی میں زہر
عام رحمت جس سے ہے وابستہ قہر
دشت خالی ہیں نہ شہر اس سے تہی
اس کی رحمت یہ کہ آفت ٹل گئی

۵

کافری کیا؟ موت ہے اے پاک زاد
مَرد مُردوں سے نہیں کرتے جہاد
مومن اپنے نفس سے کرتا ہے جنگ
جیسے آہو پر جھپٹتا ہے پلنگ

۶

بت کے آگے کافرِ روشن بَصَر
بے خبر دیندار سے بھی خوب تر

۷

عیب ہیں ہو آنکھ تو بینا نہیں
شب نظر آتی ہے سورج کو کہیں ؟

۸

صحبتِ گل دانہ را سازد درخت
آدمی از صحبتِ گل تیرہ بخت!
دانہ از گل می پذیرد پیچ و تاب
تا کند صیدِ شعاعِ آفتاب!

۹

من بگُل گفتم بگو اے سینہ چاک
چوں بگیری رنگ و بو از باد و خاک؟
گفت گل اے ہوشمندِ رفتہ ہوش
چوں پیامے گیری از برقِ خموش؟
جاں بتن مارا ز جذبِ این و آں
جذبِ تو پیدا و جذبِ ماہناں!

۸

صحبتِ گِل سے بنے دانہ شجر
خاک کی صحبت سے انساں خوار تر
خاک میں کھاتا ہے دانہ پیچ و تاب
تا کرے بس میں شعاعِ آفتاب

۹

مَیں نے پوچھا اک گِلِ صد چاک سے
رنگ و بو کیوں پایا باد و خاک سے؟
بولا عاقل ہوش ہیں تیرے کدھر؟
کس طرح لیتے ہیں بجلی سے خبر؟
جذب سے اشیا کے ہم پاتے ہیں جاں
جذب تیرا ہے عیاں، اپنا نہاں

جلوۂ سروش

مردِ عارف گفتگو را در بہ بست — مستِ خود گردید و از عالم گسست!

ذوق و شوق او را ز دستِ او ربود — در وجود آمد ز نیرنگِ شہود

با حضورش ذرہ ہا مانندِ طُور — بے حضورِ او نہ نور و نے ظہور!

ناز نینے در طلسمِ آں شبے — آں شبے بے کوکبے را کوکبے!

سنبلستانِ دو زلفش تا کمر — تاب گیر از طلعتش کوہ و کمر

غرق اندر جلوۂ مستانۂ — خوش سرود آں مستِ بے پیمانۂ

پیشِ او گردندہ فانوسِ خیال — ذوفنوں مثلِ سپہرِ دیر سال

اندراں فانوس پیکر رنگ رنگ — شکرہ بر کنجشک و بر آہو پلنگ!

من بہ رومی گفتم اے دانائے راز — بر رفیقِ کم نظر بکشائے راز

گفت "ایں پیکر چو سیم تابناک — زاد در اندیشۂ یزدانِ پاک!

باز بے تابانہ از ذوق نمود — در شبستانِ وجود آمد فرود

ہمچو ما آوارہ و غربت نصیب — تو غریبی من غریبم او غریب!

شانِ او جبریلی و نامش سروش — می برد از ہوش و می آرد بہ ہوش

غنچۂ ما را کشود از شبنمش — مردہ آتش زندہ از سوزِ دمش

زخمۂ شاعر بسازِ دل از وست — چاکہا در پردۂ محمل از وست

دیدہ ام در نغمۂ او عالمے — آتشے گیر از نوائے او دمے!"

جلوۂ سروش

مردِ عارف اتنا کہہ کر چُپ ہوا
مست ہو کر آپ خود میں کھو گیا

رو میں ذوق و شوق کی خود بہ گیا
ہٹ کے عالم سے وہ مست ھُو ہوا

حق کے آگے ذرہ ذرہ مثلِ طُور
بے حضور اس کو نہیں نور و ظہور

اس طلسمی رات میں اک نازنیں
جیسے اک تارہ تھی جلوہ آفریں

اس کی زلفوں کی درازی تا کمر
روشن اس کے چہرے سے کوہ و کمر

جلوۂ مستانہ میں ڈوبی ہوئی
گا رہی تھی مست بے پیمانہ ہی

سامنے گردش میں فانوسِ خیال
پیرِ پُر فن چرخِ گردوں کی مثال

اس میں جوں چڑیا پہ شکرہ پنجہ زن
جیسے اک چیتے کے چنگل میں ھرن

مَیں نے رومی سے کہا اے رازداں
کم نظر پر کر عیاں راز نہاں

بولے مجھ سے یہ بت سیمیں جمال
نقش گر اس کا ہے یزداں کا خیال

ہو کے پھر سرگشتۂ ذوق نمود
ہو گئی ہے وارِدِ بزمِ وجود

وہ بھی ہم جیسی ہے اک غربت نصیب
تُو غریب، اور میں غریب، اور وہ غریب

جبرئیلی شان، نام اس کا سروش
ہوش اڑاتی ہے وہ لاتی ہے بہ ہوش

اس کی شبنم سے کلی اپنی کھلے
شعلہ زن سرد آگ اس کی پھونک سے

شاعر اس کے فیض سے نغمہ سرا
اس کے دم سے پردہ چاک اسرار کا

اس کے نغموں میں ہے عالم اور ہی
اس کے نغمہ سے ہو محظوظ آپ بھی

نوائے سروش

ترسم کہ تو مے رانی ز ورق بسراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر!
چوں سرمۂ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ امم دیدم پنہاں بکتاب اندر!
برکشت و خیاباں پیچ، بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ نخود پیچد میرد بسحاب اندر!
با مغربیاں بودم پُر جستم و کم دیدم
مردے کہ مقاماتش ناید بحساب اندر!
بے دردِ جہاں گیری آں قرب میسّر نیست
گلشن بگریباں کش اے بوبگلاب اندر،
اے زاہدِ ظاہر بیں گیرم کہ خودی فانی است
لیکن تو نہ می بینی طوفاں بہ حباب اندر!
ایں صوتِ دلاویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجورِ جناں حورے نالد بہ رباب اندر!

نوائے سروش

شاید چلا ہے تیرا سفینہ سراب میں
جینا ترا حجاب میں، مرنا حجاب میں
راہِ خرد کو چھوڑ کے دیکھا ہے میں نے جب،
قوموں کے جزر و مد نظر آئے کتاب میں
گر کوہ و دشت و باغ و خیاباں پرے ہے برق،
لپٹی رہے جو خود سے مرے گی سحاب میں
ڈھونڈا دیارِ غرب میں پایا نہ ایک بھی
ذی مرتبہ وہ جو نہ سمائے حساب میں
تسخیرِ آب و گل جو نہیں قرب بھی نہیں
لا بوئے گل! سمیٹ کے گلشن گلاب میں
مانا بظاہر اپنی خودی کو فنا ہے شیخ!
تو دیکھتا نہیں ہے تلاطم حباب میں
آوازِ دل نشین یہ نہیں فیضِ زخمہ سے
مہجورِ خلد حور ہے نالاں رباب میں

حرکت بہ وادیٔ یرغمید کہ ملائکہ او را وادیٔ طوا سین می نامند

رومی آں عشق و محبت را دلیل — تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل
گفت "آں شعرے کہ آتش اندر وست — اصل او از گرمیِ اللہ ہو ست!
آں نوا گلشن کند خاشاک را — آں نوا برہم زند افلاک را
آں نوا بر حق گواہی می دہد — با فقیراں پادشاہی می دہد!
خوں ازو اندر بدن سیّار تر — قلب از روح الامیں بیدار تر
اے بسا شاعر کہ از سحرِ ہنر — رہزنِ قلب است و ابلیسِ نظر!
شاعرِ ہندی! خدا ایشں یار باد — جانِ او بے لذّت گفتار باد
عشق را خنیاگری آموختہ — با خلیلاں آذری آموختہ!
حرفِ او چاویدہ و بے سوز و درد — مُرد خوانند اہلِ درد او را نہ مَرد
زاں نوائے خوش کہ نشناسد مقام — خوشتر آں حرفے کہ گوئی در منام
فطرتِ شاعر سراپا جستجو ست — خالق و پروردگارِ آرزو ست!
شاعر اندر سینۂ ملّت چو دل — ملّتے بے شاعرے انبارِ گل!
سوز و مستی نقشبندِ عالمے است — شاعری بے سوز و مستی ماتمے است!

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است"

گفتم از پیغمبری ہم باز گوے — سرِّ او با مردِ محرم باز گوے

وادیٔ پرغمید کی سیر جس کو ملائکہ وادیٔ طواسین کہتے ہیں

رومی وہ عشق و محبّت کے دلیل — عاشقوں کو ان کا نغمہ سلسبیل
بولے، وہ نغمہ کہ جس میں آگ ہے — در حقیقت عشقِ حق کا راگ ہے
نغمہ وہ گلشن کرے خاشاک کو — وہ کرے زیر و زبر افلاک کو
وہ نوا حق و صداقت پر گواہ — وہ فقیروں کو بنا دیتی ہے شاہ
اس کے باعث تن میں خوں سیّار تر — قلب بھی جبریل سے بیدار تر
شاعر اکثر ہوتے ہیں جادو بیاں — رہزن قلب و نظر ان کی زباں
شاعرِ ہندی، خدا اس کو بچائے — خوب ہوگا وہ جو کچھ کہنے نہ پائے
نغمہ خوانی عشق کو سکھلا دیا — بت شکن کو ذوقِ آذر کا دیا
بات دور از فہم اور بے سوز و درد — پیشِ اہلِ درد وہ مُردہ نہ مرد
راگ جس میں رنگ موسیقی نہیں — نیند کی بڑ بڑ بھلی اس سے کہیں
فطرتِ شاعر ہو وقفِ جستجو — "خالق و پروردگارِ آرزو"
شاعر اپنی قوم کے سینے میں دل — قوم شاعر کے بنا انبارِ گل
سوز و مستی کی ڈھلی ہے زندگی — نوحہ ہے بے سوز و مستی شاعری

شعر کا مقصد ہے گر آدم گری
شاعری ہے وارثِ پیغمبری

پوچھا... کیا ہوتی ہے وہ پیغمبری — کہئے اب محرم سے اس کا راز بھی

گفت "اقوام و ملل آیاتِ اوست — عنصرہائے ما ز مخلوقاتِ اوست
از دمِ او ناطق آمد سنگ و خشت — ما ہمہ مانندِ حاصل او چو کشت ا
پاک سازد استخوان و ریشہ را — بالِ جبریلے دہد اندیشہ را
ہائے و ہوئے اندرونِ کائنات — از لبِ او نجم و نور و نار و نات
آفتابش راز والے نیست نیست — منکرِ او را کمالے نیست نیست
رحمتِ حق صحبتِ احرارِ او — قہرِ یزداں ضربتِ کرّارِ او
گرچہ باشی عقلِ کل از وے مرم — زانکہ او بیند تن و جاں را بہم
تیز تر نہ پا براہِ پر غمید — تا بہ بینی آنچہ می بایست دید
کندہ بر دیوارے از سنگِ قمر
چار طاسینِ نبوّت را نگر"

شوق راہِ خویش داند بے دلیل — شوقِ پروازے ببالِ جبرئیل!
شوق را راہِ دراز آمد دو گام — ایں مسافر خستہ گردد از مقام
پا زدم مستانہ سوئے پر غمید — تا بلندیہائے او آمد پدید
من چہ گویم از شکوہِ آں مقام — ہفت کوکب در طوافِ او مدام
فرشیاں از نورِ او روشن ضمیر — عرشیاں از سرمۂ خاکش بصیر!
حق مرا چشم و دل و گفتار داد — جستجوئے عالمِ اسرار داد
پردہ را بر گیرم از اسرارِ کُل
با تو گویم از طواسینِ رسل

بولے "قومیں، ملّتیں اس کا نشاں
اس کے مخلوقات ادوارِ جہاں

پتھروں کو اس سے گویائی ملی
وہ ہے کھیتی اور حاصل ہم سبھی

پاک کر کے استخوان و ریشہ کو
دے گی بالِ جبرئیل اندیشے کو

اس کا مقصد نظم و ضبطِ کائنات
اس کے لب پر نجم و نور و نازعات

اس کے سورج کو نہیں ہرگز زوال
اس کے منکر کو نہیں ہرگز کمال

یاری اسکے یاروں سے فضلِ خدا
اس کی کراری غضب اللہ کا

عقلِ کُل ہو گا بھی تُو خود پر نہ تن
اس کے آگے ہیں کھلے سب جان و تن

چل ذرا تیزی سے راہِ پُرغمید
دیکھ لے سب ہے ضروری جس کی دید

ہیں منقش چاند کی دیوار پر
چار طاسینِ نبوت دیکھ ادھر"

عشق طے کرتا ہے رستہ بے دلیل
اس میں ہے پروازِ بالِ جبرئیل

ہے رہ صد سالہ بھی اس کو دو گام
خستہ کر دیتا ہے راہی کو مقام

جانبِ وادی چلا مستانہ وار
دیکھی آگے مَیں نے ٹیلوں کی قطار

ہے نرالی شان والا یہ مقام
گرد گرداں سات سیارے مدام

اہلِ فرش اس نور سے روشن ضمیر
اس کے سرمہ سے فرشتے بھی بصیر

مَیں نے پائے ہیں دل و چشم و زباں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اسرارِ نہاں

بس کہ دیتا ہوں فاش اسرارِ کُل
پیش کرتا ہوں طواسینِ رُسل

طاسینِ گوتم

توبہ آوردنِ زنِ رقاصۂ عشوہ فروش

گوتم

مئے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست
پیشِ صاحب نظراں حورِ جناں چیزے نیست!
ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی، گذرد
کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں چیزے نیست!
دانشِ مغربیاں فلسفۂ مشرقیاں
ہمہ بت خانہ و در طوفِ بتاں چیزے نیست

طاسینِ گوتم

شوخ و شنگ رقاصہ کا توبہ کرنا

گوتم

بادۂ کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں
آنکھ والوں کے لئے حورِ جناں کچھ بھی نہیں
جس کو سمجھا ہے تُو قائم وہ گزر جاتا ہے
کوہ و صحرا و بر و بحر و کراں کچھ بھی نہیں
فلسفہ شرق کا، مغرب کے سبھی علم و ہنر
بتکدے ہیں کہ پرستش کو جہاں کچھ بھی نہیں

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر
کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست
در طریقے کہ بنوکِ مژہ کاویدم من
منزل و قافلہ و ریگِ رواں چیزے نیست!

بگذر از غیب کہ ایں ہم وگماں چیزے نیست
در جہاں بودن و رستن ز جہاں چیزے ہست
آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست جناں چیزے ہست!
راحتِ جاں طلبی؟ راحتِ جاں چیزے نیست
در غمِ ہم نفساں اشکِ رواں چیزے ہست
چشمِ مخمور و نگاہِ غلط انداز و سرود
ہمہ خوب است و لے خوشتر ازاں چیزے ہست
حسنِ رخسارِ مے ہست و مے دیگر نیست
حسنِ کردار خیالاتِ خوشاں چیزے ہست!

اپنی ہستی میں اگر نہ تُو ڈر ڈر کے نہ چل
تو ہے موجود، وجودِ دو جہاں کچھ بھی نہیں
جو رہِ شوق مشقت سے بنائی اس میں
منزل و قافلہ و ریگ رواں کچھ بھی نہیں

غیب کو چھوڑ بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں
دہر میں رہتے ہوئے ترکِ جہاں ہے کوئی چیز
جو خدا دیتا ہے جنت وہ کوئی چیز نہیں
ہو صلہ اپنے عمل کا تو جناں ہے کوئی چیز
چاہیے راحتِ جاں؟ راحتِ جاں کچھ بھی نہیں
غمِ احباب میں، ہاں، اشکِ رواں ہے کوئی چیز
چشمِ مخمور و نگاہِ غلط انداز و سرود،
خوب ہیں، خوب تر ان سے بھی یہاں ہے کوئی چیز
حسنِ ظاہر ابھی موجود ابھی نا موجود
نیک اعمال کا سکھ، نیک گماں ہے کوئی چیز

رقاصہ

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را
از تو درونِ سینہ ام برقِ تجلی کہ من
با مہ و مہر دادہ ام تلخیٔ انتظار را
ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جانِ امید وار را!
تا بفراغِ خاطرے نغمۂ تازہ رُنم
ناز بہ مرغزار دہ طائرِ مرغزار را
طبعِ بلند دادۂ، بند ز پائے من کشائے
تا بہ پلاسِ تو دہم خلعتِ شہریار را
تیشہ اگر بہ سنگ زد ایں چہ مقام گفتگو است؟
عشق بدوش می کشد ایں ہمہ کوہسار را!

رقاصہ

فرصتِ کشمکش نہ دے اس دلِ بے قرار کو
ایک دو پیچ اور دے گیسوئے تابدار کو

برقِ تجلی سے تری سینہ ہے میرا پُر فروغ
جھیل رہے ہیں مہر و مہ تلخیٔ انتظار کو

لذّتِ دید کے سبب پڑ گئی رسمِ بُت گری
عشق کا یہ فریب ہے جان امیدوار کو

تا نغمہ تازہ گا سکے، دل کو سکون تا ملے
اُس کی جگہ پہ چھوڑ دے طائرِ مرغزار کو

طبعِ بلند کی عطا، قید سے بھی تو کر رہا
صدقے پلاس پر کروں خلعتِ شہریار کو

کوہ کنی کا ذکر کیا یہ بھی کوئی کمال ہے؟
عشق اٹھائے ہے جہاں دوش پہ کوہسار کو

طاسینِ زرتشت

آزمایش کردنِ اہرمن زرتشت را

اہرمن

از تو مخلوقاتِ من نالاں چو نَے
از تو مارا فرودیں مانند دے

در جہاں خوار و زبوں کردۂ
نقشِ خود رنگیں ز خونم کردۂ

زندہ حق از جلوۂ سینائے تست
مرگِ من اندر یدِ بیضائے تست!

تکیہ بر میثاقِ یزداں ابلہی است
بر مرادش راہ رفتن گمرہی است

زہر ہا در بادۂ گلفامِ اوست
الّٰہ و کرم و صلیب انعامِ اوست!

جز دعاہا نوحِ تدبیرے نداشت
حرفِ آں بیچارہ تاثیرے نداشت!

طاسینِ زرتشت

اہرمن کا زرتشت کو آزمانا

اہرمن

میری خلقت تجھ سے نالاں زار زار — ہے خزاں کا حال ہنگامِ بہار
دہر میں خوار و زبوں مجھ کو کیا — میرے خوں سے خود کو رنگیں کر لیا
ہے ترے سینا سے حق کی زندگی
مَیں فنا تیرے یدِ بیضا سے ہی

وعدۂ یزداں پہ تکیہ ابلہی — رہنما اس کو بنانا گمرہی
وہ کہ سم در بادۂ گلفام ہے — دارُ، آرا، کرم، یہ انعام ہے
نوحؑ کی تدبیر کیا تھی جز دعا؟ — خود بتا حاصل کچھ اس سے ہو سکا؟

شہر را بگذار و در غارے نشیں — ہم بہ خیلِ نوریاں صحبت گزیں
از نگاہے کیمیا کن خاک را — از مناجاتے بسوز افلاک را
در کہستاں چوں کلیم آوارہ شو — نیم سوز آتشِ نظارہ شو
لیکن از پیغمبری باید گذشت — از چنیں ملّا گری باید گذشت!
کس میانِ ناکساں ناکس شود — فطرتش گر شعلہ باشد خس شود
تا نبوت از ولایت کمتر است — عشق را پیغمبری دردِ سر است!

خیز و در کاشانۂ وحدت نشیں
ترک جلوت گوے و در خلوت نشیں!

زرتشت

نور دریاے است ظلمت ساحلش — ہم چو من سیلے نزاد اندر دلش
اندرونم موجہاے بے قرار — سیل را جز غارتِ ساحل چہ کار؟
نقشِ بیرنگے کہ او را کس ندید — جز بخونِ اہرمن نتواں کشید!

خویشتن را وانمودن زندگی است
ضربِ خود را آزمودن زندگی است!

از بلاہا پختہ تر گردد خودی — تا خدا را پردہ در گردد خودی

چھوڑ آبادی کو بن خلوت نشیں — جا ہجومِ نوریاں میں رہ وہیں
اک نگہ سے کیمیا کر خاک کو — اک دعا سے پھونک دے افلاک کو
دشت میں مثلِ کلیمؑ آوارہ رہ — نیم سوزِ آتشِ نظارہ رہ
لیکن اس پیغمبری کو ترک کر — جا تری ملّا گری کو ترک کر
ناکسوں میں کس کہاں رہتا ہے کس؟ — شعلہ ہو گا بھی تو بن جائے گا خس
کم ولایت سے نبوت ہے اگر — عشق کو پیغمبری ہے دردِ سر

اٹھ کے بس کاشانۂ وحدت میں آ
ترک کر جلوہ گری خلوت میں آ

زرتشت

نور ہے دریا کنارا ظلمتیں — لہر مجھ سی تھی کہاں اس بحر میں
میرے باطن میں ہیں طوفاں صبح و شام — سیل کو ساحل کے ڈھانے سے ہے کام
نقش نادیدہ تھا اُس بے رنگ کا — اہرمن کے خون سے کھینچا گیا

خود کو ظاہر کر دکھانا زندگی
ضرب اپنی آزمانا زندگی

سختیاں سہ کر سنورتی ہے خودی — پھر خدا کو فاش کرتی ہے خودی

مردِ حق بیں جز بحق خود را ندید لا الہ می گفت و در خوں می تپید!
عشق را در خوں تپیدن آبروست الّٰہ و چوب و رسن عیدینِ اوست!

در رہِ حق ہر چہ پیش آید نکوست
مرحبا نامہربانہائے دوست!

جلوۂ حق چشمِ من تنہا نخواست حسن را بے انجمن دیدن خطاست
چیست خلوت؟ درد و سوزِ آرزوست انجمن دیدار است و خلوت جستجوست
عشق در خلوت کلیم اللہی است چون بجلوت می خرامد شاہی است!
خلوت و جلوت کمالِ سوز و ساز ہر دو حالات و مقاماتِ نیاز
چیست آں؟ بگذشتن از دیر و کنشت چیست ایں؟ تنہا نہ رفتن در بہشت!
گریہ اندر خلوت و جلوت خداست خلوت آغاز است و جلوت انتہاست
گفتہ پیغمبری در دِ سر است عشق چوں کامل شود آدم گر است!

راہِ حق با کارواں رفتن خوش است
ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است!

جز بہ حق دیکھے نہ خود کو باخدا لوٹے اپنے خوں میں کہتے لا الٰہ
آبروئے عشق ہے ہونا شہید اس کے حق میں آرا و سولی ہے عید

راہِ حق میں جو بھی پیش آئے بھلا
مرحبا اے جوہرِ دلبر مرحبا!

جلوۂ حق بہرِ خاص و عام تھا ہے خطا بے انجمن اس کی لقا
کیا ہے خلوت؟ درد و سوز و آرزو انجمن دیدار، خلوت جستجو
عشق خلوت میں کلیم اللہی ہے اور جلوت میں جو آئے شاہی ہے
"خلوت و جلوت کمالِ سوز و ساز ہر دو حالات و مقاماتِ نیاز"
کھینچنا وہ کافری سے اپنا ہاتھ داخلِ جنّت یہ ہونا سب کے ساتھ
خلوت و جلوت ہے دونوں میں خدا ابتدا خلوت ہے جلوت انتہا
کیا کہا؟ پیغمبری ہے دردِ سر عشق آدم گر بنے تکمیل پر

سوئے حق با کارواں بہتر سفر
بن کے رہنا جاں جہاں میں خوب تر

طاسینِ مسیح

رویائے حکیم طالسطائیؒ

درمیانِ کوہسارِ ہفت مرگ — وادیٔ بے طائر و بے شاخ و برگ!
تابِ مہ از دودِ گردِ او چو قیر — آفتاب اندر فضایش تشنہ میر!
رودِ سیماب اندراں وادی رواں — خم بخم مانندِ جوئے کہکشاں
پیشِ او پست و بلندِ راہ ہیچ — تند سیر و موج موج و پیچ پیچ
غرق در سیماب مردے تا کمر — با ہزاراں نالہ ہائے بے اثر!
قسمتِ او ابر و باد و آب نے — تشنہ و آبے بجز سیماب نے!
بر کراں دیدم زنے نازک تنے — چشمِ او صد کارواں را رہزنے
کافری آموزِ پیرانِ کنشت — از نگاہش زشت خوب و خوب زشت
گفتمش تو کیستی نامِ تو چیست؟ — ایں سراپا نالہ و فریاد کیست؟
گفت در چشمم فسونِ سلمٰی است — نامم افرنگین و کارم ساحری است!
ناگہاں آں جوئے سیمیں تیز بست — استخوانِ آں جواں در تن شکست

طاسینِ مسیح

حکیم طالسطائی کا خواب

تھی میانِ کوہسارِ ہفت مرگ — ایک وادی بے طیور و شاخ و برگ
تھی دھوئیں سے چاندنی اس جا سیاہ — تشنہ لب سورج کا عالم تھا برا
تھا وہاں پارے کا اک دریا رواں — بل پہ بل کھاتا ہوا جوں کہکشاں
تیز رو، ہر موج اچھلتی کودتی — اس کو سب پستی بلندی ایک تھی
ایک انساں اس میں پھنس کر تا کمر — کر رہا تھا نالہ ہائے بے اثر
اس کی قسمت میں نہ پانی نے ہوا — تشنہ تھا تر کرنے لب سیماب تھا
ساحلِ دریا پہ اک نازک بدن — قافلوں کو اس کی آنکھیں راہزن
کافر اس کے فیض سے پیرِ کنشت — زشت خوب اس کی نظر سے خوب زشت
پوچھا اس سے کون ہے تو نام کیا؟ — اور اِدھر وہ کون ہے نالہ سرا؟
بولی آنکھوں میں ہے سحرِ سامری — مَیں ہوں آفرنگین، بہ پیشہ ساحری
جم گیا دریا میں پارہ ناگہاں — ہو گئیں چُور اس کے تن کی ہڈیاں

بانگ زد اے وائے بر تقدیرِ من — وائے بر فریادِ بے تاثیرِ من!
گفت افرنگیں "اگر داری نظر — اندکے اعمالِ خود را ہم نگر
پورِ مریم آں چراغِ کائنات — نورِ او اندر جہات و بے جہات"
آں فلاطوس آں صلیب آں روئے زرد — زیرِ گردوں تو چہ کردی او چہ کرد!
اے بجانت لذتِ ایماں حرام — اے پرستارِ بتانِ سیمِ خام

قیمتِ روح القدس نشناختی
تن خریدی نقدِ جاں درباختی!"

طعنۂ آں نازنینِ جلوہ مست — آں جواں را نشتر اندر دل شکست
گفت "اے گندم نمائے جو فروش — از تو شیخ و برہمن ملّت فروش!
عقل و دیں از کافریہائے تو خوار — عشق از سوداگریہائے تو خوار!
مہرِ تو آزار و آزار نہاں — کینِ تو مرگ است و مرگِ ناگہاں!
صحبتے با آب و گل ورزیدۂ — بندہ را از پیشِ حق دزدیدۂ
حکمتے کو عقدۂ اشیا کشاد — با تو غیر از فکرِ چنگیزی نداد
داند آں مردے کہ صاحبِ جوہر است — جرمِ تو از جرمِ من سنگیں تر است
از دمِ او رفتہ جاں آمد بتن — از تو جاں را دخمہ می گردد بدن
آنچہ ما کردیم با ناسوتِ او — ملّتِ او کرد بالا ہوتِ او

مرگِ تو اہلِ جہاں را زندگی است
باش! تا بینی کہ انجامِ تو چیست!"

بولا صد افسوس اس تقدیر پر — میری اس فریادِ بے تاثیر پر
بولی افرنگیس تو بینا ہے اگر — ڈال خود افعال پر اپنے نظر
ابنِ مریم وہ چراغِ کائنات — نور اس کا بے جہات اندر جہات
دار و حاکمِ روم و مردِ باخدا! — کیا خطا تھی اس کی، تو نے کیا کیا؟
اے کہ تجھ پر لذتِ ایماں حرام — اے پرستارِ بتانِ سیم خام!
رتبۂ روح القدس جانا نہیں
جاں لٹا کر جسم لیتے ہیں کہیں؟

تلخ گزرا طعنہ افرنگین کا — اس جواں کے دل میں نشتر سا لگا
بولا "اے گندم نمائے جو فروش — تجھ سے شیخ و برہمن ملّت فروش
دشمنِ عقل و دیں کی تیری کافری — عشق کی خواری تری سوداگری
دوستی تیری ہے آزارِ نہاں — دشمنی تیری ہے مرگِ ناگہاں
آب و گل پر ہی سدا مرتی ہے تو — حق سے بندوں کو جدا کرتی ہے تو
علم جس سے عقدۂ عالم ہے وا — فکرِ چنگیزی تجھے اس کی عطا
صاحبِ جوہر ہیں اس سے باخبر — جرم میرا کم، ترا سنگین تر
مردے جی اٹھتے تھے اس کے حکم سے — تجھ سے خود تن گور ہے جاں کے لئے
جسم سے اس کے جو کچھ ہم نے کیا — قوم نے لاہوت سے اس کے کیا
زندگی دنیا کی اک مرنا ترا
ٹھہر! تا دیکھے تو ہے انجام کیا"

طاسینِ محمدؐ

نوحۂ روحِ ابوجہل در حرمِ کعبہ

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ! از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ!
از ہلاکِ قیصر و کسرا ے سرود نوجواناں را ز دستِ ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است ایں دو حرف لا الٰہ خود کافری است
تا بساطِ دینِ آبا در نورد با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد!
پاش پاش از ضربتش لات و منات انتقام از وے بگیر اے کائنات!
دل بغائب بست و از حاضر گسست نقشِ حاضر را فسونِ او شکست!
دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست!
پیشِ غائب سجدہ بردن کوری است دینِ نو کوراست و کوری دوری است

خم شدن پیشِ خدائے بے جہات!
بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت!

طٰہٰ سینِ محمدؐ

حرمِ کعبہ میں روحِ ابوجہل کا نوحہ

ہے محمدؐ سے یہ سینہ داغ داغ — گل ہے اس کے دم سے کعبے کا چراغ
قیصر و کسریٰ کو ختم اس نے کیا — نوجوانوں کو اڑا کر لے چلا
ساحر اس کی بات میں ہے ساحری — لا الٰہ کا کلمہ خود ہے کافری
دینِ آبا کو مٹانے کے لئے — ڈھائے ظلم اپنے خداؤں پر بڑے
چور چور اس نے کئے لات و منات — بدلہ اس کا تو ہی لے اے کائنات
کٹ کے وہ حاضر سے غائب پر گیا — نقشِ حاضر کو مٹا کر رکھ دیا
غیب پر وارفتگی اس کی خطا! — جو نہ ہو ظاہر کہیں ہوگا بھلا؟
سجدہ ان دیکھے خدا کو، کوری ہے — دینِ نو ہے کور، کوری دوری ہے

سجدہ یوں پیشِ خدائے بے جہات
کیا مزا دے گی بھلا ایسی صلوٰت

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب!
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ — با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند!
ایں مساوات ایں مواخاتِ عجمی است — خوب می دانم کہ سلماںؓ مزدکی است
ابنِ عبداللہ فریبش خوردہ است — رستخیزے بر عرب آوردہ است!
عترتِ ہاشم ز خود مہجور گشت — از دو رکعت چشمِ شاں بے نور گشت
عجمی را اصل عدنانی کجاست — گنگ را گفتارِ سحبانی کجاست
چشمِ خاصانِ عرب گر دیدہ کور — بر نیائی اے ز میر از خاکِ گور؟

اے تو مارا اندریں صحرا دلیل
بشکن افسونِ نوائے جبرئیل!

باز گو اے سنگِ اسود باز گوئے — آنچہ دیدیم از محمد باز گوئے
اے ہبل اے بندہ را پوزش پذیر — خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر
گلۂ شاں را بگرگاں کن سبیل — تلخ کن خرمائے شاں را بر نخیل!
صرصرے دہ با ہوائے بادیہ — اَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃ
اے منات اے لات ازیں منزل مرو — گر ز منزل می روی از دل مرو

اے ترا اندر دو چشمِ باوثاق
مہلتے اِن کُنتِ اَزمَعتِ الفِراق

اس کا مذہب قاطعِ ملک و نسب — خود قریشی دشمنِ فضلِ عرب
اس کے ہاں ہے ایک ہی سب کا مقام — ایک دسترخوان پہ آقا اور غلام!
قدرِ احرارِ عرب سے اس کو عار — اور ناشائستہ حبشی اس کے یار
اسود و احمر میں کیسی دوستی! — آبرو کیا خاندانوں کی رہی؟
ہے مساوات و مواخات العجمی — ہے حقیقت میں وہ سلمانؓ مزدکی
ابن عبداللہ دھوکا کھا گیا — تازیوں پر اک قیامت ڈھا گیا
آلِ ہاشم سے خود عزت دور ہے — آنکھ دینِ نو سے اب بے نور ہے
العجمی میں خونِ عدنانی کہاں؟ — گنگ میں گفتارِ سحبانی کہاں؟
چشمِ زعمائے عرب بینا نہیں — قبر سے اٹھ کر زبیرؓ آ بھی کہیں

آ ہمارے واسطے بن کر دلیل
توڑ دے سحرِ نوائے جبرئیل

ماجرا خود سنگِ اسود تو بتا — قصۂ جورِ محمدؐ تو بتا!
اے ہبل، اے عفو بخشِ عاصیاں! — چھین لے بے دینوں سے اپنا مکاں
ان کے گلّے بھیڑیوں کی نذر کر — تلخ کر دے ان کے خرما نخل پر
بادِ صحرائی میں دے صرصر کو راہ — جھاڑ اکھڑ کر بیخ و بن سے ہوں تباہ
اے منات! اے لات منزل سے نجا — چھوڑ دے بھی منزل تو اس دل سے نہ جا

ہے جگہ آنکھوں میں تیرے واسطے
کچھ جدائی کو بھی مہلت چاہیے

فلکِ عطارد

زیارتِ ارواحِ جمال الدین افغانی و سعید حلیم پاشا

مشتِ خاکے کارِ خود را بردہ پیش
در تماشائے تجلی ہائے خویش!

یا من افتادم بدامِ ہست و بود
یا بدامِ من اسیر آمد وجود!

اندریں نیلی تتق چاکے ازمن است؟
من زافلاکم کہ افلاک ازمن است؟

یا ضمیرم را فلک در برگرفت
یا ضمیرِ من فلک را در گرفت!

اندرون است ایں کہ بیرون است؟ چیست؟
آنچہ می بینند نگہ چون است؟ چیست؟

پرزنم بر آسمانے دیگرے
پیشِ خود بینم جہانے دیگرے

عالمے با کوہ و دشت و بحر و بر
عالمے از خاکِ ما دیرینہ تر

عالمے از 'ابرکے' بالیدۂ
دستبردِ آدمے نادیدۂ

نقشہا نابستہ بر لوحِ وجود
خردہ گیر فطرت آنجا کس نبود!

من بہ رومی گفتم ایں صحرا خوش است
در کہستانِ شورشِ دریا خوش است

می نیابم از حیات ایں جانشاں
از کجا می آید آواز اذاں؟

گفت رومی "ایں مقامِ اولیا است
آشنا ایں خاکداں با خاکِ ما است

بوالبشر چوں رخت از فردوس بست
یک دو روزے اندریں عالم نشست

زیارتِ ارواحِ جمال الدین افغانی و سعید حلیم پاشا

آگے آگے ہم یوں ہی بڑھتے چلے
خود جلو میں اپنے جلوؤں کو لیے

یا تو مَیں خود تھا اسیرِ ہست و بود
یا پھنسا خود میرے ہاں آ کر وجود

چاک یہ نیلا تتق میں نے کیا؟
یا ہوں فلکی یا فلک خود ہے مرا

سینۂ گردوں میں میرا دل ہے یا
میرے دل میں آسماں خود آ بسا

میرے اندر ہے کہ باہر، ہے کہاں؟
کیا ہے ویسا ہی یہ جیسا ہے عیاں؟

اڑتے اڑتے طے کیا اک آسماں
آ گیا پھر سامنے دیگر جہاں

اک جہاں باکوہ و دشت و بحر و بر
اپنی دنیا سے وہ دنیا کہنہ تر

گیس کا تشکیل دادہ اک جہاں
دستِ بردِ آدمی سے بے اماں

نقش اس کی لوح پر کوئی نہیں
کوئی فطرت پر نہیں تھا نکتہ چیں

بولا رومی سے یہ صحرا خوب ہے
یہ کہستاں اور یہ دریا خوب ہے

زندگی کا گو نہیں ظاہر نشاں
یہ کہاں سے آئی آوازِ اذاں؟

بولے رومی یہ ہے ملکِ اولیاؑ
یہ بھی ساتھی ہے جہانِ خاک کا

جبکہ آدم خلد سے رخصت ہوئے
اک دو دن آ کر یہاں ٹھہرے رہے

ایں فضا ہا سوز آہش دیدہ است نالہ ہائے صبحگاہش دیدہ است
زائرانِ ایں مقامِ ارجمند پاک مرداں از مقاماتِ بلند
پاک مرداں چوں فضیلؔ و بوسعیدؔ عارفاں مثلِ جنیدؔ و بایزیدؔ

خیز تا مارا نماز آید بدست
یک دو دم سوز و گداز آید بدست"

رفتم و دیدم دو مرد اندر قیام مقتدی تاتار و افغانی امام
پیر رومی ہر زماں اندر حضور طلعتش برتافت از ذوق و سرور
گفت "مشرق زیں دو کس بہتر نزاد ناخنِ شاں عقدہ ہائے ما کشاد
سیّد السادات مولیٰنا جمالؔ زندہ از گفتارِ او سنگ و سفال
تُرک سالار آں حلیمِ دردمند فکرِ او مثلِ مقامِ او بلند

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنّت است"

قرأتِ آں پیرِ مردِ سخت کوش سورۂ والنجم و آں دشتِ خموش!
قرأتے کز وے خلیلؑ آید بوجد روحِ پاکِ جبرئیل آید بوجد!
دل ازو در سینہ گردد ناصبور شورِ الّا اللہ خیزد از قبور!
اضطرابِ شعلہ بخشد دُود را سوز و مستی می دہد داؤدؑ را

آشکارا ہر عنیاب از قرأتش
بے حجاب ام الکتاب از قرأتش!

واقف ان کے سوز سے ہے یہ فضا — ہے فغانِ صبح سے بھی آشنا
اس مقامِ خاص کے زائر تمام — ہیں بڑے مردانِ نیک، عالی مقام
با سعادت جوں فضیلؒ و بوسعیدؒ — عارفاں مثلِ جنیدؒ و بایزیدؒ

اُٹھ ذرا چل کر ادا کر لیں نماز
دو گھڑی حاصل کریں سوز و گداز

مَیں نے دیکھے مرد دو اندر قیام — مقتدی تاتاری، افغانی امام
پیرِ رومی ہر گھڑی وقفِ حضور — چہرے پر تابانیٔ ذوق و سرور
شرق میں بہتر نہیں ان سے کوئی — شرق کے عقدہ کشا[2] دو ہیں یہی
سیّد السادات مولیٰنا جمالؒ — زندہ ان کی بات سے سنگ و سفال
اور وہ تُرکوں کا سالارِ سلیم — صاحبِ فکر رسا، ذوقِ سلیم

ساتھ ایسوں کے دو رکعت بندگی
ورنہ ہر خلد عرق ریزی سبھی

قرأتِ قرآں و مردِ سخت کوش! — سورۂ والنجم اور دشتِ خموش!
قرأتِ ایسی، وجد فرمائیں خلیلؑ — مست جس سے روحِ پاک جبرئیلؑ!
اس سے دل سینوں کے اندر ناصبور — جس سے الا اللہ کا شور اندر قبور!
بخشے شعلوں کی تڑپ جو دُود کو — سوز و مستی دیوے جو داؤدؑ کو

آشکارا ان کی قرأت سے غیاب
اس سے روشن معنیٔ ام الکتاب

من ز جا برخاستم بعد از نماز دستِ او بوسیدم از راہِ نیاز
گفت رومی "ذرۂ گردوں نورد! در دلِ او یک جہانِ سوز و درد!
چشم جز بر خویشتن نکشادۂ دل بکس ندادۂ آزادۂ

تند سیر اندر فراخائے وجود
من ز شوخی گویم او را زندہ رود"

افغانی

زندہ رود! از خاکدانِ ما بگوئے از زمین و آسمانِ ما بگوئے
خاکی و چوں قدسیاں روشن بصر! از مسلماناں بدہ ما را خبر!

زندہ رود

در ضمیرِ ملّتے گیتی شکن دیدہ ام آویزشِ دین و وطن!
روح در تن مردہ از ضعفِ یقین ناامید از قوتِ دینِ مبین
تُرک و ایران و عرب مستِ فرنگ ہر کسے را در گلو شستِ فرنگ
مشرق از سلطانیٔ مغرب خراب اشتراک از دین و ملّت برده تاب!

اس جگہ سے اُٹھ گیا بعدِ نماز — ہاتھ ان کے چومے از راہِ نیاز
بولے رومی یہ ہے اک گردوں نورد — اس کے دل میں اک جہانِ سوز و درد
مست خود میں غیر سے بیگانہ ہے — اک اکیلا، رنگ آزادانہ ہے
تیز رو ہے یہ بہ پہنائے وجود
نام اسے میں نے دیا ہے زندہ رود"

افغانی

بول زندہ رود احوالِ جہاں — کیسے ہیں اپنے زمین و آسماں؟
خاکی اور چوں قدسیاں روشن بصر — دے مسلمانانِ عالم سے خبر

زندہ رود

ملّتِ بیضا کہ تھی گیتی شکن — آج ہے سرگشتۂ دین و وطن
کم یقیں، اس کے بدن میں جاں نہیں — قوتِ دیں کا نہیں اس کو یقیں
"تُرک و ایران و عرب مستِ فرنگ" — ہے گلے میں سب کے اک شستِ فرنگ
غرب کی شاہی سے مشرق ہے خراب — اشتراکیت سے دیں بے آب و تاب

افغانی

دین و وطن

لُردِ مغرب آں سراپا مکر و فن — اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن
او بفکرِ مرکز و تو در نفاق — بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت — دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت
چیست دیں برخاستن از روئے خاک — تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک!
می نگنجد آنکہ گفت اللہ ہو — در حدودِ ایں نظامِ چار سُو
پرّ کہ از خاک و برخیزد ز خاک — حیف اگر در خاک میرد جانِ پاک!
گرچہ آدم بر دمید از آب و گل — رنگ و نم چوں گُل کشید از آب و گل
حیف اگر در آب و گل غلطد مدام — حیف اگر برتر نپرّد زیں مقام!
گفت تن در شو بخاکِ رہگذر — گفت جاں پہنائے عالم را نگر!
جاں نگنجد در جہات اے ہوشمند — مردِ حُر بیگانہ از ہر قید و بند

حُر ز خاکِ تیرہ آید در خروش
زانکہ از بازاں نیاید کارِ موش!

افغانی

دین و وطن

آہ! وہ لُردِ فرنگی پر فتن — اہلِ دیں کو دیتا ہے درسِ وطن
مرکزیت ان کی دھن تیری نفاق — ترک کر شام و فلسطین و عراق
تجھ میں ہے گر کچھ تمیزِ خوب و زشت — کھو نہ جا اندر کلوخ و سنگ و خشت
دین کیا ہے؟ رستگاری خاک سے — اور علاقہ خود کا جانِ پاک سے
وہ کہ جس کی جاں میں ہے 'اللہ ھو' — ہو نہیں سکتا اسیرِ چار سو
تن کا خاکی، خاک سے ہو جائے پاک — حیف! مٹی میں کرے گر جاں ہلاک
آب و گِل سے گو ہے پیدا آدمی — تا بہ حدِ رنگ و بو ہود و ستی
حیف اگر رہ جائے آب و گِل مدام — حیف اگر پائے نہ وہ بہتر مقام
تن کا کہنا یہ کہ ہو جا خاک راہ — جان کہے ہو سارے عالم پر نگاہ
جاں ہے آزادِ جہات اے ہوشمند — مردِ حُر کیا جانے کوئی قید و بند

خاک کی صحبت سے حُر نالاں مدام
باز کر سکتے نہیں چوہوں کا کام

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن
ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن

باوطن اہلِ وطن را نسبتے است
زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است

اندریں نسبت اگر داری نظر
نکتۂ بینی ز مو باریک تر

گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلّی ہائے شوخ و بے حجاب

در تب و تاب است از سوزِ دروں
تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں

بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست!

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است!

مشتِ گل وہ جس کو کہتے ہیں وطن نام جس کے مصر و ایران و یمن
قوم کو نسبت وطن سے ہے یہی اس کی مٹی سے نمود اس کی ہوئی
غور فرمائے اگر اس بات پر پائے نکتہ بال سے باریک تر
ہوتا ہے مشرق سے پیدا آفتاب خوب دکھلاتا ہے اپنی آب و تاب
جہد ہے ہر وقت سورج کی یہی مشرق و مغرب سے تا ہو وہ بری
مستِ خود مشرق سے ہو کر جلوہ گر چھائے رہتا ہے تمام آفاق پر

مشرق و مغرب سے ہے آزاد وہ
گو ہے شرقی، ہر جگہ آباد وہ

اشتراک و ملوکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیلؑ — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیلؑ
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — 'قلبِ او مومن دماغش کافر است'
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را!
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بتن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است!

ہم ملوکیت بدن را فربہی است — سینۂ بے نورِ او از دل تہی است!
مثلِ زنبورے کہ بر گل می چرد — برگ را بگذارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں — بر جمالش نالۂ بلبل ہماں
از طلسم و رنگ و بوئے او گذر — ترکِ صورت گوے و در معنی نگر

اشتراک و ملوکیت

"صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیلؑ" یعنی وہ پیغمبرِ بے جبرئیلؑ
کفر میں اس کے ہی حق مضمر ابھی دل ہے مومن، ذہن رہنِ کافری
دیں سے مغرب کو نہیں کچھ واسطہ ڈھونڈتا ہے پیٹ میں جانِ صفا
تن سے رنگ و بو نہ لے گی جانِ پاک تن پہ ہے مرکوز ذہنِ اشتراک
اشتراکیت کو کیا ہے حق کا پاس ہے مساواتِ شکم اس کی اساس

دل کے اندر ہے اخوت کا مقام
دل میں بیج اس کا ہے کیا مٹی سے کام

بادشاہت بھی ہے تن کی فربہی ہے یہاں بھی قلب سے سینہ تہی
کاروبار اس کے سبھی زنبور سے ترکِ گل کرتا ہے رس کو چوس کے
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل وہی دھن اسی کی نالۂ بلبل وہی
"طلسمِ رنگ و بو کو چھوڑ کر پھول کے باطن پہ تھوڑا غور کر

مرگِ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گُل مخواں او را کہ در معنی گِل است!

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناش آدم فریب!

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج!

ایں بہ علم و دیں و فن آرد شکست
آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست

غرق دیدم ہر دو را در آب و گِل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل!

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن!

مرگِ باطن دیکھنے کو کیوں ملے ؟
بس یہ رگ ہے گُل نہ کہئے گا اسے

ناشکیبا جان دونوں کی سدا دشمنِ خلق اور خدا ناآشنا
زندگی اس کو خروج، اس کو خراج دو سِلوں کے درمیاں آدم زجاج
علم و دیں و فن کے حربے اس کے ہاتھ چھین لیتا ہے وہ جاں روٹی کے ساتھ
مَیں انہیں پاتا ہوں غرقِ آب و گِل ہیں چمکدار ان کے تن تاریک دل

ہے مٹانا اور بنانا زندگی
تخمِ دل گِل میں اُگانا زندگی

سعید حلیم پاشا

شرق و غرب

غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود — نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ — عشق را با زیرکی آمیزہ دہ
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست — چشمِ شاں صاحب نظر دل مردہ ایست!
زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش — بسمل افتادند چوں نخچیرِ خویش!
سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں — عصرِ دیگر نیست در افلاکِ شاں!

زندگی را سوز و ساز از نارِ تست
عالمِ نو آفریدن کارِ تست!

مصطفیٰ کو از تجدّد می سرود — گفت نقشِ کہنہ را باید زدود
تو نگردد کعبہ را رختِ حیات — گر ز افرنگ آیدش لات و منات

حلیم سعید پاشا

مشرق و مغرب

ہوشیاری اہلِ مغرب کا شعار — عشق سے مشرق دو جگ کا رازدار
عقل زورِ عاشقی سے حق شناس — عشق کے کام عقل سے محکم اساس
عاشقی و عقل باہم ہوں اگر — ہو گی پیدا ان سے اک دنیا دگر
اٹھ جہانِ نو کا اک خاکہ بنا — زیر کی اور عشق کو باہم ملا
شعلۂ اہلِ فرنگ نم خوردہ ہے — آنکھ روشن اُن کی اور دل مردہ ہے
زخم انہوں نے کھائے اپنی تیغ کے — بن کے خود نخچیر بسمل ہو گئے
سوز و مستی تاک میں ان کے کہاں؟ — عصرِ نو افلاک میں ان کے کہاں؟

سوزِ جاں بھی ساز تیری آگ سے
انقلاب عالم میں لانا ہے تجھے

مصطفےٰ کو جب تجدد بھا گیا — نقشِ کہنہ کے مٹانے کو کہا
کعبے کو ممکن نہیں تازہ حیات — لائیں گر افرنگ سے لات و منات

تُرک را آہنگِ نو در چنگ نیست — تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست
سینۂ او را دمے دیگر نبود — در ضمیرش عالمے دیگر نبود
لاجرم با عالمِ موجود ساخت — مثلِ موم از سوزِ ایں عالم گداخت
طرفگیہا در نہادِ کائنات — نیست از تقلید تقویمِ حیات
زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور — جانش از تقلید گردد بے حضور
چوں مسلماناں اگر داری جگر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست!
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است — گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست!

چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش!

زندہ رود

ز ورقِ ماخاکیاں بے ناخداست
کس نداند عالمِ قرآں کجاست!

افغانی

عالمے در سینۂ ما گم ہنوز — عالمے در انتظارِ قم ہنوز

نَے میں تُرکوں کی کہاں تازہ نوا — کہنۂ مغرب ہی ہے اُن کو نیا
اس کے سینہ میں دمِ دیگر نہ تھا — اس کے دل میں عالمِ دیگر نہ تھا
وقت کے دھارے میں آخر بہہ گیا — نرم گویا موم ہو کر رہ گیا
تازہ کاری سے ہے قائم کائنات — نقل کیوں ہو وجہِ تقویمِ حیات؟
زندہ دل خلاقِ اعصار و دہور — خوگرِ تقلید ہو تو بے حضور
حوصلہ ہے تجھ میں مومن کا اگر — معنیٔ قرآن و دل پر رکھ نظر
آیتوں میں اس کی ہیں صد ہا جہاں — اس کے لمحوں میں زمانے ہیں نہاں
بس ہے دنیا کو زمانہ اک نیا — لا جو ہے سینہ میں دل مغز آشنا
بندۂ مومن بھی ہے حق کا نشاں — اس کے تن پر جوں قبا ہے ہر جہاں
جب بھی ہو جاتا ہے بوسیدہ جہاں
دیتا ہے قرآن ز خود تازہ جہاں

زندہ رود

کشتیٔ انسان ہے اب بے ناخدا
کون جانے عالمِ قرآں ہے کیا!

افغانی

وہ نیا عالم ہے اپنے دل میں گم — کون ہے جو دے سکے آوازِ قُم

عالمے بے امتیازِ خون و رنگ — شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید — چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر — تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ!
لایزال و واردا تش نَو بنَو — برگ و بارِ محکماتش نَو بنَو
باطنِ او از تغیر بے غمے — ظاہرِ او انقلاب ہر دمے

اندرونِ تست آں عالم نگر
می دہم از محکماتِ او خبر!

ایک عالم بے تمیزِ خون و رنگ — شام اس کی غیرتِ صبحِ فرنگ
عالم، اک بندہ نہ کوئی شہریار — جیسے دل مومن کا ناپیدا کنار
وہ جہانِ جاں فزا فیضِ نظر! — جس سے روشن کی گئی جانِ عمرؓ
تازہ تازہ اس کی ہر دم واردات — تا ابد جاری بہارِ محکمات
اس کا دل دردِ تغیّر سے بری — اس کا ظاہر انقلاب اک ہر گھڑی

تیرے باطن میں ہے وہ عالم نہاں
آ کروں اب محکمات اس کے بیاں

محکمات عالمِ قرآنی

۱۔ خلافتِ آدم

در دو عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرّے از اسرارِ عشق

سرِّ عشق از عالمِ ارحام نیست
او ز شام و روم و شام نیست

کوکبے بے شرق و غرب و بے غروب
در مدارش نے شمال و نے جنوب

حرفِ اِنّی جاعلٌ تقدیرِ او
از زمیں تا آسماں تفسیرِ او!

مرگ و قبر و حشر و نشر احوالِ اوست
نور و نارِ آں جہاں اعمالِ اوست

او امام و او صلوات و او حرم
او مداد و او کتاب و او قلم!

خردہ خردہ غیب او گردد حضور
نے حدود او را نہ ملکش را ثغور

از وجودش اعتبارِ ممکنات
اعتدالِ او عیارِ ممکنات

من چہ گویم از یمِ بے ساحلش
غرقِ اعصار و دہور اندر دلش!

آنچہ در آدم بگنجد عالم است
آنچہ در عالم نگنجد آدم است!

محکماتِ عالمِ قرآنی

۱۔ خلافتِ آدم

دو جہاں میں ہر کہیں آثارِ عشق
ہے بشر بھی شاملِ اسرارِ عشق

عشق ناوابستہ ہے ارحام سے
پاک سام و حام و روم و شام سے

کوکبِ اک بے شرق و غرب و بے غروب
اس کا محور بے شمال و بے جنوب

تاجِ اِنّی جاعِلٌ کا اس کے سر
اس کی تفسیر آسمان و بحر و بر

حال اس کے حشر و نشر و گور، اجل
اصل نور و نار خود اس کے عمل

وہ عبادت وہ امام اور وہ حرم
وہ سیاہی وہ کتاب اور وہ قلم

رفتہ رفتہ ہو گا غیب اس کا حضور
خود بلاحد، ملک اس کا بے ثغور

اس کے باعث اعتبارِ ممکنات
اعتدال اس کا عیارِ ممکنات

کیا بتاؤں اس کا بحرِ بیکراں!
غرق ہیں کتنے زمانے اس کے ہاں!

آدمی میں گم جو ہو عالم وہی
جو محیطِ عالم پہ ہو آدم وہی

آشکارا مہر و مہ از جلوتش نیست رہ جبریلؑ را در خلوتش!

برتر از گردوں مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست عشقِ یک بیں در تماشائے دوئی است!
مرد و زن وابستۂ یک دیگر اند کائناتِ شوق را صورت گر اند!
زن نگہ دارندۂ نارِ حیات فطرتِ او لوحِ اسرارِ حیات!
آتشِ ما را جانِ خود زند جوہرِ او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکناتِ زندگی از تب و تابش ثباتِ زندگی
شعلۂ کز دے شرر ہا در گسست جان و تن بے سوز او صورت نہ بست
ارجِ ما از ارجمندیہائے او ماہمہ از نقشبندیہائے او!

حق ترا داد است اگر تابِ نظر
پاک شو قدسیّتِ او را نگر

اے ز دینت عصرِ حاضر بردہ تاب فاش گویم با تو اسرارِ حجاب
ذوقِ تخلیق آتشے اندر بدن از فروغِ او فروغِ انجمن!
ہر کہ بر دارد ازیں آتش نصیب سوز و سازِ خویش را گردد رقیب
ہر زماں بر نقشِ خود بندد نظر تا نگیرد لوحِ او نقشِ دگر
مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ ما را در دلِ او ریختند ملّتے از خلوتش انگیختند

چاند سورج اس کی جلوت کی دلیل بندہ ہے خلوت برائے جبرئیلؑ

چرخ سے افضل ہے آدم کا مقام
اصلِ تہذیب آدمی کا احترام

کچھ خبر ہے چیز کیا ہے زندگی عشقِ یک بیں کا تماشائے دوئی
مرد و زن کی باہمی وابستگی اس کے باعث دہر کی صورت گری
زن سے روشن ہے سدا نارِ حیات اس کی فطرت لوحِ اسرارِ حیات
آگ ہماری خود سمالیتی ہے وہ خاک کو آدم بنا دیتی ہے وہ
اس میں پنہاں زندگی کے ممکنات زندگی کو اس کی تابش سے ثبات
ٹوٹتے ہیں اس کے شعلے سے شرر سرد پڑ جائے تو کیوں ہو نقش گر
اس کی حرمت سے ہمارا احترام نقش بندی سے اسی کی ہم تمام

تیری قسمت میں ہے بینائی اگر
پاک بن، پاکی پہ اس کی کر نظر

اے کہ چھینی عصرِ نو نے تیری تاب آ بتاؤں تجھ کو اسرارِ حجاب
ذوقِ خلقت جیسے آگ اندر بدن روشنی سے اس کی روشن انجمن
جس کسی کو ہو گی یہ آتش نصیب ہو گا خود اپنے ہی ساماں کا رقیب
خود محافظ ہو گا اپنے نقش کا تا نہ ہو ثبت اس پہ نقشہ دوسرا
تھے حرا میں بند تنہا مصطفےٰؐ مدتوں چہرہ نہ دیکھا غیر کا
اُنؐ کے دل میں نقش تب ڈالا گیا ایک ملّت کا ظہور اس سے ہوا

می توانی منکرِ یزداں شدن — منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن
گرچہ داری جانِ روشن چوں کلیمؑ — ہست افکارِ تو بے خلوت عقیم!

از کم آمیزی تخیل زندہ تر
زندہ تر جوئندہ تر یابندہ تر!

علم و ہم شوق از مقاماتِ حیات — ہر دو می گیرد نصیب از واردات!
علم از تحقیق لذت می برد — عشق از تخلیق لذت می برد
صاحبِ تحقیق را خلوت عزیز — صاحبِ تخلیق را خلوت عزیز
چشمِ موسیٰؑ خواست دیدارِ وجود — ایں ہمہ از لذّتِ تحقیق بود
لن ترانی نکتہ ہا دارد دقیق — اندکے گم شو دریں بحرِ عمیق
ہر کجا بے پردہ آثارِ حیات — چشمہ زارش در ضمیرِ کائنات
در نگر ہنگامۂ آفاق را — زحمتِ جلوت مدہ خلّاق را

حفظ ہر نقش آفریں از خلوت است
خاتمِ او را نگیں از خلوت است

یوں تو انکارِ خدا کو ہے جگہ — کون کر سکتا ہے انکار آپؐ کا
جان تری روشن سہی مثلِ کلیمؑ — ہو گی تیری فکر بے خلوت عقیم
ہو گا خلوت سے تخیل زندہ تر
'زندہ تر جوینده تر یابنده تر'

دونوں علم و عشق شانِ زندگی — مورِدِ فیضانِ ربّ ہیں دونوں ہی
علم تحقیقات سے ہے شاد و کام — عشق تخلیقات سے ہے شاد کام
صاحبِ تحقیق کو جلوت عزیز — صاحبِ تخلیق کو خلوت عزیز
تھی طلب موسیٰؑ کی دیدارِ وجود — لذّتِ تحقیق کی تھی وہ نمود
لَن تَرانِی میں نہاں نکتے دقیق — غوطہ کھا کر دیکھ یہ بحرِ عمیق
ہر کہیں ہیں فاش آثارِ حیات — ان کا سرچشمہ ضمیرِ کائنات
دیکھ تو ہنگامۂ آفاق کو — زحمتِ جلوت نہ دے خلاق کو
حفظِ ہر نقش آفریں خلوت سے ہے
مہر پر اس کے نگیں خلوت سے ہے

۲۔ حکومتِ الٰہی

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبود ہمہ
عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف — وصل و فصلش لا یُراعی لا یُخاف
غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود — زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیرِ گردوں آمری از قاہری است
آمری از ماسوا اللہ کافری است

قاہرِ آمر کہ باشد بختہ کار — از قوانین گردِ خود بندد حصار
جرّہ شاہیں تیز چنگ و زود گیر! — صعوہ را در کارہا گیر و مشیر
قاہری را شرع و دستورے دہد — بے بصیرت سرمہ با کورے دہد!

۲۔ حکومتِ الٰہی

بندۂ حق کو کہاں فکرِ مقام! غیر کا بندہ، نہ غیر اس کے غلام
بندۂ حق بندۂ آزاد ہے ملک و آئیں اس کے حق کی داد ہے
حق سے اس کے رسم و راہ و دین بھی نیش و نوش و نیک و بد اس سے سبھی
عقل خود بیں جانے کیا بہبود غیر سود سے اپنے غرض، کیا سود غیر
سود سب کا وحیِ حق کا مقتضا سود اور بہبودِ خلقِ کبریا
جنگ ہو یا صلح اس کی راہ عدل بے لحاظ و خوف وقتِ وصل و فصل
دہر میں ہو غیرِ حق گر حکمراں زور ور کے ہوں گے عاجز ناتواں

قاہری پر منحصر ہے آمری
ما سوا کی آمری ہے کافری

قاہر آمر اگر ہو پختہ کار گردِ خود کرے گا قانونی حصار
تُرّہ شاہیں تیز چنگ و زود گیر، کر لیا کرتا ہے چڑیا کو مشیر
ڈھالے قانوں قاہری کے واسطے بے بصیرت سرمہ جوں اندھے کو دے

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک ؟
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک !

وائے بر دستورِ جمہورِ فرنگ — مردہ تر شد مردہ از صورِ فرنگ !
حقہ بازاں چوں سپہرِ گرد گرد — از امم بر تختۂ خود چیدہ نرد !
شاطراں ایں گنج و رآں رنج بر — ہر زماں اندر کمینِ یک دگر
فاش باید گفت سرِّ دلبراں — ما متاع و این ہمہ سوداگراں !
دیدہ ہا بے نم ز حُبِّ سیم و زر — مادراں را بارِ دوش آمد پسر
وائے بر قومے کہ از بسیمِ ثمر — می برد نم را ز اندامِ شجر !
تا نیارد زخمہ از تارش سرود — می کُشد نازادہ را اندر وجود !
گرچہ دارد شیوہ ہائے رنگ رنگ — من بجز عبرت نگیرم از فرنگ !

اے بہ تقلیدش اسیر آزاد شو
دامنِ قرآں بگیر آزاد شو !

ہے یہی انجامِ دستورِ شہی
خوار دہقاں، وہ خدا کو فرزہی

حیف یہ دستورِ جمہورِ فرنگ — مار ہے مردے پہ بھی صورِ فرنگ
وہ کھلاڑی جوں سپہرِ گرد گرد — ملتیں تختہ پر ان کے مثلِ نرد
شاطراں وہ گنج اُسے اور رنج اِسے — اک دگر کی گھات میں دونوں لگے
کیوں نہ کہدوں راز میں ان کے عیاں — ہم متاع ان کے لئے وہ تاجراں
آنکھ بے نم ان کو حرصِ سیم و زر — بوجھ خود ماں کے لئے اس کا پسر
روئیے اس قوم کی تقدیر پر — پھل کے ڈر سے خشک کر دے جو شجر
تار سے پیدا نہ ہو تا سُر کوئی — مار دیتے ہیں اسے نازادہ ہی
گو ہے رنگارنگ یورپ کی فضا — کچھ نہ پایا میں نے عبرت کے سوا

ترک کر تقلید کو آزاد ہو
بن کے حُر اب تھام لے قرآن کو

۳۔ ارض ملکِ خداست

سرگذشتِ آدم اندر شرق و غرب
بہرِ خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب!

یک عروس و شوہرِ او ماہمہ
آں فسونگر بے ہمہ ہم با ہمہ!

عشوہ ہائے او ہمہ مکر و فن است
نے ازانِ تو نہ از آنِ من است!

در نساز د با تو ایں سنگ و حجر
ایں ز اسبابِ حضر تو در سفر!

اختلاطِ خفتہ و بیدار چیست؟
ثابتے را کار با سیّار چیست؟

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

دہ خدایا! نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را بگیر

صحبتش تا کے تو بود و او نبود
تو وجود و او نمودِ بے وجود

تو عقابی طائفِ افلاک شو
بال و پر بکشا و پاک از خاک شو

باطنُ الارضُ للہ، ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

۲۔ زمیں خدا کی مِلک ہے

عالم انسانوں کا اندر شرق و غرب
ملک گیری کی ہوس میں حرب و ضرب

اک عروس اور اس کے خواہاں ہم سبھی
ساحرہ وہ سب کے ساتھ اور دور بھی

مکر و فن وہ عشوہ ہائے دل نشیں
میری تیری وہ کسی کی بھی نہیں

تیرے لائق کب ہیں یہ سنگ و حجر
تو مسافر اور یہ سامانِ حضر

ربط کیسا خفتہ و بیدار میں
کیا ہے نسبت ثابت و سیّار میں ؟

جز متاعِ حق نے زمیں کو کیا کہا؟
مفت ہے مفت یہ متاعِ بے بہا

مجھ سے پالے نکتہ یہ اے وہ خدا
لے کے رزق و گور اس سے ہاتھ اٹھا

کیسی یہ صحبت تُو بود اور وہ نبود
تُو وجود اور وہ نمودِ بے وجود

تو ہے شاہیں آسماں کی سیر کر
خاک سے رکھ پاک اپنے بال و پر

معنیٔ اَلْاَرْضُ لِلّٰہ، ہے صریح
منکر اس ظاہر کا ہے کافر صحیح

من نگویم در گذر از کاخ و کوے — دولتِ تست ایں جہانِ رنگ و بوے
دانہ دانہ گوہر از خاکش بگیر — صید چوں شاہیں ز افلاکش بگیر
تیشۂ خود را بکہسارش بزن — نورے از خود گیر و بر نارش بزن
از طریقِ آذری بیگانہ باش — بر مرادِ خود جہانِ نو تراش!
دل بر نگ و بوے و کاخ و کو مدہ — دلِ حریم اوست جز با او مدہ!
مردنِ بے برگ و بے گور و کفن؟ — گم شدن در نقرہ و فرزند و زن!
ہر کہ حرفے لا الہ از بر کند — عالمے را گم بخویش اندر کند

فقر جوع و رقص و عریانی کجاست
فقر سلطانی است ہبانی کجاست

مَیں نہ بولوں چھوڑ تو یہ کاخ و کو — تیری دولت ہے جہانِ رنگ و بو
چن کے لے گوہر تو اس کی خاک سے — مثلِ شاہیں صید لے افلاک سے
ضربِ تیشہ سے لگا کہسار پر — مار لے کر نورِ اپنا نار پر
رسم و راہِ بُت گری سے ہاتھ اٹھا — حسبِ خواہش اپنی دنیا خود بنا
رنگ و بو، یہ کاخ و کو کس کام کے — دل خدا کا گھر ہے غیروں کو نہ دے
موت بے سامان و بے گور و کفن؟ — ہو نا محوِ نقرہ و فرزند و زن
جو یقینِ لا الٰہ محکم کرے — جذبِ خود میں وہ سبھی عالم کرے

فقر، فاقہ، رقص و عریانی کہاں؟
فقر سلطانی ہے رہبانی کہاں؟

۴۔ حکمت خیرِ کثیر است

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر
ہر کجا این خیر را بینی بگیر

علم حرف و صوت را شہپر دہد
پاکیِ گوہر بہ ناگوہر دہد

علم را بر اوجِ افلاک است رہ
تا ز چشمِ مہر بر کند د نگہ

نسخۂ او نسخۂ تفسیرِ کل
بستۂ تدبیرِ او تقدیرِ کل

دشت را گوید حبابے دہ دہد
بحر را گوید سرابے دہ دہد!

چشمِ او بر واردات کائنات
تا بہ بیند محکماتِ کائنات

دل اگر بندد بہ حق، پیغمبری است
ور ز حق بیگانہ گردد کافری است!

علم را بے سوزِ دل خوانی شر است
نورِ او تاریکیِ بحر و بر است

عالمے از غازِ او کور و کبود
فرو دینش برگ ریزِ ہست و بود

بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ
از بمِ طیارۂ او داغ داغ!

سینۂ افرنگ را نارے از وست
لذتِ شبخون و یلغارے از وست

سیرِ واثر و نے دہد ایام را
می برد سرمایۂ اقوام را!

۴۔ حکمت خیرِ کثیر ہے

حق نے حکمت کو کہا خیرِ کثیر
لے، جہاں بھی مل سکے اے راہ گیر

علم حرف و صوت کو دیتا ہے پَر
سنگ پارہ اُس سے تا بندہ گہر

علم کی افلاک پر ہے رہگذر
تاکہ چھینے بڑھ کے سورج سے نظر

اس کا نسخہ، نسخۂ تفسیرِ کُل
اس کی ہی تدبیر سے تقدیرِ کُل

وہ جو مانگے دشت سے مل جائے آب
وہ بنا سکتا ہے دریا کو سراب

چھانتا ہے اندرونِ کائنات
دیکھنے رازِ دورنِ کائنات

حق رسا ہو وہ تو ہے پیغمبری
حق سے ہو بیگانگی تو کافری

سوزِ دل جس میں نہ ہو وہ علم شر
تیرہ اس کی روشنی سے بحر و بر

دھند سے اس کی سب عالم پر دھواں
باغِ ہستی کو بہار اس کی خزاں

بحر و دشت و کوہسار و باغ و راغ
اس کے طیاروں کے بم سے داغ داغ

جوششِ افرنگ کا باعث وہی
اس سے شبخوں، اس سے نوبت جنگ کی

پیچ الٹی دے کے خود ایّام کو
لوٹنے لگتا ہے وہ اقوام کو

قوتش ابلیس را یارے شود — نور نار از صحبتِ نارے شود
کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است!
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی
از جلال بے جمالے الاماں — از فراقِ بے وصالے الاماں!
علم بے عشق است از طاغوتیاں — علم با عشق است از لاہوتیاں!
بے محبت علم و حکمت مردۂ — عقل تیرے بر ہدف ناخوردۂ
کور را بینندہ از دیدار کن
بولہب را حیدرِ کرّار کن!

زندہ رود

محکماتش وا نمودی از کتاب — ہست آں عالم ہنوز اندر حجاب!
پردہ را از چہرہ نکشاید چرا — از ضمیرِ ما بروں ناید چرا
پیشِ ما یک عالمِ فرسودہ ایست — ملّت اندر خاکِ او آسودہ ایست
رفت سوزِ سینۂ تاتار و کُرد — یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد!

اس کی قوت دوست دار ابلیس کی — شر سے مل کر ہو گیا شر خیر بھی
مارنا ابلیس کو مشکل مگر — چوں کہ گہرائی ہے دل کی اس کا گھر
اِس سے بہتر جا مسلماں کر اُسے — کشتۂ شمشیرِ قرآں کر اُسے
توبہ توبہ! یہ جلالِ بے جمال — توبہ توبہ! یہ فراقِ بے وصال
علم طاغوتی تہی از عاشقی — عشق سے وابستہ، لاہوتی وہی
بے محبت علم جیسے مردہ ہے — عقل کا پیکاں ہدف ناخوردہ ہے

بے بصر کو دید سے کر بابصر
بولہب کو حیدرؓ کرار کر

زندہ رود

محکمات اس کے کیے فاش از کتاب — پردہ عالم ہے ابھی اندر حجاب
پردہ اس کے رُخ سے کیوں اٹھتا نہیں — ہے دلوں میں جب یہ کیوں پیدا نہیں
ہم جس عالم میں ہیں وہ فرسودہ ہے — ملّت اس کی خاک میں آسودہ ہے
سرد کُرد و تُرک سب کو کر دیا — یا مسلماں یا کہ قرآں مر گیا؟

سعید حلیم پاشا

دینِ حق از کافری رسواتر است — زانکہ ملّا مومنِ کافرگر است!
شبنمِ مادر نگاہِ مایم است — از نگاہِ اویم ما شبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روحِ الامیں را در خروش!
زانسوئے گردوں دلش بیگانۂ — نزدِ او ام الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ — آسمانش تیرہ از بے کوکبی!
کم نگاہ و کور ذوق و بہرہ گرد — ملّت از قال و اقولش فرد فرد!
مکتب و ملّا و اسرارِ کتاب — کورِ مادرزاد و نورِ آفتاب!

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد!

مردِ حق جانِ جہانِ چار سوئے — آں بخلوت رفتہ را از من بگوئے
اے ز افکارِ تو مومن را حیات — از نفسہائے تو ملّت را ثبات
حفظِ قرآنِ عظیم آئینِ تست — حرفِ حق را فاش گفتن دینِ تست
تو کلیمی چند باشی سرنگوں — دستِ خویش از آستیں آور برروں
سرگذشتِ ملّتِ بیضا بگوئے — با غزالاں از وسعتِ صحرا بگوئے

سعید حلیم پاشا

کفر سے دین اپنا رسوا تر ہوا
اپنا ملّا خود جو کافر گر ہوا

اپنی شبنم بھی ہمیں یم کی مثال
یم ہمارا اس کو شبنم کی مثال

طرفہ معجوں مسلمِ قرآں فروش
جس سے ہیں روح الامیں بھی پُرخروش

حبِّ حق سے اس کا دل بیگانہ ہے
اس کو قرآنِ عظیم افسانہ ہے

وہ نہ جانے حکمتِ دینِ نبیؐ
آسماں تیرہ، نہیں تارہ کوئی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد
اس کی باتوں سے ہے ملّت فرد فرد

مدرسہ، ملّا اور اسرارِ کتاب
جیسے مادر زادہ کور اور آفتاب

"دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد"

جانِ عالم مردِ حق آگاہ کو
جو ہے خلوت کوش اسے پیغام دو

فکر سے تیری ہے مومن کی حیات
تیری سانسوں سے ہے ملّت کو ثبات

حفظِ قرآنِ کریم آئیں ترا
ڈٹ کے سچّی بات کہنا دیں ترا

سرنگوں کب تک تو اے موسیٰؑ بتا
آستیں سے لا ید بیضا ذرا

ماجرائے ملّتِ بیضا سُنا
تُو ہرن کو وسعتِ صحرا دکھا

فطرتِ تو مستنیر از مصطفیٰؐ است
باز گو آخر مقامِ ما کجاست ؟

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بو
مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بو

ہر زماں اندر تنش جانے دگر
ہر زماں او را چو حق شانے دگر

راز ہا با مردِ مومن باز گوے
شرحِ رمزِ "کُلّ یومٍ" باز گوے

جز حریمِ منزل ندارد کارواں
غیرِ حق در دل ندارد کارواں

من نمی گویم کہ راہش دیگر است
کاروان دیگر نگاہش دیگر است!

افغانی

از حدیثِ مصطفیٰؐ داری نصیب ؟
دینِ حق اندر جہاں آمد "غریب"

با تو گویم معنیٔ ایں حرف بکر
غربتِ دیں نیست فقرِ اہل ذکر

بہر آں مردے کہ صاحب جستجو است
غربتِ دیں ندرتِ آیاتِ اوست

غربتِ دیں ہر زماں نوعِ دگر
نکتہ را دریاب اگر داری نظر

دل بآیاتِ مبیں دیگر بہ بند
تا بگیری عصرِ نو را در کمند!

کس نمی داند ز اسرارِ کتاب
شرقیاں ہم غربیاں در پیچ و تاب

روسیاں نقشِ نوی انداختند
آب و نان بردند و دیں درباختند

حق بہ بیں حق گوے و غیر از حق مجوے
یک دو حرف از من بآں ملّت بگوے

تیرے باطن میں ہے نورِ مصطفیٰؐ
فاش کر آخر مقام اپنا ہے کیا!

مردِ حق کو کیا غرض غیروں کی خو — لے گا حق سے مردِ حق سب رنگ و بو
اس کے تن میں ہر زمان جانِ دگر — مثلِ حق ہر لمحہ ہے شانِ دگر
راز کیا ہے اس کا مومن کو بتا — شرحِ رمزِ کُلَّ یَوم، پھر سنا
کارواں کی جز جرس منزل نہیں — اس کے دل میں جذبۂ باطل نہیں
میں نہ بولوں اس کا رستہ ہے دگر — کارواں دیگر، دگر اس کی نظر

افغانی

ہے حدیثِ مصطفیٰؐ تجھ کو نصیب — ہے سب عالم میں یہ دینِ حق غریب
آ بتاؤں تجھ کو یہ غربت ہے کیا! — یہ نہیں ہے فقرِ اہلِ ذکر کا!
اس کو، دُھن جس کو ہے تحقیقات کی — غربتِ دیں، عمدگی آیات کی
غربتِ دینی ہے ہر لمحہ دگر — دیکھ یہ نکتہ جو ہے صاحب نظر
دل کو رکھ وابستہ تو قرآں کے ساتھ — آئے تا باگ عصرِ نو کی اپنے ہاتھ
جانتا ہے کون اسرارِ کتاب؟ — مشرق و مغرب ہیں اندر پیچ و تاب
روسیوں نے بھی بنایا نقشِ نو — آب و ناں پاکر گنوایا دین کو

حق پہ رہ، حق بول، ناحق پر نہ جا
یہ دو باتیں میری ملّت کو سُنا

پیغامِ افغانی باملّتِ روسیّہ

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست!
بندۂ مومن ز قرآں برخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست!
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقشش از ملوکیت گرفت

از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر!

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں — قیصریت را شکستی استخواں
تا برافروزی چراغے در ضمیر — عبرتے از سرگذشتِ ما بگیر
پائے خود محکم گذار اندر نبرد — گردِ ایں لات و ہبل دیگر مگرد
ملّتے می خواہد ایں دنیائے پیر — آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر!

روس کی قوم کو افغانی کا پیغام

منزل و مقصودِ قرآں اور ہے
رسم و آئینِ مسلماں اور ہے

اس کے دل میں آتشِ سوزاں نہیں
جذبِ پیغمبر سے کچھ ساماں نہیں

مومن اب قرآن سے بے بہرہ ہے
اس کے پیمانے میں تلچھٹ بھی نہ ہے

خود طلسمِ قیصری کو توڑ کر
خود ہوا تختِ شہی پر جلوہ گر

تا کرے مضبوط شاہی کی بنا
خود شہی کو شاملِ دیں کر لیا

اور ہو جاتی ہے شاہی میں نظر
عقل و رسم و راہ ہوتے ہیں دگر

طرحِ دیگر کا تو خود باعث ہوا
کیا وہ دستورِ کہن اچھا نہ تھا؟

جوں مسلماں تو نے بھی اندر جہاں
توڑ ڈالیں قیصری کی ہڈیاں

شمع سینوں میں جلانے کیلئے
درسِ عبرت اپنے ماضی سے تو لے

جنگ میں مضبوط پاؤں گاڑ دے
باز آ! لات و ہبل کے طوف سے

چاہتی ہے آج یہ دنیائے پیر
قوم جو خود ہو بشیر و خود نذیر

باز می آئی سوئے اقوامِ شرق — بستہ ایامِ تو باایامِ شرق
تو بجاں افگندۂ سوزِ دگر — در ضمیرِ تو شب و روزے دگر!
کہنہ شد افرنگ را آئین و دیں — سوئے آں دیرِ کہن دیگر مبیں
کردۂ کارِ خداوندان تمام — بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جویندۂ — تا رہِ اثبات گیری زندۂ

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے؟

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب
با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد؟ — مژدۂ 'لا قیصر و کسریٰ' کہ داد؟
در گذر از جلوہ ہائے رنگ رنگ — خویش را دریاب از ترکِ فرنگ!
گر ز مکرِ غربیاں باشی خبیر — رو بہی بگذار و شیری پیشہ گیر
چیست روباہی تلاشِ ساز و برگ — شیر مولا جوید آزادی و مرگ
جز بقرآں ضیغمی روباہی است — فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر — فکر را کامل ندیدم جز بذکر
ذکر ذوق و شوق را دادن ادب — کارِ جاں است ایں نہ کارِ کام و لب
خیزد از وے شعلہ ہائے سینہ سوز — با مزاجِ تو نمی سازد ہنوز

اے شہید شاہدِ رعنائے فکر
با تو گویم از تجلی ہائے فکر

لوٹ آنا ہے سوئے اقوامِ شرق — تو کہ ہے وابستۂ ایامِ شرق
آج تیری جان میں سوز اور ہے — شب تیری دیگر، ترا روز اور ہے
کہنہ ہیں افرنگ کے آئین و دیں — کچھ تجھے اس دیر سے لینا نہیں
ختم آقاؤں کو اپنے کر چکا — چل سوئے اللہ تو کر کے ترکِ لا
ترکِ لا ہے لازمی بہرِ حیات — ہے رہِ اثبات میں تجھ کو ثبات

اے کہ خواہش نظمِ عالم کی تجھے
چاہیئے محکم اساس اس کے لئے

داستانِ کہنہ دھو ڈالی سبھی — لے کتاب اللہ سے اب روشنی
کس نے حبشی کو ید بیضا دیا؟ — مژدۂ لا قیصر و کسریٰ دیا
بھول جا دستورِ رنگا رنگ کو — خود کو پا لے ترک کر افرنگ کو
گر تجھے معلوم ہیں یورپ کے فن — رو بہی کو ترک کر دے شیر بن
کیا ہے دوبارہ تلاشِ ساز و برگ — مردِ حق کو ذوقِ آزادیٔ مرگ
ضیغمی قرآں سے عاری روبہی — فقرِ قرآں اصل میں شاہنشہی
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر، — فکر کو کامل نہ پایا جز بہ ذکر
ذکر؟ ذوق و شوق کو درسِ ادب — کارِ جاں ہے یہ ورائے کام و لب
اس سے پیدا کر تو شعلۂ سینہ سوز — پر ترے قابل نہیں ہے یہ ہنوز

فکر کی رعنائیوں پر تو فدا
فکر کیا ہے تجھ کو بتلاتا ہوں آ!

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ!
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن! — کس نداند لذتِ قرضِ حسن!
از رباجاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ — آدمی درّندہ بے دندان و چنگ!
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امیں، حق مالک است — غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است
رایتِ حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

آب و نانِ ماست از یک مائدہ
دودۂ آدمؑ کنفسِ "واحدہ"

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست!
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پائندہ و گویاست ایں
اندرو تقدیرہائے شرق و غرب — سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ — ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ
آفریدی شرع و آئینے دگر — اندکے با نورِ قرآنش نگر

از بم و زیرِ حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی

کیا ہے قرآں؟ خواجگی کو حکمِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ!
لے نہ اہلِ زر کا کچھ احسان تو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
سود خواری سے ہے فتنوں کو ہوا — کس نے جانا قرضِ حسنہ کا مزا
سود سے دل سخت جاں تاریک تر — ظلم میں بڑھ کر درندوں سے بشر
رزق اپنا خاک سے لینا روا — یہ متاعِ بندہ و مُلکِ خدا
بندۂ مومن امیں، مالک خدا — غیرِ حق جو بھی ہے ہو گا فنا
پرچمِ حق بادشاہوں سے نگوں — شہر میں دخل ان کا وجہِ کشت و خوں

ایک دسترخوان سے سب کو طعام
نفسِ واحد عشرتِ آدم تمام

نظمِ قرآں ز ہریں قائم ہوا — اقتدار کاہن و پاپا مٹا
دل میں جو مضمر ہے کہدوں بے حجاب — اور ہی شی ہے، نہیں ہے یہ کتاب
جاں میں داخل ہو تو جاں ہو جائے اور — جان جو بدلے جہاں ہو جائے اور
جیسے حق پنہاں بھی ہے پیدا بھی ہے — زندہ ہے پائندہ ہے گویا بھی ہے
اس سے وابستہ ہے تقدیرِ جہاں — فکر ہو تیز اس کی جوں برقِ تپاں
اس کا فرماں، جاں ہتھیلی پر رہے — جو ہے حاجت سے فزوں اوروں کو دے
خود تراشی تو نے اک شرعِ دگر — دیکھ قرآں کی نظر سے جانچ کر

ہوں گے واضح سب بمو زیرِ حیات
فاش ہو گی تجھ پہ تقدیرِ حیات

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نوا ہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ در
ذکرِ حق از امّتاں آمد غنی! — از زمان و از مکاں آمد غنی!
ذکرِ حق از ذکرِ ہر ذاکر جدا است — احتیاجِ روم و شام اورا کجاست
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش — پیش قومے دیگرے بگذارد ش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن!

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

بادہ و ساقی سے بزم اپنی تہی ساز قرآں میں ہیں نغمے اور بھی
اپنا زخمہ ہو گیا گر بے اثر آسماں میں ہیں ہزاروں زخمہ ور
ذکرِ حق کو کیا ہے قوموں کی کمی؟ قید ہے کوئی جگہ کی وقت کی؟
ہے ہر اک ذاکر کا ذکرِ حق جدا اس کو آخر قیدِ رسم و شام کیا؟
گر یہ اپنے ہاتھ سے چھن جائے گا ملّتِ دیگر کے آگے آئے گا
شیوۂ مسلم نہ ہے اب تقلید و ظن اس سے جاں لرزاں مری اندر بدن

مجھ کو ہر دم خوف ہے اس روز کا
غیر حاصل ہو گا جب اس سوز کا

پیر رومی بہ زندہ رودی گوید کہ شعرے بیار

پیر رومی آں سراپا جذب و درد
ایں سخن دانم کہ با جانش چہ کرد

از دروں آہے جگر دوزے کشید
اشکِ او رنگیں تر از خونِ شہید

آنکہ تیرش جز دلِ مرداں نسفت
سوئے افغانی نگاہے کرد و گفت

دل بخوں مثلِ شفق باید زدن
دست در فتراکِ حق باید زدن

جاں ز امید است چوں جوئے رواں
ترکِ امید است مرگِ جاوداں

باز در من دید و گفت "اے زندہ رود
با دو بیتے آتش افگن در وجود

ناقۂ ما خستہ و محمل گراں
تلخ تر باید نوائے ساربانا!

امتحانِ پاک مرداں از بلاست
تشنگاں را تشنہ تر کردن رواست

در گذر مثلِ کلیمؑ از رودِ نیل
سوئے آتش گام زن مثلِ خلیلؑ!

نغمۂ مردے کہ دارد بوئے دوست
ملتے را می برد تا کوئے دوست!"

زندہ رود سے پیر رومیؒ شعر کی فرمائش کرتے ہیں

جذب میں وہ رومیؒ درد آشنا
جانے سنکر ان کا کیا عالم ہوا!

آہ اک نکلی جگر کو چیر کر
خونِ شہدا سے تھے آنسو سرخ تر

تیر اُس کا چاہیے مردوں کا جگر
بولے افغانی کی جانب دیکھ کر

دل کو کر دینا لہو مثلِ شفق
ہاتھ میں اب چاہیئے فتراکِ حق

جاں امیدوں سے مثالِ جُوئے رواں
ناامیدی اصلِ مرگِ جاوداں

مڑ کے پھر مجھ سے کہے اے زندہ رود!
دے لگا نغمہ سے آگ اندر وجود

خستہ اپنی ناقہ اور محمل گراں
تلخ تر کر دے نوا اے ساربان!

امتحانِ مرد ہے وقتِ بلا
پیاس پیاسوں کی بڑھانی ہے روا

مثلِ موسیٰؑ پار کر دریائے نیل
آ اُتر کر آگ میں مثلِ خلیلؑ

نغمہ وہ جس سے ہے پیدا بوئے دوست
قوم کو لے جائے گا تا کوئے دوست

غزل زندہ رود

ایں گل ولالہ تو گوئی کہ مقیم اند ہمہ
راہ پیما صفتِ موجِ نسیم اند ہمہ

معنیٔ تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجاست
مسجد و مکتب و مے خانہ عقیم اند ہمہ

حرفے از خویشتن آموز و دراں حرف بسوز
کہ دریں خانقہ بے سوز کلیمؑ اند ہمہ

از صفا کوشیٔ ایں تکیہ نشیناں کم گوے
موے ژولیدہ و ناشستہ گلیم اند ہمہ

چہ حرمہا کہ درونِ حرمے ساختہ اند
اہلِ توحید یک اندیش و دو نیم اند ہمہ

مشکل ایں نیست کہ بزم از سرِ ہنگامہ گذشت
مشکل ایں است کہ بے نقل و ندیم اند ہمہ

غزلِ زندہ رود

یہ گل و لالہ تو سمجھائے جنہیں ہوں گے سدا
طے رہِ عمر کیے جاتے ہیں مانندِ صبا

معنیٔ تازہ جو مطلوب ہیں پائینگے کہاں؟
بانجھ ہیں سب حرم و مدرسہ و میخانہ

خانقاہوں میں بھی اب سوزِ کلیمیؑ نہ رہا
بھر کے سوئے آپنا ہی الفاظ میں جل آگ لگا

ذکر ان تکیہ نشینوں کی صفائی کا نہ کر
شانہ نادیدہ ہے زلف ان کی گلیم آلودہ

اک حرم اس میں حرم کتنے بنا رکھے ہیں
اہلِ توحید ہیں سب ایک نظر دل سے جدا

یہ نہیں بات کہ باقی نہ رہا ذوقِ جہاد
بات یہ ہے نہیں باذوق کوئی راہ نما

فلکِ زہرہ

فلکِ زہرہ

درمیانِ ما و نورِ آفتاب — از فضائے تو بتو چندیں حجاب!
پیشِ ما صد پردہ را آویختند — جلوہ ہائے آتشیں را پیختند
تا ز کم سوزی شود دل سوز تر — سازگار آید بشاخ و برگ و بر
از تبِ او در عروقِ لالہ خوں — آبجو از رقصِ او سیماب گوں
ہم چناں از خاک خیزد جانِ پاک — سوئے بے سوئی گریزد جانِ پاک
در رہِ او مرگ و حشر و حشر و مرگ — جز تب و تابے ندارد ساز و برگ
در فضائے صد سپہرِ نیلگوں — غوطہ پیہم خوردہ باز آید بروں
خود حریمِ خویش و ابراہیمِ خویش — چوں ذبیح اللہؑ در تسلیمِ خویش!
پیشِ او نہ آسماں نہ خیبر است — ضربتِ او از مقامِ حیدرؓ است
ایں ستیزِ دمبدم پاکش کند — محکم و سیّار و چالاکش کند!
می کند پرواز در پہنائے نور — مخلبش گیرندۂ جبریلؑ و حور!

تا ز مازاغ البصر گیرد نصیب
بر مقامِ "عبدہٗ" گردد رقیب!

فلکِ زہرہ

نیچ اپنے اور نورِ آفتاب — تھے فضا میں اَن گنت حائل حجاب
سیکڑوں پردے نظر کے سامنے — جلوہ ہائے آتشیں کو چھانتے
تا ہو کم سوزی سے دل سوزندہ تر — تا ہو موزوں بہرِ شاخ و برگ و بر
اس کی گرمی سے رگِ لالہ میں خوں — آب اس کے رقص سے سیماب گوں
ہے یوں ہی مٹی سے پیدا پاک جاں — اور پرواز اس کی سوئے لامکاں
اس سفر میں جینا مرنا بار بار — اس کا زادِ راہ جانِ بے قرار
آسماں کی کئی فضائیں پیر کر — ڈوبے، ابھرے باہر آئے تیر کر
خود حریمِ کعبہ، ابراہیمؑ خود — جوں ذبیحؑ اللہ در تسلیمِ خود
نو فلک رستے میں نوخیبر کی طرح — ضرب اس کی ضربتِ حیدرؓ کی طرح
یورشِ پیہم کرے گی پاک اُسے — تیز رو مستحکم اور چالاک اُسے
پرکشائی کو اسے پہنائے نور — وہ شکاری صید اسے جبریلؑ دور

تا ہو ما زاغ البصر اس کو نصیب
اور مقامِ عبدہٗ میں ہو رقیب

از مقامِ خود نمی دانم کجاست
ایں قدر دانم کہ از یاراں جداست

اندرونم جنگِ بے خیل و سپہ
بیند آں کو ہم چو من دارد نگہ

بے خبر مرداں ز رزمِ کفر و دیں
جانِ من تنہا چو زیں العابدیں!

از مقام و راہ کس آگاہ نیست
جز نوائے من چراغِ راہ نیست!

غرقِ دریا طفلک و برنا و پیر
جاں بساحل بردہ یک مردِ فقیر!

برکشیدم پردہ ہائے ایں وثاق
ترسم از وصل و بنالم از فراق!

وصل اگر پایانِ شوق است الحذر
اے خنک آہ و فغانِ بے اثر!

راہ رو از جادہ کم گیرد سراغ
گر بجانش سازگار آید فراغ

آں دلے دارم کہ از ذوقِ نظر
ہر زماں خواہد جہانے تازہ تر!

رومی از احوالِ جانِ من خبیر
گفت "می خواہی دگر عالم؟ بگیر!

عشق شاطر مابدستش مہرہ ایم
پیش بنگر در سوادِ زہرہ ایم

عالمے از آب و خاک او را قوام
چوں حرم اندر غلافِ مشک فام

با نگاہِ پردہ سوز و پردہ در
از درونِ میغ و ماغِ او گذر

اندرو بینی خدایانِ کہن
می شناسم من ہمہ را تن بہ تن

بَعل و مَردوخ و یعوق و نسر و فسر
رم خن و لات و منات و عزّ و عزر

بر قیامِ خویش می آرد دلیل
از مزاجِ ایں زمانِ بے خلیل"

مَیں نہ جانوں ہے کہاں میری جگہ
علم ہے اتنا ہوں یاروں سے جدا

جنگِ بے خیل و سپہ اندر مرے
دیکھیں میری ہی نظر والے اُسے

کس کو معلوم ایسی جنگِ کفر و دیں
میں ہوں تنہا مثلِ زین العابدیں!

راہ سے منزل سے کون آگاہ ہے
میرا نغمہ ہی چراغِ راہ ہے

غرقِ دریا طفلکے برنا و پیر
پہنچا ساحل پر بس اک مردِ فقیر

مَیں نے پردے چاک کر ڈالے ولے
وصل کا ڈر ہجر کا غم تھا مجھے

وصل ہے گر خاتمِ عشق الحذر
مرحبا! آہ و فغانِ بے اثر

جس کسی راہی کو راس آئے فراغ
پا نہیں سکتا وہ رستے کا سراغ

میرا دل ہے کشتۂ ذوقِ نظر
چاہیے وہ ہر دم جہانِ تازہ تر

رومی واقف مجھ سے تھے، بولے مجھے
تو نے دنیائے دگر چاہی تھی لے

عشق اک شاطر ہے اُس کے مہرے ہم
لے حدودِ زہرہ میں آ پہنچے ہم

یہ جہاں بھی پیکرِ آب و خاک کا
جوں حرم اس پر بھی ہے چادر سیاہ

با نگاہِ پردہ سوز و پردہ در
دھند کو اور بدلیوں کو چیر کر

دیکھ وہ اندر خدایانِ کہن
جانتا ہوں میں سبھوں کو تن بہ تن

بعلؔ و مردوخؔ و یعوقؔ و نسرؔ و فسرؔ
رمخنؔ و لاتؔ و مناتؔ و عسروؔ عسرؔ

ان کا ہونا خود ہے اک روشن دلیل
اس زمانے میں نہیں کوئی خلیلؑ

مجلسِ خدایانِ اقوامِ قدیم

آں ہوائے تند و آں شبگوں سحاب
برق اندر ظلمتش گم کردہ تاب

قلزمے اندر ہوا آویختہ
چاک دامان و گہر گم ریختہ!

ساحلش ناپید و موجش گرم خیز
گرم خیز و با ہوا ہا کم ستیز!

رومی و من اندر آں دریائے قیر
چوں خیال اندر شبستانِ ضمیر!

او سفرہا دیدہ و من نو سفر
درد و چشمِ ناصبور آمد نظر

ہر زماں گفتم نگاہم نارساست
آں دگر عالم نمی بینم کجاست

تا نشانِ کوہسار آمد پدید
جو بہ بار و مرغزار آمد پدید!

کوہ و صحرا صد بہار اندر کنار
مشکبار آمد نسیم از کوہسار!

نغمہ ہائے طائرانِ ہم نفس
چشمہ زار و سبزہ ہائے نیم رس

تن ز فیضِ آں ہوا پایندہ تر
جان پاک اندر بدن بینندہ تر

از سرِ کُہ پارۂ کردم نظر
خرّم آں کوہ و کمر آں دشت و در!

وادیٔ خوش بے نشیب و بے فراز
آبِ خضر آرد بخاکِ او نیاز

اندریں وادی خدایانِ کہن
آں خدائے مصر و ایں ربّ الیمن

آں زار بابِ عرب ایں از عراق
ایں الٰہ الوصل و آں ربّ الفراق

مجلسِ خدایانِ اقوامِ قدیم

تند ہوائیں اور گھنی کالی گھٹا
ظلمتوں میں برقِ تاباں بے جلا

جیسے اک دریا اُدھر لٹکا ہوا
بے گہر چاک اس کا دامن جا بجا

موجِ موجاں بحر حد نا آشنا
ساتھ ہواؤں کے لپٹنا بھاگنا

ایسی تاریکی میں ہم دونوں کا حال
جیسے خلوتِ گاہ دل میں گم خیال

وہ سفر کے ماہر اور میں نو سفر
دید کو بیتاب آنکھوں میں نظر

بولا کچھ دکھتا نہیں، ہوں کم بصر
عالمِ دیگر وہ، پیدا ہے کدھر؟

یک بیک پیشِ نظر تھا کوہسار
ہر طرف تھے مرغزار و جوئبار

کوہ و صحرا تھے بہاراں در کنار
تھی نسیم کوہ ہر سو مشکبار

ساتھ ہم جنسوں کے طائر نغمہ خواں
سبزۂ نورستہ و جوئے رواں

اس ہوا کے دم سے تن مضبوط تر
تن کے اندر جاں کی روشن تر نظر

چڑھ کے پھر ٹیلے پہ ڈالی اک نظر
شاد و رنگیں پائے کوہ و دشت و در

اک مسطح وادیٔ روشن اُدھر
مات جس کی خاک سے آبِ خضر

اس کے اندر سب خدایانِ کہن
وہ خدائے مصر، یہ ربِ یمن

وہ عرب کا رب، تو یہ ربِ عراق
کام اس کا وصل، کام اس کا فراق

ایں زنسلِ مہر و دامادِ قمر
آں بہ زوجِ مشتری دارد نظر

آں یکے در دستِ او تیغ دو رو
واں دگر پیچیدہ مارے در گلو

ہر یکے ترسندہ از 'ذکرِ جمیل'
ہر یکے آزردہ از ضربِ خلیلؑ

گفت مرد و خ "آدم از یزداں گریخت
از کلیسا و حرم نالاں گریخت

تا بیفزاید بادراک و نظر
سوئے عہدِ رفتہ باز آید نگر!

می برد لذّت ز آثارِ کہن
از تجلّی ہائے ما دارد سخن!

روزگار افسانۂ دیگر گشاد
می وزد زاں خاکداں بادِ مراد!

بعل از فرطِ طرب خوش می سرود
بر خدایاں رازہائے ما کشود!

نغمۂ بعل

آدم ایں نیلی تتق را بردرید
آنسوئے گردوں خدائے را ندید

در دلِ آدم بجز افکار چیست
ہمچو موج ایں سر کشید و آں رمید!

جانش از محسوس می گیرد قرار
بو کہ عہدِ رفتہ باز آید پدید

زندہ باد افرنگیٔ مشرق شناس
آنکہ ما را از لحد بیروں کشید!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

چاند کا داماد یہ سورج کی نسل — اور وہ، اس کو مشتری سے ذوقِ وصل
اس کے ہاں دو دھار کی تلوار ہے — وہ دگر، گردن میں حلقہ مار ہے
ہر کسی کے دل میں خوفِ ذکرِ حق — ضربِ ابراہیمؑ سے سب سینہ شق
بولہب مردِ دروغ، آدمی ہے حق سے دور — وہ کلیسا و حرم سے ہے نفور
تیز تر کرنے کو ادراک و نظر — وہ ہے عہدِ رفتہ سے نزدیک تر
اس کو بھاتے ہیں سب آثارِ کہن — ہے ہمارے حسن کی اس کو لگن
آج اُسی دنیا کا عالم اور ہے — بہتر اپنے واسطے یہ دور ہے

بعلؔ سرخوش جوش میں گانے لگا
ان کو اپنے بھید بتلانے لگا

نغمۂ بعل

چل دیا آدم فلک کو چیر کر — پر نہ پایا اک خدا کو بھی ادھر
ہے بجز اوہام اس کے دل میں کیا! — موجِ سائر کو اٹھایا وہ چلا
اس کی جاں محسوس سے پائے قرار — دورِ ماضی شاید اب لوٹ آئے گا
مرحبا افرنگیِ مشرق شناس — مدفنوں سے ہم کو باہر کر دیا

اے خدایانِ کہن! اب وقت ہے!

در نگر آں حلقۂ وحدت شکست — آلِ ابراہیمؑ بے ذوقِ الست!
صحبتش پاشیدہ جامش ریز ریز — آنکہ بود از بادۂ جبریل مست!
مردِ حُر افتاد در بندِ جہات — با وطن پیوست و از یزداں گسست!
خونِ او سرد از شکوہ دیریاں — لا جرم پیرِ حرم زنّار بست!
اے خدایانِ کہن وقت است و وقت!

در جہاں باز آمد ایامِ طرب — دیں ہزیمت خوردہ از ملک و نسب!
از چراغِ مصطفیٰؐ اندیشہ چیست؟ — زانکہ او را پف زند صد بولہب!
گرچہ می آید صدائے لا الٰہ — آنچہ از دل رفت کے ماند بہ لب!
اہرمن را زندہ کرد افسونِ غرب — روزِ یزداں زرد رو از بیمِ شب!
اے خدایانِ کہن وقت است و وقت!

بندِ دیں از گردنش باید کشود — بندۂ ما بندۂ آزاد بود
تا صلوات او را گراں آید ہمے — رکعتے خواہیم و آں ہم بے سجود
جذبہ ہا از نغمہ می گردد بلند — پس چہ لذّت در نمازِ بے سرود!
از خداوندے کہ غیب او را سزد — خوشتر آں دیدے کہ آید در شہود!
اے خدایانِ کہن وقت است و وقت!

دیکھنا یہ حزبِ وحدت کی شکست ہیں برابیمی بلا ذوقِ الست
بزم برخاست، اس کا ساغر چور چور جامِ جبریلی سے ابتک تھا جو مست
مردِ حر وہ اب ہے محبوسِ جہات کشتۂ حبِ وطن ہے حق پرست
ڈر سے اہلِ دیر کے خوں اس کا سرد ہو گیا پیرِ حرم زنّار مست

اے خدایانِ کہن! اب وقت ہے!

آ گئے اب واپس ایّامِ طرب دیں پہ غالب ہو گئے ملک و نسب
اب چراغِ مصطفےٰ کا ڈر نہیں مارتے ہیں پھونک صدہا بولہب
یوں تو آتی ہے صدائے لا الٰہ کب تلک لب پر نہیں وہ دل میں جب
اہرمن کو جاں عطا کی غرب نے روزِ یزداں پر ہے غالب خوفِ شب

اے خدایانِ کہن! اب وقت ہے!

دامِ دیں سے اس کو کرنا ہے رہا اپنا بندہ، بندۂ آزاد تھا
تا گراں اس پر نہ ہو بارِ صلوٰت ایک رکعت بس ہمیں سجدے بنا
نغمہ سے جذبات ہوتے ہیں بلند کیا بلا نغموں کے طاعت کا مزا
اس خدا سے غیب زیبا ہے جسے دیکھنے والا وہی راس آئے گا

اے خدایانِ کہن! اب وقت ہے!

فرو رفتن بدریائے زہرہ و

دیدن ارواحِ فرعون و کشنرا

پیرِ رومؒ آں صاحبِ ذکرِ جمیلؒ ضربِ اورا اسطوتِ ضربِ خلیلؑ
ایں غزل در عالمِ مستی سرود ہر خدائے کہنہ آمد در سجود!

غزل

"باز بر رفتہ و آیندہ نظر باید کرد ہلہ برخیز کہ اندیشہ دگر باید کرد
عشق بر ناقۂ ایام کشد محملِ خویش عاشقی! راحلہ از شام و سحر باید کرد
پیرِ ما گفت جہاں بر روشے محکم نیست از خوش و ناخوشِ او قطعِ نظر باید کرد
تو اگر ترکِ جہاں کردہ سرِ او داری پس نخستیں ز سرِ خویش گذر باید کرد
گفتمش در دلِ من لات و منات است بسے
گفت ایں بتکدہ را زیر و زبر باید کرد"

باز با من گفت "برخیز اے پسر جز بدِ امانم میاویز اے پسر

دریائے زہرہ میں اترآنا اور دیکھنا

ارواحِ فرعون وکشنر کو

پیرِ رومی صاحبِ ذکرِ جمیل — ضربِ ان کی جس طرح ضربِ خلیلؑ
یہ غزل گائی، ہوئے مستِ سرود — گر پڑے سارے خدا بہرِ سجود

غزل

پھر سے مستقبل و ماضی پہ نظر کرنا ہے — اٹھ کہ اب فکر بہ اندازِ دگر کرنا ہے
پشتِ ایام پہ رہتا ہے سدا عشق سوار — گر ہے عاشق تجھے ایام کو سر کرنا ہے
کسی مخصوص روش کا نہیں پابند جہاں — خوش و ناخوش سے ہمیں قطعِ نظر کرنا ہے
ترکِ دنیا سے ہے مقصود اگر یار کی دید — پیش کرنے ہمیں تیاریٔ سر کرنا ہے

جب کہا میں نے کہ دل میں ہیں کئی لات و منات
بولا اس بتکدے کو زیر و زبر کرنا ہے

مجھ سے پھر کہنے لگے اٹھ اے پسر — میرا دامن تھام غیروں سے گزر

آں کہستاں آں جبالِ بے کلیمؑ
آنکہ از برف است چوں انبار سیم!

در پسِ او قلزمِ الماس گوں
آشکار اتر درونش از بروں!

نے بموج و نے بسیل او را خلل
در مزاجِ او سکونِ لم یزل

ایں مقامِ سرکشانِ زور مست
منکرانِ غائب و حاضر پرست!

آں یکے از شرق و آں دیگر ز غرب
ہر دو با مردانِ حق در حرب و ضرب!

آں یکے بر گردنش چوبِ کلیمؑ
واں دگر از تیغ دو ریشے دو نیم!

ہر دو فرعون ایں صغیر و آں کبیر
ہر دو در آغوشِ دریا تشنہ میر!

ہر کسے با تلخیٔ مرگ آشناست
مرگ جبّاراں ز آیاتِ خداست!

در پے من پا بنہ از کس مترس
دست در دستم بدہ از کس مترس

سینۂ دریا چو موسےٰؑ بر درم
من ترا اندر ضمیرِ او برم"

بحر بر ما سینۂ خود را کشود
یا ہوا بود و چو آبے وا نمود

قعرِ او یک وادیٔ بے رنگ و بو
وادیٔ تاریکیٔ او تو بتو

پیرِ رومی سورۂ طٰہٰ سرود
زیرِ دریا ماہتاب آمد فرود!

کوہ ہائے شستہ و عریان و سرد
اندراں سرگشتہ و حیراں دو مرد!

سوے رومی یک نظر نگریستند
باز سوے یک دگر نگریستند

گفت فرعون ایں سحر! ایں جوئے نور!
از کجا ایں صبح و ایں نور و ظہور؟

وہ کہستاں، وہ جبالِ بے کلیمؑ
برف پوشی سے ہیں جوں انبارِ سیم

قلزمِ الماس رنگ اس کے پرے
اس کا باطن آشکارا سطح سے

نے بہاؤ سے نہ موجوں سے خلل
اس کے باطن میں سکونِ لم یزل

اس میں ہیں آباد سرکش، زور مست
غیب کے منکر ہیں یہ حاضر پرست

ایک ہے مشرق سے مغرب سے دگر
دونوں اہلِ اللہ سے تھے جنگ پر

ایک کے سر پر پڑی ضربِ کلیمؑ
ضرب سے درویش کی دیگر دو نیم

دونوں فرعون ایک چھوٹا اک بڑا
پیاسے دریا میں جنہیں مرنا پڑا

گرچہ تلخی موت کی چکھنا ہے حق
پر ہے مرگِ ظالم عبرت کا سبق

میرے پیچھے چل کسی سے تو نہ ڈر
ہاتھ میرے ہاتھ میں دے تو نہ ڈر

بحر کو موسیٰؑ کی صورت چیر دوں
آ تجھے میں اس کے اندر لے چلوں

ہم پہ تھا دریا کا باطن فاش یا
لگ رہی تھی ہم کو پانی سی ہوا

تہہ میں تھی اک وادیٔ بے رنگ و بو
وادیٔ تاریک ظلمت تو بتو

سورۂ طٰہٰ جو رومیؒ نے پڑھی
چاند ظاہر ہو گیا تہہ میں تبھی

چوٹیاں کہسار کی عریاں و سرد
تھے وہاں حیراں و سرگرداں دو مرد!

دیکھا رومیؒ کو انہوں نے یک نظر
بعد دیکھا یک دگر کو لوٹ کر

بولا فرعون یہ سحر ہے جوئے نور!
ہے کہاں کی صبح با نور و ظہور

رُومی

ہر چہ پنہان است از وے پیدا ستے
اصلِ ایں نور از یدِ بیضا ستے!

فرعون

آہ نقدِ عقل و دیں در باختم
دیدم و ایں نور را نشناختم!

اے جہاں داراں سوئے من بنگرید
اے زیاں کاراں سوئے من بنگرید!

وائے قومے از ہوس گردیدہ کور
می برد لعل و گہر از خاکِ گور!

پیکرے کو در عجائب خانہ ایست
بر لبِ خاموشِ او افسانہ ایست!

از ملوکیت خبر ہا می دہد
کور چشماں را نظر ہا می دہد

چیست تقدیرِ ملوکیت؟ شقاق
محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق!

از بد آموزی زبوں تقدیرِ ملک
باطل و آشفتہ تر تدبیرِ ملک!

باز اگر بینم کلیم[3] اللہ را
خواہم از وے یک دلِ آگاہ را

رُومی

اس کے باعث ہر نہاں کا ہے ظہور
اصل میں یہ ہے یدِ بیضا کا نور

فرعون

اُف! گنوا بیٹھا ئیں نقدِ عقل و دیں
نور یہ دیکھا بھی پہچانا نہیں

اے جہاندار و ذرا دیکھو مجھے
اے زیاں کار و ذرا دیکھو مجھے

ہائے ملّت! حرص کے باعث ہے کور
ہو جسے کانِ گہر صندوقِ گور

نعش اک زیبِ عجائب خانہ ہے
اس کی خاموشی میں اک افسانہ ہے

بادشاہت سے خبر دیتی ہے وہ
کورِ چشموں کو نظر دیتی ہے وہ

بادشاہت کیا ہے، اصلِ افتراق
بہرِ استحکام تدبیرِ نفاق!

اس کی بدراہی سے بد تقدیرِ ملک
باطل و آشفتہ تر تدبیرِ ملک!

پھر اگر پاؤں کلیمؑ اللہ کو
ان سے چاہوں گا دلِ آگاہ کو

رُومی

حاکمی بے نورِ جاں خام است خام
بے یدِ بیضا ملوکیت حرام

حاکمی از ضعفِ محکوماں قوی است
بیخش از حرمانِ محروماں قوی است!

تاج از باج است و از تسلیمِ باج
مرد اگر سنگ است می گردد زجاج!

فوج و زندان و سلاسل ہر زنی است
اوست حاکم کز چنیں ساماں غنی است

ذوالخرطوم

مقصدِ قومِ فرنگ آمد بلند
از پئے لعل و گہر گوری نکند

سرگذشتِ مصر و فرعون و کلیم
می تواں دیدن ز آثارِ قدیم!

علم و حکمت کشفِ اسرار است و بس
حکمتِ بے جستجو خوار است و بس!

فرعون

قبرِ ما را علم و حکمت برکشود
لیکن اندر تربتِ مہدی چہ بود؟

رُومی

جانِ روشن کے بنا شاہی ہے خام
بے یدِ بیضا ملوکیت حرام
ضعفِ محکوماں سے ہے شاہی قوی
ان کی محرومی سے جڑ ان کی قوی
تاجِ شاہی باج سے اور وجہِ باج
مردِ سنگیں عزم ہو جائے زجاج
فوج، زنداں اور سلاسل رہزنی
ہے وہی حاکم جو ہو ان سے غنی

ذوالخرطوم

ہے بلند اقوامِ مغرب کی نظر
کون ڈھونڈے قبر میں لعلِ گہر
واقعاتِ مصر و فرعون و کلیم
ہیں عیاں در شکلِ آثارِ قدیم
علم و حکمت کیا؟ حقائق کی تلاش
کیسی حکمت گر نہ ہو باقی تلاش

فرعون

بہرِ حکمت شق مزار اپنا ہوا
قبرِ مہدی میں تھا آخر کیا بتا!

نمودار شدنِ درویشِ سودانی

برق بے تابانہ رخشید اندر آب
موجہا بالید و غلطید اندر آب

بوئے خوش از گلشنِ جنّت رسید
روحِ آں درویشِ مصر آمد پدید

در صدف از سوزِ او گوہر گداخت
سنگ اندر سینۂ کشمر گداخت

گفت "اے کشمر اگر داری نظر
انتقامِ خاکِ درویشے نگر!

آسماں خاکِ ترا گوید نداد
مرقدے جز در یمِ شوید نداد"

باز حرف اندر گلوے او شکست
از لبش آہے جگر تابے گسست!

گفت "اے روحِ عرب بیدار شو
چوں نیاگان خالق اعصار شو!

اے فؤاد اے فضیل اے ابنِ سعود
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود!

زندہ کن در سینہ آں سوزے کہ رفت
در جہاں باز آور آں روزے کہ رفت!

خاکِ بطحا خالدؓے دیگر بزاد
نغمۂ توحید را دیگر سراے

اے نخیلِ دشتِ تو بالندہ تر
بر نخیزد از تو فاروقے دگر؟

اے جہانِ مومنانِ مشک فام
از تو می آید مرا بوے دوام!

درویشِ سوڈانی کا نمودار ہونا

چمکی بجلی سی تڑپ کر اندر آب — ہو گیا دریا میں پیدا اضطراب
مہکی بوئے باغِ جنّت ناگہاں — روحِ سوڈانی ہوئی ظاہر وہاں
پانی پانی سیپ میں گوہر ہوا — پانی سنگِ سینۂ کشنر ہوا
بولی کشنر کچھ سمجھ سے ہے جو کام — دیکھ اک درویش کا یہ انتقام
تجھ کو ترسایا فلک نے گور کو — سونپی تیری خاک آبِ شور کو
رک گئی پھرتا گلو آکر صدا — پھر اک آہِ سرد کھینچی بس کیا
بولی "اے روحِ عرب بیدار ہو — جوں سلف تو خالقِ اعصار ہو
اُے فواد، اے فیصل، اے ابنِ سعود، — کب تلک بہبود اپنی، اپنا سود؟
سوزِ رفتہ اپنے دل میں تازہ کر — دورِ ماضی کا بلند آوازہ کر
خاکِ بطحا کر دگر خالد عطا — نغمۂ توحید دوبارہ سنا
تیرے نخلستان سبز و بارور — کاش آجائے کوئی دیگر عمرؓ!
اُے جہانِ مومنانِ مشک فام — تجھ سے آتی ہے مجھے بوئے دوام

زندگانی تا کجا بے ذوق سیر — تا کجا تقدیرِ تو در دستِ غیر!
بر مقامِ خود نیائی تا بکے — استخوانم در تکے نالد چو نے!

از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰؐ است
"مرد را روزِ بلا روزِ صفا ست"

ساربانِ یاراں بہ یثرب ما بہ نجد — آں حدی کو ناقہ را آرد بہ وجد!
ابر بارید از زمیں ہا سبزہ رست — می شود شاید کہ پائے ناقہ سست!
جانم از دردِ جدائی در نفیر — آں رہے کو سبزہ کم دارد بگیر!
ناقہ مستِ سبزہ و من مستِ دوست — او بدستِ تست و من در دستِ دوست!
آب را کردند بر صحرا سبیل — بر جبل ہا شستہ اوراقِ نخیل!
آں دو آہو در قفائے یک دگر — از فرازِ تل فرود آید نگر!
یک دم آب از چشمۂ صحرا خورد — باز سوئے راہ پیما بنگرد!
ریگِ دشت از نم مثالِ پرنیاں — جادہ بر اشتر نمی آید گراں
حلقہ حلقہ چوں پرِ یتہو غمام — ترسم از باراں کہ دوریم از مقام!

ساربانِ یاراں بہ یثرب ما بہ نجد
آں حدی کو ناقہ را آرد بہ وجد"

کب تلک یہ بے تگ و دو زندگی — کب تلک یہ بندگی اغیار کی
یوں ہی کب تک بے ٹھکانے کے یہاں — بحر میں نالاں ہیں میری ہڈیاں
مصطفیٰؐ بولے نہ کر خوفِ بلا
کیوں کہ ہے روزِ بلا روزِ صفا

یار یثرب میں ہمارے ہم بہ نجد — لاحُدی سے ساربان ناقے پہ وجد
ابر برسا خاک سے سبزہ اُگا — ہو نہ جائے ناقہ اپنی سُست پا
دردِ ہجراں سے ہے نالاں میری جاں — راستہ وہ لے نہ ہو سبزہ جہاں
ناقے کو سبزہ کی دُھن، یکں مستِ یار — اس پہ تو، دُھن دوست کی مجھ پر سوار
دشت میں جاری ہے پانی کی سبیل — تازہ کہساروں پہ اوراقِ نخیل
دو ہرن وہ، ایک کے پیچھے دگر — آئے چوٹی سے پہاڑوں کی اُتر
چشمہ سے اک گھونٹ پانی پی لیئے — راہ پیماؤں کو تکتے رہ گئے
مثلِ دیبارِ یگ صحرا وجہِ نم — ناقے کے مضبوط پڑتے ہیں قدم
آسمانوں پر گھٹا گھنگور ہے — خوف ہے مجھ کو کہ منزل دور ہے

یار یثرب میں ہمارے ہم بہ نجد
لاحُدی سے ساربان ناقے پہ وجد

فلکِ مریخ

اہلِ مریخ

چشتم را یک لحظہ بستم اندر آب — اندر کے از خود گسستم اندر آب!
رخت بردم زی جہانے دیگرے — با زمان و با مکانِ دیگرے!
آفتابِ ما بآفاقش رسید — روز و شب را نوعِ دیگر آفرید!
تن ز رسم و راہِ جاں بیگانہ ایست — در زمان و از زماں بیگانہ ایست!
جانِ ما سازد بہر سوزے کہ ہست — وقتِ او خرم بہر روزے کہ ہست!
می نگردد کہنہ از پرواز روز — روزہا از نورِ او عالم فروز!

روز و شب را گردشِ پیہم از وست
سیرِ او کن زانکہ ہر عالم از وست

مرغزارے با رصد گاہِ بلند — دوربینِ او ثریا در کمند!
خلوتِ نُہ گنبدِ خضرا ست ایں — یا سوادِ خاکداںِ ما ست ایں؟
گاہ جستم وسعتِ او را کراں — گاہ دیدم در فضائے آسماں!
پیرِ روم آں مرشدِ اہلِ نظر — گفت "مریخ است ایں عالم نگر!

اہلِ مریخ

بند کیں اک لمحہ آنکھیں اندر آب
مجھ پہ طاری ہو گیا اک طرفہ خواب

اک دگر دنیا کی جانب چل دیا
دوسرے عالم میں داخل ہو گیا

تھا دگر دنیا میں اپنا سورج اب
تھے نئے انداز کے وہ روز و شب

جسم رسم و راہِ جاں سے بے خبر
تھے زماں میں خود زماں سے بے خبر

سوز کیسا بھی ہو جاں کو خوش لگے
روز ہو کوئی بھی وقت اچھا رہے

دن گزرنے سے نہ ہو گی کہنہ جاں
روشن اس کے نور سے روزِ جہاں

اس کے باعث گردشِ شام و سحر
اس میں سب عالم ہیں ان کی سیر کر

اک رصد گہ درمیانِ سبزہ زار
دوربیں اس کی ثریا در کنار

کوئی خلوت گہ ہے نو افلاک کی؟
یا یہی حد ہے جہانِ خاک کی؟

سرحدیں اس کی کبھی ڈھونڈا کیا
گہ فضائے آسماں دیکھا کیا

پیرِ رومی مرشدِ اہلِ نظر
بولے "آ مریخ کی اب سیر کر

چوں جہانِ ما طلسمِ رنگ و بوست — صاحبِ شہر و دیار و کاخ و کوست!
ساکنانش چوں فرنگاں ذو فنوں — در علومِ جان و تن از ما فزوں!
بر زماں و بر مکاں قاہر تر اند — زانکہ در علمِ فضا ماہر تر اند
بر وجودش آں چناں پیچیدہ اند — ہر 'خم و پیچِ' فضا را دیدہ اند
خاکیاں را دل بہ بندِ آب و گل — اندریں عالم بدن در بندِ دل!
چوں دلے در آب و گل منزل کند — ہر چہ می خواہد بآب و گل کند
مستی و ذوق و سرور از حکمِ جاں — جسم را غیب و حضور از حکمِ جاں!
در جہانِ ما دو تا آمد وجود — جان و تن، آں بے نمود آں با نمود!
خاکیاں را جان و تن مرغ و قفس — فکرِ مریخی یک اندیش است و بس!
چوں کسے را می رسد روزِ فراق — چست تر می گردد از سوزِ فراق!
یک دو روزے پیشتر از آنِ مرگ — می کند پیشِ کساں اعلانِ مرگ!
جانِ شاں پروردۂ اندام نیست — لاجرم خو کردۂ اندام نیست!
تن بخویش اندر کشیدن مردن است — از جہاں در خود رمیدن مردن است!
برتر از فکرِ تو آمد ایں سخن — زاں کہ جانِ تست محکومِ بدن!

رخت ایں جا یک دو دم باید کشاد
ایں چنیں فرصت خدا کس را نداد!"

یہ جہاں بھی ہے جہانِ رنگ و بو
اس میں بھی ہیں ملک و شہر و کاخ و کو

جوں فرنگی اس کے باشی ذو فنوں
جسم و جاں کے علم میں ہم سے فزوں

ہم سے غالب تر زماں ہو یا مکاں
علمِ انجم میں یگانہ سب یہاں

ان کے عالم پر ہیں یوں چھائے ہوئے
کہ ہیں واقف ان کے سب احوال سے

اہلِ دنیا کو ہیں مرغوب آب و گل
اور یہاں تن تابعِ فرمانِ دل

آب و گل میں جب ٹھکانہ دل کرے
جو بھی وہ چاہے بہ آب و گل کرے

ذوق و مستی اپنی جاں کے کاروبار
جسم غائب اس سے، اس سے آشکار

دو طرح کے ہیں ہمارے ہاں وجود
تن نمودار اور جاں ہے بے نمود

جسم و جاں ہم کو ہیں جوں مرغ و قفس
فکرِ مریخی میں دونوں ایک ہیں بس

ہو قریب المرگ جب کوئی ادھر
دردِ ہجراں سے وہ ہوگا چست تر

مرنے والا خود دو اک دن پیشتر
سب کو پہنچاتا ہے مرنے کی خبر

جسم کی پالی نہیں ہے اس کی جاں
جسم کی ڈھالی نہیں ہے اس کی جاں

تن کو جاں میں جذب کرنا ان کی موت
خود میں باہر سے اترنا ان کی موت

فہم کر سکتا نہیں تو یہ سخن
تیرے حق میں جاں ہے محکومِ بدن

اک دو دم اس جا ٹھہرنا چاہیے
اس قدر فرصت خدا نے دی کسے؟

برآمدنِ انجم شناسِ مریخی از رصدگاہ

پیرِ مردے ژندۂ او مانندِ برف — سالہا در علم و حکمت کردہ صرف
تیز بیں مانندِ دانایانِ غرب — کسوتش چوں پیرِ ترسایانِ غرب
دیر سال و قامتش بالا چو سرو — طلعتش تابندہ چوں ترکانِ مرو
آشنائے رسم و راہِ ہر طریق — آشکار از چشمِ او فکرِ عمیق
آدمی را دید و چوں گل بر شگفت — در زبانِ طوسی و خیام گفت
"پیکرِ گل آں اسیرِ چند و چوں — از مقامِ تحت و فوق آمد بروں!
خاک را پروازِ بے طیارہ داد — ثابتاں را جوہرِ سیارہ داد!"
نطق واد و راکش رواں چو آبجو — محوِ حیرت بودم از گفتارِ او
ایں ہمہ خواب است یا افسونگری — بر لبِ مریخیاں حرفِ دری!
گفت "بود اندر زمانِ مصطفیٰ — مردے از مریخیانِ باصفا
بر جہاں چشمِ جہاں بیں را کشاد — دل بہ سیرِ خطۂ آدم نہاد
پر کشود اندر فضاہائے وجود — تا بصحرائے حجاز آمد فرود

مریخ کے منجم کا جنتر منتر سے آنا

ایک بوڑھا، اس کی داڑھی مثلِ برف
علم و حکمت میں سبھی عمر اس کی صرف

تیز بیں علمائے مغرب کی مثال
جامہ بھی ترسائے مغرب کی مثال

دیر سال اور قدِ بالا مثلِ سرو
چہرہ روشن جس طرح ترکانِ مرو

"آشنائے رسم و راہِ ہر طریق"
اس کی آنکھوں سے عیاں فکرِ عمیق

دیکھ کر پاس آدمی کو خوش ہوا
ہم زباں تھا طوسی و خیام کا

"جستجو میں گم وہ پتلا خاک کا
زیر و بالا سب سے وہ آزاد تھا

خاک کو پروازِ بے طیارہ دی
ثابتوں کو فطرتِ سیارہ دی!"

آب جو جیسی روانی میں زباں
محوِ حیرت سن کے میں اس کا بیاں

خواب کا عالم تھا یا افسوں گری
بولیں مریخی زبانِ فارسی

بولا "دورانِ حیاتِ مصطفیٰ
عالمِ مریخ سے اک باصفا

عالمِ خاکی کا نظّارہ کیا
سیرِ خطّۂ خاک کا خواہاں ہوا

وہ فضاؤں میں سفر کرتا ہوا
آ کے صحرائے عرب میں رک گیا

آنچہ دید از مشرق و مغرب نوشت — نقشِ او رنگیں تر از باغِ بہشت!
بودہ ام من ہم بایران و فرنگ — گشتہ ام در ملکِ نیل و رودِ گنگ
دیدہ ام امریک و ہم ژاپون و چین — بہرِ تحقیقِ فلزّاتِ زمین
از شب و روزِ زمیں دارم خبر — کردہ ام اندر بر و بحرش سفر

پیشِ ما ہنگامہ ہائے آدم است
گرچہ او از کارِ ما نامحرم است!"

رُومی

من ز افلاکم رفیقِ من ز خاک — سرخوش و ناخوردہ از رگہائے تاک!
مردِ بے پروا و نامش زندہ رود — مستیٔ او از تماشائے وجود!
ما کہ در شہرِ شما افتادہ ایم — در جہاں و از جہاں آزادہ ایم
در تلاشِ جلوہ ہائے نو بنو — یک زماں ما را رفیقِ راہ شو

حکیمِ مریخی

ایں نواحِ مرغزینِ برخیاست — برخیا نامِ ابو الآبائے ماست
فرزمرزآں آمرِ کردارِ زشت — رفت پیشِ برخیا اندر بہشت

مشرق و مغرب میں جو دیکھا لکھا — نقش اک رشکِ جناں کھینچا رکھا
مَیں نے بھی دیکھے ہیں ایران و فرنگ — کی ہے سیرِ ملکِ نیل و رودِ گنگ
تھی تلاش معدنیاتِ زمیں — مَیں نے دیکھے امریکہ، جاپان و چین
ہوں زمین کے روز و شب سے باخبر — مَیں نے دیکھے ہیں سب اس کے بحر و بر
کارِ انساں سے ہیں ہم واقف مگر
وہ ہمارے کام سے ہیں بے خبر

رُومی

چرخ سے وابستہ مَیں، یہ خاک سے — مست یہ گو پی نہیں ہے تاک سے
اک قلندر نام اس کا زندہ رود — وجہِ مستی ہے تماشائے وجود
ہم تمہارے شہر میں ہیں میہماں — اس جہاں میں ہم ہیں آزادِ جہاں
تازہ جلووں کی ہے ہم کو جستجو — چل ذرا بہرِ تماشا لے کے تو

حکیمِ مریخی

مرغدیں برخیا ہے یہ مقام — برخیا اپنے ابو الآبا کا نام
فرزدمرز اک آمرِ بدکار تھا — برخیا کے پاس جنّت میں گیا

گفت "تو ایں جا چساں آسودۂ؟ عمرہا محکومِ یزداں بودۂ!
از مقامِ تو نکو تر عالمے است پیشِ او جنّت بہارِ یکدمے است
آں جہاں از ہر جہاں بالاتر است آں جہاں از لامکاں بالاتر است
نیست یزداں را ازاں عالم خبر من ندیدم عالمے آزاد تر!
نے خدائے در نظامِ او دخیل نے کتاب و نے رسول و جبرئیل!
نے طوافے نے سجودے اندرو نے دعائے نے درودے اندرو!"
برخیا گفت "اے فسوں پرداز خیز نقشِ خود را اندراں عالم بریز"
تا ابوالآبا فریبِ او نخورد حق جہانے دیگرے با ما سپرد

اندریں ملکِ خداداد سے گذر
مرغِ سدین و رسم و آئینش نگر!

بولا "کس غفلت میں اے ناداں ہے تو
مدتوں سے بندۂ یزداں ہے تو

اس سے بہتر اک جہاں ہے اور بھی
اور یہ جنّت ہے بہار اک لمحہ کی

وہ جہاں ہے ہر جہاں سے خوب تر
وہ جہاں ہے لامکاں سے خوب تر

اس سے خود یزداں نہیں ہے باخبر
ہے کہاں آزاد تر عالم دگر؟

نظم کو اس کے کوئی داور نہیں
وحی و جبریل و پیغمبر نہیں

طوفِ کعبہ ہے نہ احکام نماز
التجائیں ہیں نہ تحمید و نیاز"

برخیا بولا "فسوں گر اٹھ تو جا
اُس جہاں میں نقش خود اپنا بٹھا"

برخیا اس کے فسوں سے بچ گیا
یہ دگر عالم ہمیں حق نے دیا

یہ خدا کی دی ہوئی دنیا ہے دیکھ
یہ طریقِ مرغدیں کیسا ہے دیکھ

گردش در شہرِ مرغدین

مرغدین و آں عماراتِ بلند
من چہ گویم زاں مقامِ ارجمند

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش!

فکرِ شاں بے دردِ و سوزِ اکتساب
رازدانِ کیمیائے آفتاب!

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور
چوں نمک گیریم ما از آبِ شور!

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر
کارہا را کس نمی سنجد بزر!

کس ز دینار و درم آگاہ نیست
ایں بتاں را در حرم ہا راہ نیست

بر طبیعت دیوِ ماشیں چیرہ نیست
آسمانہا از دخانہا تیرہ نیست!

سخت کش دہقاں، چرا غش روشن است
از نہابِ دہ خدایاں ایمن است!

کشت و کارش بے نزاعِ آبجوست
حاصلش بے شرکتِ غیرے ازوست!

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں
نے کسے روزی خورد از کشت و خوں!

نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ
از فنِ تحریر و تشہیر دروغ!

نے ببازاراں ز بے کاراں خروش
نے صداہائے گدایاں در دگوش!

شہرِ مرغدیں کی سیر

مرغدیں اور اس کے بام و در بلند
کیا کہوں میں وہ مقامِ ارجمند!

بسنے والے اس کے سب شیریں سخن
خوبرو، خوش خلق، سادہ پیرہن

سب کے سب آزادِ فکر و روزگار
کیمیائے روشنی کے رازدار

سیم و زر کو روشنی کافی انہیں
جوں نمک لینے کو آبِ شور ہمیں

خدمت ان کو مقصدِ علم و ہنر
تولنے خدمت نہیں میزانِ زر

وہ نہ جانیں کیا ہیں دینار و درم
ان بتوں سے پاک ہیں ان کے حرم

کچھ جنوں ان کو مشینوں کا نہیں
اور دھوئیں سے آسماں کالا نہیں

اپنی محنت سے ہیں دہقاں شاد کام
ہے زمینداروں سے محفوظ یہ مقام

آبیاری میں کوئی دقّت نہیں
فصل میں اغیار کی شرکت نہیں

فوج، لشکر کا وہاں جھگڑا نہیں
خوں بہا کر رزق کوئی کھاتا نہیں

خامہ اس جا جھوٹ پھیلاتا نہیں
پاک ہے اس شر سے شہرِ مرغدیں

غولِ بے کاراں دوکانوں پر نہیں
اک بھکاری بھی نہ پاؤ گے کہیں

حکیم مریخی

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست!

زندہ رود

سائل و محروم تقدیرِ حق است — حاکم و محکوم تقدیرِ حق است
جز خدا کس خالقِ تقدیر نیست — چارۂ تقدیر از تدبیر نیست!

حکیمِ مریخی

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی روا است — زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہا است
ارضیاں نقدِ خودی در باختند — نکتۂ تقدیر را نشناختند
رمزِ باریکش بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است!
خاک شو تندرِ ہوا سازد ترا — سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا!
شبنمی؟ افتندگی تقدیرِ تست — قلزمی؟ پایندگی تقدیرِ تست!

حکیمِ مریخی

سائل و نادار کوئی اس جا نہیں
کوئی بندہ اور کوئی آقا نہیں

زندہ رود

سائل و محروم سب تقدیرِ حق
حاکم و محکوم سب تقدیرِ حق
ہے ہر اک تقدیر کا خالق خدا
ہو گا کیا تدبیر سے تقدیر کا

حکیمِ مریخی

ہو گا اک تقدیر سے خوں گر جگر
مانگ حق سے حکمِ تقدیرِ دگر
مانگنا تقدیرِ دیگر ہے روا
کیا ہے تقدیراتِ حق کی انتہا!
اہلِ دنیا نے گنوا دی ہے خودی
پس نہیں ان کو سمجھ تقدیر کی
رمز ہے اس حرف میں باریک تر
تو جو بدلے یہ بھی ہو جائے دگر
خاک اگر ہو گا اڑا دے گی ہوا
توڑے گا شیشے کو گر پتھر بنا
گر ہے شبنم آہ ہے تو خاک پر
ہاں رہے باقی سمندر ہے اگر

ہر زماں سازی ہماں لات و منات — از بتاں جوئی ثبات اے بے ثبات؟
تا بخود نا ساختن ایمانِ تست — عالم افکارِ تو زندانِ تست
رنج بے گنج است، تقدیر ایں چنیں — گنج بے رنج است، تقدیر ایں چنیں!
اصلِ دیں این است اگر اے بے خبر — می شود محتاج از و محتاج تر!
وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا — باز در خوابِ گراں دارد ترا!

سحر و افسون است یا دین است ایں؟
حبِ افیون است یا دین است ایں؟

می شناسی طبعِ درّاک از کجاست؟ — حورے اندر بنگہ خاک از کجاست؟
قوتِ فکر حکیماں از کجاست؟ — طاقتِ ذکر کلیماں از کجاست؟
ایں دل و ایں واردات او ز کیست؟ — ایں فنون و معجزات او ز کیست؟
گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست — شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است — فطرت از پروردگارِ فطرت است!
زندگانی چیست؟ کانِ گوہر است — تو امینی صاحبِ او دیگر است!
طبعِ روشنِ مردِ حق را آبروست — خدمتِ خلقِ خدا مقصود اوست!

خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است
مزدِ خدمت خواستن سوداگری است

ہم چناں ایں باد و خاک و آب و کشت — باغ و راغ و کاخ و کو و سنگ و خشت
اے کہ می گوئی متاعِ ماز ماست — مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

ڈھالتا ہے نو بہ نو لات و منات — مٹنے والوں سے تو خواہانِ ثبات
ہے بغاوت خود سے گر ایماں ترا — خود ترے افکار ہیں زنداں ترا
رنجِ لاحاصل کوئی تقدیر ہے؟ — گنجِ بے مشکل، کوئی تقدیر ہے؟
گر یہی ہے اصلِ دیں اے بے خبر — ہو گا محتاج آدمی محتاج تر
اف! وہ دیں غافل بنا دیتا ہے جو — تھپکیاں دے کر سُلا دیتا ہے جو

سحر ہے افسوں ہے یا یہ دین ہے؟
دانۂ افیوں ہے یا یہ دین ہے؟

ہے خبر؟ کیا چیز ہے فہم رسا — خاک داں میں حور! کیا ہے ماجرا؟
ہے کہاں سے قوتِ فکرِ حکیم؟ — ہے کدھر سے طاقتِ ذکرِ کلیم؟
کیسا یہ دل کس سے اس کے واردات؟ — کس کے باعث ہیں فنون و معجزات
خوش بیاں ہے؟ یہ ترا جوہر نہیں — خود عمل تیرا، ترا جوہر نہیں
فیضِ فطرت ہیں یہ سارے کاروبار — صانعِ فطرت ہے خود پروردگار
زندگانی کیا ہے؟ اک کانِ گہر — صرف امیں تو، اس کا مالک ہے دگر
مردِ حق کو طبعِ روشن سے جِلا — اس کا مقصد خدمتِ خلقِ خدا

خلق کی خدمت رہِ پیغمبری
مقصدِ اجرت ہو تو وہ سوداگری

ہیں یوں ہی سب ابر و باد و کشت و زار — سنگ و خشت و کاخ و کو دشت و دیار
مال کو سمجھا تو، اپنا مال ہے — جو بھی ہے، ناداں! خدا کا مال ہے

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوا ؟
ابنِ آدم دل با بلیسی نہاد من ز ابلیسی ندیدم جز فساد !
کس امانت را بکارِ خود نبرد اے خوش آں کو مُلکِ حق باحق سپرد
بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست داغم از کالے کہ شایانِ تو نیست !
گر تو باشی صاحبِ شی، می سزد ور نباشی، خود بگو کے می سزد
ملکِ یزداں را بیزداں باز دہ تاز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست ؟ آنچہ از مولاست می گوئی زماست !
بندۂ کز آب و گل بیروں نجست شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست !
اے کہ منزل را نمی دانی زرہ قیمتِ ہر شی ز اندازِ نگہ !
تا متاعِ تست گوہر گوہر است ورنہ سنگ است از پشیز کمتر است !

نوعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود
ایں زمین و آسماں دیگر شود

ہے زمیں اللہ کی، اپنا تا ہے تو
کیا ہیں، بتلا معنیٔ لَا تُفسِدُوا؟

کارِ ابلیسی ہے دل انساں کا شاد!
کیا ہے ابلیسی بجز مکر و فساد

کون کہتا ہے امانت کو حلال؟
چاہئے حق کے حوالے حق کا مال

لے لیا وہ مال جو تیرا نہیں
مَیں دکھی ہوں تجھ کو یہ زیبا نہیں

مال اگر تیرا ہے، اپنا لے بجا!
خود بتا! ورنہ ہے کب تجھ کو روا؟

کر سپرد اللہ کے مِلکِ اللہ کی
الجھنیں تا دور ہو جائیں تری

مفلسی، ناداری کی ہے وجہ کیا؟
تُو نے حق کے مال کو اپنا لیا!

بھا گئی جس کو بھی آب و گل کی چاہ
ہو رہے گا اپنے ہاتھوں خود تباہ

راہ و منزل کی نہیں تجھ کو تمیز
ہے بس اندازِ نظر پر قدر چیز

جب تلک تیرا ہے گوہر ہے عزیز
ورنہ پتھر ہے، نہیں وہ کوئی چیز

گر نظر بدلے بدل جائے جہاں
اور ہی ہوں گے زمیں و آسماں

احوالِ دوشیزۂ مریخ کہ دعوائے رسالت کردہ

در گذشتیم از ہزاراں کوہ و کاخ
بر کنارِ شہرِ میدانِ فراخ!

اندراں میداں ہجومِ مرد و زن
در میاں یک زن قدش چو نارون

چہرہ اش روشن ولے بے نورِ جاں!
معنیٔ او بر بیانِ او گراں!

حرفِ او بے سوز و چشمش بے نمے
از سرورِ آرزو نامحرمے!

فارغ از جوششِ جوانی سینہ اش
کور و صورت ناپذیر آئینہ اش!

بے خبر از عشق و از آئینِ عشق
صعوۂ رد کردۂ شاہینِ عشق!

گفت باما آں حکیمِ نکتہ داں
"نیست ایں دوشیزہ از مریخیاں

سادہ و آزادہ و بے ریو و رنگ
فرزمرز او را بدزدید از فرنگ

پختہ در کارِ نبوت ساختش
اندریں عالم فرو انداختش!

گفت نازل گشتہ ام از آسماں
دعوتِ من دعوتِ آخر زماں!

از مقامِ مرد و زن دارد سخن
فاش تر می گوید اسرارِ بدن!

نزدِ ایں آخر زماں تقدیرِ زیست
در زبانِ ارضیاں گویم کہ چیست"

دوشیزۂ مریخ کا احوال جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا

کوچوں، ایوانوں سے ہوتے چل دیا — شہر سے ملحق کھلا میدان تھا
اک ہجومِ مرد و زن پایا وہاں — اک حسینہ سرو قد تھی درمیاں
چہرہ روشن اس کا تن بے نورِ جاں — تھے بیاں کے واسطے معنی گراں
سوز باتوں میں نہ آنکھوں میں نمی — بے سرورِ آرزو اک آدمی
اس کا دل جوشِ جوانی سے تہی — آئینہ اندھا، نہ جانے روکشی
عشق و راہِ عشق سے بیگانہ تھی — عشق کے شاہین کی رد کردہ تھی
پیرِ مریخی نے بتلایا وہیں — "یہ جو دوشیزہ ہے مریخی نہیں"
سادہ و آزادہ، بے مکر و دغا — فرزمرز افرنگ سے لایا اڑا
درس سب کارِ نبوت کا دیا — عالمِ مریخ میں نازل کیا
بولی "نازل ہوں فلک سے میں یہاں — میری دعوت، دعوتِ آخر زماں"
اس کی تعلیماتِ جنسِ مرد و زن — کھل کے کہتی ہے سب اسرارِ بدن

اس کے آگے زندگی کی انتہا
آبہ لغتِ خاکیاں، بولوں ہے کیا"

تذکیر نبیہ مریخ

اے زناں! اے مادراں! اے خواہراں!
زیستن تا کے مثالِ دلبراں؟

دلبری اندر جہاں مظلومی است
دلبری محکومی و محرومی است!

در دو گیسو شانہ گردانیم ما
مرد را نخچیرِ خود دانیم ما

مرد صیادی بہ نخچیری کند
گردِ تو گردد کہ زنجیری کند!

خود گداز یہائے او مکر و فریب
در دو داغ و آرزو مکر و فریب!

گرچہ آں کافر حرم سازد ترا
مبتلائے درد و غم سازد ترا

ہمبرِ او بودن آزارِ حیات
وصلِ او زہر و فراقِ او نبات

مارِ پیچاں! از خم و پیچش گریز
زہر ہایش را بخونِ خود مریز!

از امومت زرد روئے مادراں!
اے خنک آزادیٔ بے شوہراں!

وحی یزداں پَے بہ پَے آید مرا
لذّتِ ایماں بیفزاید مرا

آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن
می تواں دیدن جنین اندر بدن!

حاصلے بر داری از کشتِ حیات
ہر چہ خواہی از بنین و از بنات!

گر نباشد بر مرادِ ما جنیں
بے محابا کشتنِ او عینِ دیں!

نبیہ سیارہ مریخ کی دعوت

عورتو! اے ماؤ! اے بہنو! سنو!
دلبروں سی زندگی کب تک کہو!

دلبری دنیا میں مظلومی کا نام
دلبری محکومی، محرومی کا نام

زلف کو اپنی بنا لیتی ہیں ہم
مرد کو صید اپنا کہہ دیتی ہیں ہم

صید بن کر مرد کرتے ہیں شکار
پھانستے ہیں گرد پھر کر بار بار

موم سا ان کا پگھلنا بھی فریب
حسرتوں میں ان کا جلنا بھی فریب

گرچہ وہ تم کو بناتا ہے حرم
تم کو کرتا ہے اسیرِ درد و غم

اس کی صحبت زندگی میں قہر ہے
ہجر فتنہ اور وصل اس کا زہر ہے

مارِ پیچاں ہے فریب اس کا نہ کھا
زہر سے اس کے لہو اپنا بچا

زرد رو ہو جاتی ہے ماں بن کے زن
مرحبا جو بن بیاہی ہیں مگن

وحی مجھ پر آ رہی ہے متصل
نورِ ایماں سے مرا روشن ہے دل

علم و فن کیا؟ معجزے سے کم نہیں
رحم میں اب دیکھ سکتے ہیں جنیں

زندگی میں چاہو جو بھی پاؤ گی
حسبِ مرضی بیٹا بیٹی پاؤ گی

اپنی مرضی پر نہیں ہیں گر جنیں
بے محابا مار دینا عین دیں

در پسِ ایں عصرِ اعصارِ دگر — آشکارا گردد اسرارِ دگر
پرورش گیرد جنیں نوعِ دگر — بے شبِ ارحام دریابد سحر!
تا بمیرد آں سراپا اہرمن — ہمچو حیواناتِ ایامِ کہن!
لالہ ہا بے داغ و با دامانِ پاک — بے نیاز از شبنمے خیزد ز خاک!
خود بخود بیروں فتد اسرارِ زیست — نغمہ بے مضراب بخشد تارِ زیست!
آنچہ از نیساں فرو ریزد مگیر — اے صدف در زیرِ دریا تشنہ میر
خیز و با فطرت بیامیز رستیز — تا ز پیکارِ تو حُر گردد کنیز!
رستن از ربطِ دو تن توحید زن
حافظِ خود باش و بر مرداں متن!

رُومی

مذہبِ عصرِ نو آئینے نگر — حاصلِ تہذیبِ لادینے نگر!
زندگی را شرع و آئین است عشق — اصلِ تہذیب است دیں دین است عشق!
ظاہرِ او سوز ناک و آتشیں — باطنِ او نورِ ربّ العالمیں!
از تب و تابِ درونش علم و فن — از جنونِ ذوفنونش علم و فن!
دیں نگردد پختہ بے آدابِ عشق
دیں بگیر از صحبتِ اربابِ عشق!

آنے والے اور بھی تو دور ہیں — انکشاف اس وقت کے بھی اور ہیں
پل سکیں گے یہ جنیں طرزِ دگر — بے شبِ ارحام دیکھیں گے سحر
ختم تا ہو کر رہے وہ اہرمن — جیسے حیوانات ایامِ کہن
لالہ بے داغ آ سکیں گے خاک سے — نہ جھکیں گے قطرہ شبنم کیلئے
ہوں گے از خود فاش اسرارِ حیات — بج سکیں گے زخمہ بن تارِ حیات
بارشِ نیساں سے لب کوثر نہ کر — اے صدف تو زیرِ دریا تشنہ مر
اٹھ ذرا فطرت سے کر نے معرکہ — تا کہ جو لونڈی ہے ہو جائے رہا

ترکِ ربطِ دو بدن توحید زن
کر تحفظ اپنا مردوں پر نہ تن

رومی

عہدِ نو کے دین و آئیں دیکھنا! — حاصلِ تہذیبِ لادیں دیکھنا!
زندگی کی شرع اور آئیں ہے عشق — اصل میں تہذیب دیں، اور دیں ہے عشق
اس کا ظاہر سوز ناک اور آتشیں — اس کا باطن نورِ رب العالمیں
اس کی تابِ اندروں سے علم و فن — ہے جنوں ذوفنوں سے علم و فن

دیں نہ ہو گا پختہ بے آدابِ عشق
دیں ہے فیضِ صحبتِ اربابِ عشق

فلکِ سرشتی

ارواحِ جلیلۂ حلّاج و غالب و قرۃ العین طاہرہ

کہ بہ نشیمنِ بہشتی نگرویدند و بگردشِ جاوداں گرائیدند

من فدائے ایں دلِ دیوانۂ
ہر زماں بخشد دگر ویرانۂ

چوں بگیرم منزلے گوید کہ خیز!
مردِ خود رس بحر را داند قفس

زانکہ آیاتِ خدا لا انتہاست
اے مسافر جادہ را پایاں کجاست؟

کارِ حکمت دیدن و فرسودن است
کارِ عرفاں دیدن و افزودن است!

آں بسنجد در ترازوئے ہنر
ایں بسنجد در ترازوئے نظر!

آں بدست آورد آب و خاک را
ایں بدست آورد جانِ پاک را!

آں نگہ را بر تجلی می زند
ایں تجلی را بخود گم می کند!

در تلاشِ جلوہ ہائے پے بہ پے
طے کنم افلاک و می نالم چو نے!

ایں ہمہ از فیضِ مردے پاک زاد
آں کہ سوزِ او بجانِ من فتاد!

کاروانِ ایں دو بینائے وجود
بر کنارِ مشتری آمد فرود!

آں جہاں آں خاکدانے ناتمام
در طوافِ او قمرہا تیز گام

حلاج، غالب و قرۃ العین طاہرہ کی بزرگ روحیں بہشت چھوڑ کر سیر دوام کی گرویدہ ہیں

ہوں فدائیں اس دلِ دیوانہ پر
ہر گھڑی بخشے جو ویرانہ دگر

رک گیا جب بھی کہا اس نے چلو!
مرد ہو، پایاب ہے دریا بڑھو!

چوں کہ ہیں آیاتِ حق بے انتہا
ختم ہو گا بھی کہیں یہ راستا؟

کام حکمت کا ہے تعلیقِ یقیں
کام عرفاں کا ہے توثیقِ یقیں

ہے ترازوئے ہنر سے، اس کی جانچ
اور ترازوئے نظر سے اس کی جانچ

اس کا حصہ ہے جہانِ آب و خاک
اس کی کوشش کا صلہ ہے جانِ پاک

ہے تجلیات پر اُس کی، نظر
جذب کر لینا نہیں اِس کا ہنر

نو بہ نو جلووں کی مجھ کو جستجو
آسمانوں پر بھی میری 'ہائے و ہو'

پیرِ رومی کا یہ سب احسان ہے
حاملِ سوزان سے میری جان ہے

بس کہ دو اہلِ نظر کا قافلہ
اب حدودِ مشتری سے آ لگا

وہ جہاں اک نامکمل خاک داں
ہیں بہت سے چاند گرد اس کے رواں

خالی از می شیشۂ تاکش ہنوز
آرزو نارستہ از خاکش ہنوز

نیم شب! از تابِ ماہاں نیم روز
نے برودت در ہوائے او نہ سوز

من چو سوئے آسماں کردم نظر
کوکبش دیدم بخود نزدیک تر

ہیبت نظارہ از ہوشم ربود
شد دگرگوں نزد و دور و دیر و زود!

پیشِ خود دیدم سہ روحِ پاکباز
آتش اندر سینہ شاں گیتی گداز!

در برِ شاں حلہ ہائے لالہ گوں
چہرہ ہا رخشندہ از سوزِ دروں!

در تب و تابے ز ہنگامِ الست
از شرابِ نغمہ ہائے خویش مست!

گفت رومی "این قدر از خود مرو
از دمِ آتش نوایاں زندہ شو!

شوقِ بے پروا ندیدستی نگر!
زور این صہبا ندیدستی نگر!

غالب و حلاج و خاتونِ عجم
شورہا افگندہ در جانِ حرم!

این نواہا روح را بخشد ثبات
گرمیٔ او از درونِ کائنات!"

نوائے حلّاج

ز خاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلّیٔ دگرے در خورِ تقاضا نیست!

نظر بخویش چناں بستہ ام کہ جلوۂ دوست
جہاں گرفت و مرا فرصتِ تماشا نیست!

مے ابھی نایاب اس کے تاک میں
آرزو ناپید اس کی خاک میں

چاند اتنے، نیم شب بھی نیم روز!
نے ہواؤں میں نمی اس کی نہ سوز!

آسماں پر میں نے دوڑائی نظر
اس کے تارے ہو گئے نزدیک تر

ہیبتِ نظارہ سے ہوش اڑ گئے
وقت ویسا تھا نہ ویسے فاصلے

تین ارواحِ جلیلہ تھیں وہاں
آتشِ گیتی گداز ان میں نہاں

تھے بدن پر ان کے خونیں پیرہن
صورتیں پُرنور، سینوں میں جلن

اک تڑپ ان میں ازل کے روز سے
مست اپنے حال میں گاتے ہوئے

بولے رومی اس طرح خود کو نہ کھو
اٹھ دمِ آتش نوا سے زندہ ہو

شوقِ بے پروا نہیں دیکھا تھا دیکھ!
زورِ اس مے کا نہیں دیکھا تھا دیکھ!

غالب و حلاج و خاتونِ عجم
ان کے باعث پُرفغاں جانِ حرم

روح کو ہے ایسے نغموں سے ثبات
ان میں ہے سوزِ درونِ کائنات

نوائے حلاج

کر آگ خود میں وہ روشن جو آشکار نہیں
تجلیات سے اوروں کی کوئی کار نہیں

جہاں میں جلوۂ جاناں سبھی، میں آپ میں غرق
ادھر بھی دیکھوں کسی دم پہ اختیار نہیں

بملکِ جم ندہم مصرعِ نظیری را — کسے کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست
اگرچہ عقلِ فسوں پیشہ لشکرے انگیخت — تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست
تو رہ شناش نہ ز مقام بے خبری — چہ نغمہ الیست کہ در بربطِ سلیمے نیست
ز قیدِ صیدِ نہنگاں حکایتے آور — مگو کہ زورقِ ما رو شناسِ دریا نیست
مریدِ ہمتِ آں رہروم کہ پا نگذاشت — بہ جادۂ کہ در و کوہ و دشت و دریا نیست

شریکِ حلقۂ رندانِ بادہ پیما باش
حذر ز بیعتِ پیرے کہ مرد غوغا نیست!

نوائے غالب

"بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہمزباں سخن نکنیم — وگر خلیل شود میہماں بگردانیم
بجنگ باج ستانانِ شاخساری را — تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بصلح بال فشانانِ صبحگاہی را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

ز حیدریم من و تو ز ما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم"

نہ دوں یہ مصرعہ نظیری کا ملکِ جم کے عوض
جمائے عقلِ فسوں پیشہ کتنے ہی لشکر
رہ و مقام نہ پایا تو بے خود ایسا ہے
شکار و صید نہنگاں کی کہہ تو، یہ نہ سنا
غلام ہوں میں اسی راہ رو کی ہمّت کا

ہمارے خوں سے نہیں جو قتیلِ یار نہیں،
اکیلا عشق بھی تو ہنگامِ کارزار نہیں
کسی الاپ سے بیگانہ سازِ یار نہیں
کہ میری ناؤ کو دریا سے کوئی کار نہیں
وہ رخ نہ جائے جدھر دشت و کوہسار نہیں

بھلی ہے صحبتِ رندانِ بادہ خوار تجھے
وہ پیر کاہے کو جو مردِ گیر و دار نہیں

نوائے غالب

چلو کہ دہر میں اک انقلاب لے آئیں
ذرا بھی خدشہ لگے گر عتابِ حاکم کا
رہیں خموش بنے ہم زباں کلیم اگر
وہ باغباں سہی گر جنگ پر اُتر آئے
مگر جو صلح طلب بن کے آئے مرغِ سحر

چلائیں جامِ قضا خود ہم آپ چھلکائیں
عطائے خلعتِ شاہی کو صاف ٹھکرائیں
خلیل چاہے تو اضع تو گھر نہ لے جائیں
کلی بھی چھونے نہ دیں، خالی ہاتھ لوٹائیں
تو باغ میں اسے تا آشیانہ پہنچائیں

رگوں میں خونِ علیؓ ہے رواں تو کیا ہے عجب
پسِ غروب بھی سورج کو بام پر لائیں

نوائے طاہرہ

"گر بتو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رُو بروُ
شرح دہم غمِ ترا نکتہ بنکتہ مو بمو!
از پئے دیدنِ رخت ہمچو صبا فتادہ ام
خانہ بخانہ در بدر کوچہ بکوچہ کو بکو!
می رود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام
دجلہ بدجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بجو!
مہرِ ترا دلِ حزیں بافتہ بر قماشِ جاں
رشتہ برشتہ نخ بہ نخ تار بہ تار پو بہ پو!
در دلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا
صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو!"

سوز و سازِ عاشقانِ دردمند — شورہائے تازہ در جانم فگند
مشکلاتِ کہنہ سر بیروں زدند — باز براندیشہ ام شبخوں زدند!
قلزمِ فکرم سراپا اضطراب — ساحلش از زورِ طوفانے خراب!
گفت رومی وقت را از کف مدہ — اے کہ می خواہی کشودِ ہر گرہ!

چند در افکارِ خود باشی اسیر
ایں قیامت را بروں ریز از ضمیر!

نوائے طاہرہ

دیکھ لوں گر تجھے کبھی چہرہ بہ چہرہ رُو بَرُو
شرحِ الم بیاں کروں نکتہ بنکتہ مو بمو
ذوقِ لقا میں ہوں سدا مثلِ صبا رواں دواں
خانہ بخانہ، در بدر، کوچہ بہ کوچہ، کو بہ کو
بہتا ہے آنکھوں سے مری ہجر میں تیرے خونِ دل
دجلہ بدجلہ، یم بہ یم، چشمہ بہ چشمہ، جو بجو
قلبِ حزیں نے تان دی چادرِ عشق جان پر
رشتہ بہ رشتہ، نخ بہ نخ، تار بہ تار، پو بہ پو
چھانی جو دل کو طاہرہ، تیرے سوا نہ کچھ ملا
صفحہ بہ صفحہ، لا بہ لا، پردہ بہ پردہ، تو بہ تو

دردمندِ عشاق کے نالے ادھر ڈھا رہے تھے حشر میری جان پر
وہ پرانی مشکلیں تازہ ہوئیں اور میرے ہوش پر شب خوں گریں
ہوگیا بحرِ تخیل موجزن زور اس سیلاب کا ساحل شکن
بولے رومی وقت ایسا کھو نہ دے! دھن جو ہے عقدہ کشائی کی تجھے

کیا یوں ہی گھٹ گھٹ کے رہنا ہے تجھے
دل میں جو طوفاں ہے باہر لا اسے

زندہ رود مشکلاتِ خود را پیشِ ارواحِ بزرگ میگوید

از مقامِ مومناں دوری چرا؟
یعنی از فردوس مہجوری چرا؟

حلّاج

مرد آزادے کہ داند خوب و زشت — می نگنجد روحِ او اندر بہشت!
جنّتِ ملّا می و حور و غلام — جنّتِ آزادگاں سیرِ دوام!
جنّتِ ملّا خور و خواب و سرود — جنّتِ عاشق تماشائے وجود!
حشرِ ملّا شقِّ قبر و بانگِ صور — عشقِ شور انگیز خود رستخیز صبح نشور!
علم بر بیم و رجا دارد اساس — عاشقاں را نے امید و نے ہراس!
علم ترساں از جلالِ کائنات — عشق غرق اندر جمالِ کائنات
علم را بر رفتہ و حاضر نظر — عشق گوید آنچہ می آید نگر!
علم پیماں بستہ با آئینِ جبر — چارۂ او چیست غیر از جبر و صبر
عشقِ آزاد و غیور و ناصبور — در تماشائے وجود آمد جسور!
عشقِ ما از شکوہ ہا بیگانہ ایست — گرچہ او را گریۂ مستانہ ایست
ایں دلِ مجبورِ ما مجبور نیست — ناوکِ ما از نگاہِ حور نیست!

زندہ رود اپنی مشکلات کو ارواحِ بزرگ سے بیان کرتا ہے

تم مقامِ مومناں سے دور کیوں؟
یعنی تم فردوس سے مہجور کیوں؟

حلّاج

مردِ حُر جو جانتا ہے خوب و زشت
تنگ اس کے واسطے باغِ بہشت

جنّتِ ملّا مے و حور و غلام
جنّتِ آزاد ہے سیرِ دوام

خلدِ ملّا خواب و خوراک و سرود
عاشقوں کی خلد دیدارِ وجود

حشرِ ملّا شقِ قبر و بانگِ صور
عشق شور انگیز ہی صبحِ نشور

خوف اور امید پایہ علم کا
عاشقوں کو خوف کیا، امید کیا!

علم کو خوفِ جلالِ کائنات
عشق ہے غرقِ جمالِ کائنات

حال و ماضی پر نظر ہے علم کی
عشق دیکھے آگے جو آئے وہی

علم کو مرغوب ہے آئینِ جبر
کیا ہے چارہ اس کا غیر از جبر و صبر؟

عشق آزاد و غیور و ناصبور
وہ ہے لذّت کوش ہنگامِ حضور

سب گلوں شکوؤں سے ہے بیگانہ عشق
گو ہے وقف گریۂ مستانہ عشق

یہ دلِ مجبور کب مجبور ہے؟
اس کو ناوک کب نگاہِ حور ہے؟

آتشِ ما را بیفزاید فراق — جانِ ما را سازگار آید فراق!
بے خلشہا زیستن نا زیستن — باید آتش در تہِ پا زیستن!
زیستن ایں گونہ تقدیرِ خودی است — از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی است!
ذرہ از شوقِ بے حد رشکِ مہر — گنجد اندر سینۂ او نہ سپہر!
شوق چوں بر عالمے شبخوں زند
آنیاں را جاودانی می کند!

زندہ رود

گردشِ تقدیر مرگ و زندگی است
کس نداند گردشِ تقدیر چیست!

حلّاج

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ — لرزد از نیرنگِ او ابلیس و مرگ!
جبرِ دینِ مردِ صاحب ہمت است — جبرِ مرداں از کمالِ قوت است!
پختہ مردے پختہ تر گردد ز جبر — جبرِ مردِ خام را آغوشِ قبر!
جبرِ خالد عالمے برہم زند — جبرِ ما بیخ و بنِ ما برکند!
کارِ مردانِ است تسلیم و رضا — بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا!
تو کہ دانی از مقامِ پیرِ رومؔ — می ندانی از کلامِ پیرِ رومؔ؟

آتشِ دل کو ہوا دیتا ہے ہجر
ہاں ہماری جان کو زیبا ہے ہجر

بے خلش یہ زندگی کیا زندگی!
چاہیئے آتش تہِ پا زندگی

اس طرح جینا ہی تقدیرِ خودی
ہے اسی میں رازِ تعمیرِ خودی

شوقِ بیحد سے ہے ذرہ رشکِ مہر
اس کے سینہ میں ہیں گم یہ نو سپہر

عشق کی زد میں جو آجائے جہاں
ملتی ہے آنی کو عمرِ جاوداں

زندہ رود

مرنا جینا گردشِ تقدیر پر
گردشِ تقدیر خود کیا ہے مگر؟

حلّاج

جس کو پوری مل گئی تقدیر کی
اس سے لرزاں موت بھی ابلیس بھی

جبر ہے مردانِ ہمت کا شعار
جبرِ مردانِ شان کامل اختیار

مردِ پختہ، پختہ تر ہے وجہِ جبر
جبرِ مردِ خام کو آغوشِ قبر

جبرِ خالد سے جہاں زیر و زبر
جبر اپنا ہے ہلاکت سر بہ سر

کام ہے مردوں کا تسلیم و رضا
یہ قبا کمزور کو ہے ناسزا

جانتا ہے تو مقامِ پیرِ روم
کیا نہیں سمجھا کلامِ پیرِ روم

"بود گبرے در زمانِ بایزید
گفت او را یک مسلمانِ سعید
خوشتر آں باشد کہ ایماں آوری
تا بدست آید نجات و سروری
گفت ایں ایماں اگر ہست اے مرید
آنکہ دارد شیخِ عالم بایزید
من ندارم طاقتِ آں تابِ آں (رومی)
کاں فزوں آمد ز کوششہائے جاں!"

کارِ ما غیر از امید و بیم نیست
ہر کسے را ہمتِ تسلیم نیست!
اے کہ گوئی بود نی ایں بود، شد
کارہا پابندِ آئیں بود، شد
معنیٔ تقدیرِ کم فہمیدۂ ق
نے خودی را نے خدا را دیدۂ
مردِ مومن با خدا دارد نیاز
'با تو ما سازیم تو با ما بساز'

عزم او خلّاقِ تقدیرِ حق است
روزِ ہیجا تیرِ او تیرِ حق است!

زندہ رود

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند
بندۂ حق را بدار آویختند!
آشکارا بر تو پنہانِ وجود
باز گو آخر گناہِ تو چہ بود؟

اک مجوسی سے مسلمانِ سعید
بولا دورانِ حیاتِ بایزید
ہے یہی بہتر کہ ایماں لائے تو
رستگاری، سروری تا پائے تو
بولا گر یہ ہے وہ مسلک اے مرید!
گامزن ہیں جس پہ شیخِ بایزید
مَیں نہیں رکھتا وہ طاقت وہ مجال
اس میں کوشش بھی ہے اک کارِ محال

کام اپنا ہے فقط بیم و رجا
سب ہیں کب قادر بہ تسلیم و رضا
تو یہ کہتا ہے جو ہونا تھا ہوا
ہر عمل پابند ہے تقدیر کا
معنیٔ تقدیر کو سمجھا نہیں
ق
کیا خودی ہے، کیا خدا پایا نہیں
حق سے مومن کا ہے پنہاں اقتضا
ہم ترے ہیں تو ہمارا ہو بھی جا
عزم اس کا خالقِ تقدیرِ حق
روزِ ہیجا تیرِ اس کا تیرِ حق

زندہ رود

بے بصیرت ظلم پر باندھے کمر
بندۂ حق کو چڑھائے دار پر!
تجھ پہ روشن رازِ پنہانی بتا!
ہو گئی ویسی بھی کیا سرزد خطا

حلّاج

بود اندر سینۂ من بانگِ صور — ملّتے دیدم کہ دارد قصدِ گور!
مومناں با خوئے و بوئے کافراں — لاالہ گویان و از خود منکراں!
"امرِ حق" گفتند نقشِ باطل است — زانکہ او وابستۂ آب و گل است
من بخود افروختم نارِ حیات — مردہ را گفتم ز اسرارِ حیات!
از خودی طرحِ جہانے ریختند — دلبری با قاہری آمیختند!
ہر کجا پیدا و ناپیدا خودی — بر نمی تابد نگاہ ما خودی!
نار ہا پوشیدہ اندر نورِ اوست — جلوہ ہائے کائنات از طورِ اوست
ہر زماں ہر دل دریں دیرِ کہن — از خودی در پردہ می گوید سخن
ہر کہ از نارش نصیبِ خود نبرد — در جہاں از خویشتن بیگانہ مرد
ہند و ہم ایراں ز نورش محرم است — آنکہ نارش ہم شناسد آں کم است!
من ز نور و نار او دادم خبر — بندۂ محرم! گناہِ من نگر!

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس!
محشرے بر مُردہ آوردی بترس!

طاہرہ

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں — کائنات تازۂ آید بروں!
شوقِ بے حد پردہ ہا را بر درد — کہنگی را از تماشا می برد!

حلّاج

گونجتی تھی مجھ میں اک آوازِ صور
اور ملّت کر رہی تھی قصدِ گور

مومنوں میں دیکھی خو بو کفر کی
کلمہ گویوں میں تھا انکار خودی

روحِ انسانی کو باطل کہہ دیا
چونکہ رشتہ اس کا آب و گِل سے تھا

خود میں روشن مَیں نے کی نارِ حیات
کہہ دیا مُردوں سے اسرارِ حیات

کی خودی سے حق نے سب کی ابتدا
دلبری میں قاہری شامل کیا

ہے خودی پنہاں و پیدا ہر کہیں
دیکھنے کا ہم کو ہی یارا نہیں

شعلے پوشیدہ ہیں اس کے نور میں
ہے تجلّی کائنات اس طور میں

اس جہاں میں ہر کوئی دل ہر گھڑی
رہتا ہے در پردہ مشغولِ خودی

جو بھی ہے بے بہرۂ نارِ خودی
مرتا ہے وہ آپ سے بیگانہ ہی

ہند و ایران جانیں اس کا نور ہی
نار سے اس کی نہیں واقف کوئی

مَیں نے نور و نار سے دی آگہی
میرے ہمدم ہے خطا میری یہی

جو کیا مَیں نے نہ کر تو، الحذر
دے نہ مردوں کو تو محشر کی خبر

طاہرہ

لغزشِ اہلِ جنوں سے ہر زماں
کائنات تازہ ہوتی ہے عیاں

شوقِ بیحد پردے کر دیتا ہے چاک
نقشِ کہنہ اس سے ہو جاتے ہیں پاک

آخر از دار و رسن گیرد نصیب برنگردد زندہ از کوئے حبیب!
جلوۂ او بنگر اندر شہر و دشت تا نہ پنداری کہ از عالم گذشت!
در ضمیرِ عصر خود پوشیدہ است
اندریں خلوت چساں گنجیدہ است؟"

زندہ رود

اے ترا دادند دردِ جستجوے معنیٔ یک شعرِ خود با من بگوے
"قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختۂ کیست؟"

غالب

نالۂ کو خیزد از سوزِ جگر ہر کجا تاثیرِ او دیدم دگر!
قمری از تاثیرِ او واسوختہ بلبل از وے رنگہا اندوختہ!
اندرو مرگے بآغوشِ حیات یک نفس اینجا حیات آنجا ممات!
آنچناں رنگے کہ ارژنگی از و ست آنچناں رنگے کہ بیرنگی از و ست
تو ندانی ایں مقامِ رنگ و بو ست قسمتِ ہر دل بقدرِ ہائے و ہو ست!

یا برنگ آیا بہ بیرنگی گذر
تا نشانے گیری از سوزِ جگر!

ہو گا آخر ایک دن وہ زیبِ دار کوئے جاناں میں کرے گا جاں نثار
بے دیار و دشت میں وہ جلوہ گر جائے گا کیوں کر یہ عالم چھوڑ کر
وہ ضمیرِ عصرِ حاضر میں نہاں
کیا کہوں، کیوں کر سمایا ہے یہاں

زندہ رود

اے کہ دردِ جستجو حاصل تجھے کر بیاں اس شعر کے معنی مجھے
"قمری ہے اِدھر راکھ اُدھر رنگ پہ بلبل
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟"

غالب

نالہ جو ہے حاصلِ سوزِ جگر ہر جگہ تاثیر ہے اس کی دگر
جل کے خاکستر ہیں اس میں قمریاں ڈوب کر رنگوں میں بلبل شادماں
ہے یہاں پر موت ہمدوشِ حیات ہے حیات اک لمحہ، اک لمحہ ممات
ڈوب کر رنگوں میں جوں ارژنگ ہے رنگ بھی اتنا کہ جوں بے رنگ ہے
بے خبر یہ ہے مقامِ رنگ و بو ویسی قسمت جس کی جیسی ہائے وھو،
رنگ پیدا کر تو یا بے رنگ بن
تا کہ جانے کیا ہے سینہ کی جلن

زندہ رود

صد جہاں پیدا دریں نیلی فضاست
ہر جہاں را اولیا و انبیاست ؟

غالب

نیک بنگر اندریں بود و نبود — پے بہ پے آید جہانہا در وجود!
ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینؐ ہم بود!

زندہ رود

فاش تر گو زانکہ فہم نارساست

غالب

ایں سخن را فاش تر گفتن خطاست!

زندہ رود

گفتگوئے اہلِ دل بے حاصل است ؟

غالب

زندہ رود

تازہ دنیاؤں سے پُر نیلی فضا
کیا ہیں ہر جا اولیا و انبیا؟

غالب

غور سے دیکھیں جو یہ بود و نبود
پا رہے ہیں پے بہ پے عالم وجود
جس جگہ بھی ہو گا غوغائے جہاں
رحمت اللعالمینؐ بھی ہے وہاں؟

زندہ رود

فاش تر کہئے نہ پایا کیسا کہا!

غالب

فاش تر اس کو بتانا ہے خطا

زندہ رود

کیا بیانِ اہلِ دل بیکار ہے؟

غالب

نکتہ را برلب رسیدن مشکل است!

زندہ رود

تو سراپا آتش از سوزِ طلب!
بر سخن غالب نیائی اے عجب!

غالب

خلق و تقدیر و ہدایت ابتد است
رحمۃ للعالمینی انتہاست!

زندہ رود

من ندیدم چہرۂ معنی ہنوز
آتشے داری اگر ما را بسوز!

غالب

اے چوں من بینندۂ اسرارِ شعر
ایں سخن افزوں تر است انسارِ شعر

شاعراں بزم سخن آراستند
ایں کلیماں بے یدِ بیضا ستند

آنچہ تو از من بخواہی کافری است
کافری کو ماورائے شاعری است!

تا بہ لب بات آسکے دشوار ہے

زندہ رود

آگ ہے تُو باعثِ سوزِ طلب!
کیوں نہیں غالبؔ بیاں پر اے عجب؟

غالب

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا
رحمت اللعالمینی انتہا

زندہ رود

اب بھی معنی مجھ پہ کھلنے سے رہے
آگ اگر تجھ میں ہے ہم کو پھونک دے

غالب

تو بھی میری طرح جانے، کیا ہے شعر
اس بیاں کی تاب لا سکتا ہے شعر؟
محفل آرائی رہا شعراء کا کام
بے ید بیضا ہیں یہ موسیٰ تمام
مجھ سے جو چاہے تو وہ ہے کافری
کافری ہے ماورائے شاعری

حلّاج

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰؐ او را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

زندہ رود

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطاست — سرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰؐ است!
آدمے یا جوہرے اندر وجود — آنکہ آید گاہے گاہے در وجود؟

حلاج

پیشِ او گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود عبدۂ فرمودہ است!
عبدۂ از فہمِ تو بالاتر است — زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
جوہرِ او نے عرب نے اعجم است — آدم است و ہم ز آدم اقدم است!
عبدۂ ہم جانفزا ہم جانستاں — عبدۂ ہم شیشہ ہم سنگ گراں!
عبدۂ صورت گرِ تقدیرہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیرہا!
عبد دیگر عبدۂ چیزے دگر — ما سراپا انتظار او منتظر!
عبدۂ دہر است و دہر از عبدۂ ست — ما ہمہ رنگیم او بے رنگ و بوست
عبدۂ یا ابتدا بے انتہاست — عبدۂ را صبح و شام ما کجاست!
کس ز سرِّ عبدۂ آگاہ نیست — عبدۂ جز سرِّ الا اللہ نیست!

حلّاج

ہر کہیں پیدا جہانِ رنگ و بو — حاصل اس مٹی کا ہے بس آرزو
نورِ احمدؐ سے ہے اس کی آبرو — یا اسی کی ہے ابھی تک جستجو

زندہ رود

پوچھتا ہوں، پوچھنا گو ہے خطا — سرِّ جوہر کہیے جس کو مصطفیٰؐ
آدمی ہے، یا ہے جوہر در وجود — وہ، جو گاہے گلہ ہے پاتا ہے نمود

حلّاج

اس کے آگے سجدہ ریز عالم تمام — خود کو از خود عبدہٗ دیتا ہے نام
عبدہٗ ہے، فہم سے بالا تری — کیونکہ ہے جوہر وہی آدم وہی
اپنے جوہر سے نہ عجمی نے عرب — آدمی اک قبلِ آدم اے عجب
جاں فزا بھی جانستاں بھی عبدہٗ — شیشہ بھی سنگِ گراں بھی عبدہٗ
عبدہٗ قادر ہے ہر تقدیر پر — اس میں تعمیرات ہیں اس میں کھنڈر
عبد دیگر عبدہٗ دیگر مقام — وہ ہے مطلوب اور طالب ہم تمام
عبدہٗ سے دہر، خود دہر عبدہٗ — ہم سبھی بارنگ وہ بے رنگ و بو
ابتدا سے عبدہٗ بے انتہا — عبدہٗ کو قیدِ صبح و شام کیا
عبدہٗ کیا ہے کوئی آگہ نہیں — عبدہٗ جز سرِّ الا اللہ نہیں

لا الٰہ تیغ و دم او عبدہٗ فاش تر خواہی بگو ہو عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات عبدہٗ رازِ درونِ کائنات!
مدعا پیدا نگردد زیں دو بیت تا نہ بینی از مقامِ "مارمیت"

بگزر از گفت و شنود اے زندہ رود
غرق شو اندر وجود اے زندہ رود!

زندہ رود

کم شناسم عشق را ایں کار چیست؟
ذوق دیدار است؟ پس دیدار چیست؟

حلّاج

معنیٔ دیدارِ آں آخر زماں حکم او بر خویشتن کردن رواں
در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں تا چو او باشی قبولِ انس و جاں
باز خود را بیں ہمیں دیدارِ اوست! سنتِ او سرّے از اسرارِ اوست

زندہ رود

چیست دیدارِ خدائے نہ سپہر
آنکہ بے حکمش نہ گردد ماہ و مہر؟

لاالٰہ شمشیر بے دم عبدہٗ فاش گر چاہے تو کہہ ہُو عبدہٗ
عُبدہٗ چند و چگونِ کائنات عبدہٗ رازِ درونِ کائنات
رازکیا افشا کریں گے یہ دو بیت جب تلک سمجھیں نہ رمزِ مارمیت

چھوڑ ان باتوں کو جا اے زندہ رود
غرق ہو کر دیکھ خود بحرِ وجود

زندہ رود

عشق کہتے ہیں بتا کیا چیز ہے؟
دُھن لقا کی ہے؟ لقا کیا چیز ہے؟

حلّاج

ہے یہی آخر زمانی کا لقا ہم کریں خود پر انہیں فرمانروا
جی جہاں میں جوں رسولِ انس و جاں تاکہ ہو جائے قبولِ انس و جاں
دیکھ پھر خود کو یہی دیدار ہے سرِّ سنت شاملِ اسرار ہے

زندہ رود

کیا ہے دیدارِ خدائے سپہر
تابعِ فرماں ہیں جس کے ماہ و مہر

حلّاج

نقشِ حق اوّل بجاں انداختن — باز او را در جہاں انداختن!
نقشِ جاں تا در جہاں گردد تمام — می شود دیدارِ حق دیدارِ عام!
اے خنک مردے کہ از یک ہوئے او — نہ فلک دارد طوافِ کوئے او!
وائے دردیشے کہ ہوئے آفرید — باز لب بربست و دم در خود کشید
حکمِ حق را در جہاں جاری نکرد — نانے از جو خورد و کرّاری نکرد
خانقاہے جست و از خیبر رمید — راہبی در زید و سلطانی ندید!
نقشِ حق داری؟ جہاں یکچیر تست — ہم عناں تقدیر با تدبیر تست
عصرِ حاضر با تو می جوید ستیز
نقشِ حق بر لوحِ ایں کافر بریز!

زندہ رود

نقشِ حق را در جہاں انداختند
من نمی دانم چساں انداختند؟

حلّاج

یا بزورِ دلبری انداختند — یا بزورِ قاہری انداختند!
زانکہ حق در دلبری پیداتر است — دلبری از قاہری اولیٰ تر است!

حلّاج

نقشِ حق خود اپنے دل پر ڈالنا — اس کو پھر دنیا کے اندر ڈالنا
کام یہ جب ہوگا دنیا میں تمام — ہوگا تب دیدارِ حق دیدارِ عام
مرحبا! وہ مرد، اگر اک 'ھو' کرے — نوفلک کو طوف کا مرکز بنے
حیف وہ درویش جس نے آہ کی — دم بخود ہو کر رہا، چپ سادھ لی
حکمِ حق جاری نہیں اس سے کہیں — اس کی درویشی میں کرّاری نہیں
جہد چھوڑا خانقہ میں لی پناہ — راہبی لی چھوڑ کر شاہانہ راہ
نقشِ حق لا، پھر جہاں نخچیر ہے — ہم عناں تقدیر با تدبیر ہے

اڑ گیا ہے دورِ حاضر جنگ پر
نقشِ حق کافر کے دل پر ثبت کر

زندہ رود

ڈالنا ہے نقشِ حق دنیا میں پر
کس طرح، اس کی نہیں مجھ کو خبر

حلّاج

ڈالتے ہیں دلبری کے زور سے — یا کسی دم قاہری کے زور سے
دلبری میں حق ہے بہتر جلوہ گر — قاہری سے دلبری ہے خوب تر

زندہ رود

باز گو اے صاحبِ اسرارِ شرق
درمیانِ زاہد و عاشق چہ فرق؟

حلّاج

زاہد اندر عالمِ دنیا غریب
عاشق اندر عالمِ عقبےٰ غریب!

زندہ رود

معرفت را انتہا نابودن است
زندگی اندر فنا آسودن است؟

حلّاج

سُکرِ یاراں از تہی پیمانگی است — نیستی از معرفت بیگانگی است
اے کہ جوئی در فنا مقصود را — در نمی یابد عدم موجود را!

زندہ رود

آنکہ خود را بہتر از آدم شمرد — در خم و جامش نہ مے باقی نہ دُرد

زندہ رود

اب بتا اے واقفِ اسرارِ شرق
زاہد و عاشق میں آخر کیا ہے فرق؟

حلّاج

جس طرح زاہد ہے دنیا میں غریب
ہوگا عاشق یوں ہی عقبےٰ میں غریب

زندہ رود

نیستی ہے معرفت کی انتہا
زندگی راحت بہ آغوشِ فنا

حلّاج

شکرِ یاراں کا سبب بے مائیگی
نیستی عرفان سے ناواقفی
تو فنا میں پائے کیوں مقصود کو
چھو نہیں سکتا عدم موجود کو

زندہ رود

جس کو زعمِ برتری آدم پہ ہے
اس کے شیشہ میں نہ تلچھٹ ہے نہ مے

مشتِ خاکِ ما بگردوں آشنا ست! آتشِ آں بے سر و ساماں کجا ست؟

حلّاج

کم بگو زاں خواجۂ اہلِ فراق تشنہ کامِ واز ازل خونیں ایاق!
ما جہول او عارفِ بود و نبود کفرِ او ایں راز را بر ما کشود!
از فتادن لذّتِ برخاستن ق عیشِ افزودن ز دردِ کاستن!
عاشقی در نارِ او واسوختن سوختن بے نارِ او ناسوختن!
زانکہ او در عشق و خدمت اقدم است آدم از اسرارِ او نامحرم است!

چاک کن پیراہنِ تقلید را
تا بیاموزی از و توحید را

زندہ رود

اے ترا اقلیم جاں زیرِ نگیں
یک نفس با ما دگر صحبت گزیں

حلّاج

با مقامے در نمی سازیم و بس ما سراپا ذوقِ پرواز یم و بس
ہر زماں دیدن تپیدن کارِ ماست بے پر و بالے پریدن کارِ ماست!

خاک کو حاصل ہے سیرِ آسماں آگ اُس بے مایہ کی اب ہے کہاں

حلّاج

ذکرِ شیطاں کا نہ کر اس وقت تو وہ ازل کا تشنہ، اور خونیں سبو
ہم رہے جاہل وہ اک عارف بڑا کافری سے اس کی یہ ہم پر کھلا
گر کے اٹھنے میں ہے اٹھنے کا مزا ق گھٹ کے بڑھنے میں ہے بڑھنے کا مزا
اس کے انگاروں میں جلنا عاشقی ہے نہ جلنا گر نہ ہو وہ آگ ہی
بندگی اور عشق میں یکتا ہے وہ آدمی اب تک نہ پایا کیا ہے وہ
چاک کر اس جامۂ تقلید کو
تا کہ سیکھے اس سے تُو توحید کو

زندہ رود

اے کہ تو ہے حاکمِ اقلیمِ جاں
اور بھی اک دو گھڑی رک جا یہاں

حلّاج

ہم کو راس آتا نہیں کوئی مقام ہم ہیں مست ذوقِ پروازِ دوام
دیکھتے جانا، تڑپنا، اپنا کام بے پر و بال اڑتے رہتے ہیں مدام

نمودار شدنِ خواجۂ اہلِ فراق ابلیس

صحبتِ پروشندلاں یک دم دو دم
آں دو دم سرمایۂ بود و عدم!

عشق را شوریدہ تر کرد و گذشت
عقل را صاحب نظر کرد و گذشت

چشم بربستم کہ با خود دارمش
از مقامِ دیدہ در دل آرمش

ناگہاں دیدم جہاں تاریک شد
از مکاں تا لامکاں تاریک شد

اندراں شب شعلۂ آمد پدید
از درونش پیرِ مردے برجہید

یک قبائے سرمئی اندر برش
غرق اندر دودِ پیچاں پیکرش

گفت رومی خواجۂ اہلِ فراق!
آں سراپا سوز و آں خونیں ایاق!

کہنۂ کم خندۂ اندک سخن
چشمِ او بینندۂ جاں در بدن!

رند و ملّا و حکیم و خرقہ پوش
در عمل چوں زاہدانِ سخت کوش

فطرتش بیگانۂ ذوقِ وصال
زہد او ترکِ جمالِ لایزال!

تا گسستن از جمال آساں نبود
کار پیش افگند از ترکِ سجود

خواجۂ اہلِ فراق ابلیس کا نمودار ہونا

صحبتِ روشن دل ایک دو دم سہی ہیں وہ دو دم حاصلِ کل زندگی
شعلہ ہائے عشق بھڑکا کر چلا اور خرد کو ہوش میں لا کر چلا
مَیں نے آنکھیں بند کیں تا وہ نہ جائے تا مری آنکھوں سے دل میں راہ پائے
ناگہاں دیکھا جہاں تاریک تھا از مکاں تا لامکاں تاریک تھا
شعلہ اس ظلمت میں اک پیدا ہوا ظاہر اس کے ساتھ اک بوڑھا ہوا
جسم پر اس کے تھی اک نیلی قبا اور بل کھاتا دھواں اطراف تھا

بولے یہ فرقت کے ماروں کا امام
خونِ ارماں سے ہے لبریز اس کا جام

کہنہ عمرو رُو ترش اور کم سخن اس کی آنکھوں پر عیاں جاں در بدن
رند، ملّا، مردِ عارف، فلسفی اور ریاضت بھی کھٹن زہاد سی
اس کا دل بیگانۂ ذوقِ وصال اس کا تقویٰ ترکِ نورِ لایزال
اس کو وہ ترکِ جمال آساں نہ تھا ترکِ سجدہ کر کے چھٹکارا لیا

اندکے در وارداتِ او نگر مشکلاتِ او ثباتِ او نگر!

غرق اندر رزمِ خیر و شر ہنوز
صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز!

جانم اندر تن ز سوز او تپید بر لبش آہے غم آلودے رسید
گفت و چشمِ نیم وا بر من کشود "در عمل جز ماکہ برخوردار بود؟
آنچناں بر کارہا پیچیدہ ام فرصتِ آدینہ را کم دیدہ ام!
نے مرا فرشتہ نے چاکرے وحیِ من بے منتِ پیغمبرے!
نے حدیث و نے کتاب آوردہ ام جانِ شیریں از فقیہاں بردہ ام
رشتہ دیں چوں فقیہاں کس نرشت کعبہ را کردند آخر خشت خشت!
کیشِ ما را ایں چنیں تاسیس نیست فرقہ اندر مذہبِ ابلیس نیست!
در گذشتم از سجودِ لے بخبر ساز کردم ارغنونِ خیر و شر
از وجودِ حق مرا منکر مگیر دیدہ بر باطن کشا ظاہر مگیر
گر بگویم نیست، ایں از ابلہی است زانکہ بعد از دید نتواں گفت نیست!
من 'بلے' در پردۂ 'لا' گفتہ ام گفتۂ من خوشتر از ناگفتہ ام!
تا نصیب از دردِ آدم داشتم قہرِ یار از بہرِ او نگذاشتم!
شعلہ ہا از کشتِ زارِ من دمید او ز مجبوری بہ مختاری رسید!
زشتی خود را نمودم آشکار با تو دادم ذوقِ ترکِ اختیار
تو نجاتے دہ مرا از نارِ من واکن اے آدم گرہ از کارِ من!

غور کر کے دیکھ اس کی واردات دیکھ اس کی مشکلیں اس کا ثبات
غرق اندر رزم خیر و شر ہے وہ
تو پیمبر پا کے بھی کافر ہے وہ

سوز سے اس کے مری بے تاب جاں اس کے لب پر تھی غم آلودہ فغاں
آدھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور کہا "کون عمل میں ہم سے برخوردار تھا؟"
اس قدر مشغول ہوں فرصت نہیں جمعہ کی چھٹی مری قسمت نہیں
کوئی فرشتہ نہیں، نوکر نہیں میری وحی ممنونِ پیغمبر نہیں
نے صحیفے نے حدیثیں ہیں مری فقہا سے جان میں نے چھین لی
جو فقیہاں دین کو گوندھا نہیں منتشر اینٹیں حرم کی ہو گئیں
اپنے ہاں ایسی نہیں بنیادِ دیں مذہبِ ابلیس میں فرقے نہیں
ترکِ عبادت کر دیا اے بے خبر کر لیا ہموار سازِ خیر و شر
منکرِ حق مجھ کو کہنا ہے خطا میرا باطن دیکھ ظاہر پر نہ جا
ابلہی ہے گر کروں انکارِ حق کفر ناممکن پسِ دیدارِ حق
'نہ' کے پردے میں کبھی ہے میں نے 'ہاں' خاموشی میں فاش تر ہو گا بیاں
بوجھ تا آدم کا لے لوں اپنے سر قہرِ حق خود لے لیا ہے آپ پر
میری کھیتی میرے حق میں شعلہ زار جبر سے اس کو میسر اختیار
میں نے کی اپنی برائی آشکار چھوڑ ڈالا مجھ پہ ترکِ اختیار
میری دوزخ سے مجھے دیدے پناہ کھول دے اے ابنِ آدم یہ گرہ

اے کہ اندر بندِ من افتادۂ رخصتِ عصیاں بشیطاں دادۂ
در جہاں با ہمتِ مردانہ زی غم گسارِ من! ز من بیگانہ زی!
بے نیاز از نیش و نوشِ من گذر تا نہ گردد نامہ ام تاریک تر!
در جہاں صیاد با نخچیر ہاست تا تو نخچیری بکیشم تیر ہاست!

صاحب پرواز را افتاد نیست
صید اگر زیرک شود صیاد نیست!"

گفتمش "بگذر ز آئینِ فراق ابغض الاشیاء عندی الطلاق"
گفت "سازِ زندگی سوزِ فراق اے خوشا سرمستی روزِ فراق!
برلبم از وصل می ناید سخن وصل اگر خواہم نہ او ماند نہ من"
حرفِ وصل او را ز خود بیگانہ کرد تازہ شد اندر دلِ او سوز و درد!
اندکے غلطید اندر دودِ خویش بازگم گردید اندر دودِ خویش

نالۂ زاں دودِ پیچاں شد بلند
اے خنک جانے کہ گردد دردمند!

آ کے پھندے میں پڑا تو آپ ہی ڈھیل شیطاں کو بدی کی تو نے دی
دہر میں با ہمتِ مردانہ جی! یار میرے مجھ سے تو بیگانہ جی!
تلخ و شیریں سے مرے بچ کر گزر تا نہ ہو دفترِ مرا تاریک تر
ہیں شکاری بھی جہاں نخچیر ہیں صید اگر تو ہے، مرے ہاں تیر ہیں

اوپر اُڑنے والا گرتا ہے کہیں
مرغِ زیرک دام میں آتا نہیں"

بولا اس کو "ترک کر ذوقِ فراق سب سے بدتر چیز کہلائی طلاق"
بولا "سازِ زیست ہے سوزِ فراق "اے خوشا سرمستیٔ روزِ فراق!"
وصل کی باتیں مجھے بھاتی نہیں وصل میں "وہ" "میں" کوئی باقی نہیں
وصل کی سنتے ہی خود سے کھو گیا درد اس کے دل کا تازہ ہو گیا
پھر دھوئیں میں اپنے غلطاں ہو گیا دیکھتے ہی دیکھتے خود کھو گیا

نالہ بل کھاتے دھوئیں سے تھا بلند
کس قدر پیاری ہے جانِ دردمند

نالۂ ابلیس

اے خداوندِ صواب و ناصواب — من شدم از صحبتِ آدم خراب!
ہیچ گہ از حکمِ من سر بر نتافت — چشم از خود بست و خود را در نیافت!
خاکش از ذوقِ 'انا' بیگانہ — از شرارِ کبریا بیگانہ!
صید خود صیاد را گوید بگیر — الاماں از بندۂ فرماں پذیر!
از چنیں صیدے مرا آزاد کن — طاعتِ دیروزۂ من یاد کن
پست از وآں ہمتِ والائے من — وائے من اے وائے من اے وائے من!
فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف — تاب یک ضربم نیارد ایں حریف
بندۂ صاحب نظر باید مرا — یک حریفِ پختہ تر باید مرا!
لعبتِ آب و گل از من باز گیر — می نیاید کودکی از مردِ پیر!
ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است — مشتِ خس را یک شرار از من بس است!
اندریں عالم اگر جز خس نبود — ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟
شیشہ را بگداختن کارے بود — سنگ را بگداختن کارے بود!

نالۂ ابلیس

اُے خداوندِ صواب و ناصواب،
صحبتِ آدم نے کر ڈالا خراب

میرے فرماں کو وہ ٹھکراتا نہیں
آپ خود کو دیکھ کر پاتا نہیں

لذّتِ انکار وہ جانا نہیں
خود مقام اپنا وہ پہچانا نہیں

صید خود دیتا ہے ترغیبِ شکار!
الاماں یہ بندۂ پر اضطرار!

مجھ کو ایسے صید سے آزاد کر
میری طاعاتِ گزشتہ یاد کر

میری ہمت پست اس سے، ہائے مَیں!
ہائے مَیں، اے وائے مَیں، اے وائے میں

اس کی فطرتِ خام، عزم اس کا ضعیف
ضرب کے قابل نہیں میرا حریف

چاہیئے اک بندۂ صاحب نظر
کر عطا مجھ کو حریفِ پختہ تر

خاک کے پتلوں میں کیوں رکھا اسیر
کودکی ہرگز نہیں شایانِ پیر!

ابنِ آدم ہے مثالِ مشتِ خس
اک شرارہ میرا اس کے حق میں بس

گر نبُد خس کچھ بھی عالم میں نہ تھا
مجھ کو آگ اتنی جودی، کیا فائدہ؟

شیشہ پگھلانے سے مجھ کو عار ہے
گر کروں پتھر کو پانی کار ہے

آنچناں تنگ از فتوحاتِ آمدم — پیشِ تو بہرِ مکافاتے آمدم
منکرِ خود از تو می خواہم، بدہ — سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندہ باید کہ پیچید گردنم — لرزہ انداز د نگاہش در تنم
آں کہ گوید "از حضورِ من برو" — آں کہ پیشِ او نیرزم باد و جو

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست!

اب بہت تنگ آگیا ہوں فتح سے — اک دشمن دے برابر کا مجھے
اپنا دشمن مانگتا ہوں مجھ کو دے — مردِ حق اک چاہتا ہوں مجھ کو دے
دے مجھے ایسا جو گردن موڑ دے — لرزہ بر اندام کر کے چھوڑ دے
وہ جو کہہ سکتا ہو مجھ کو دور ہو! — جو نہ سمجھے مجھ کو مانندِ دوجو

ایک مردِ حق عطا کر اے خدا
اس کے ہاتھوں ہار شاید دے مزا

فلک زحل

ارواحِ رذیلہ کہ با ملک و ملّت غداری کردہ و دوزخ ایشاں را قبول نکردہ

پیرِ رومی آں امامِ راستاں — آشنائے ہر مقامِ راستاں!
گفت اے گردوں نوردِ سخت کوش — دیدۂ آں عالمِ زنّار پوش؟
آنچہ بر گردِ کمر پیچیدہ است — از دُمِ استارۂ دزدیدہ است!
از گراں سیری خرامِ او سکوں — ہر نکو از حکمِ او زشت و زبوں!
پیکرِ او گرچہ از آب و گل است — بر زمینش پا نہادن مشکل است
صد ہزار افرشتۂ تند ربدست — قہرِ حق را قاسم از روزِ الست!
دُرّہ پیہم می زند سیّارہ را — از مدارش برکند سیّارہ را
عالمے مطرود و مردودِ سپہر — صبحِ او مانند شامِ از بخلِ مہر!
منزلِ ارواحِ بے یوم النشور — دوزخ از احراقِ شاں آمد نفور
اندرونِ او دو طاغوتِ کہن — روحِ قومے کشتہ از بہرِ دو تن!

ارواحِ رذیلہ جنہوں نے ملک و ملّت سے غداری کی اور جنہیں دوزخ نے قبول نہیں کیا

پیر رومی راست بازوں کے امام
وہ جنہیں معلوم مومن کا مقام

بولے گردوں سیر مردِ سخت کوش
دیکھ اُدھر وہ عالمِ زنّار پوش

آتا ہے پٹکا سا جو تجھ کو نظر
وہ ستارے کی ہے دم گردِ کمر

سستیٔ رفتار وہ گویا سکوں!
خوب بھی اس کے سبب زشت و زبوں!

وہ بھی آب و گل کا پیکر ہے مگر
ہے کٹھن کرنا بسر اس خاک پر

برق کے کوڑے اٹھائے ہر زماں
قہرِ حق برسا رہے ہیں نوریاں

مار کر تاروں کو کوڑے بار بار
ان کو کرتے رہتے ہیں وہ بے مدار

اک جہاں افلاک کا راندہ ہوا
شام جیسی صبحِ محرومِ ضیا

اس جگہ ارواحِ بے یوم النشور
ان کو دوزخ بھی جلانے سے نفور

اس کے اندر کہنہ دو طاغوت تھے
خوں کئے ملّت کا دو تن کے لئے

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن!
ناقبول و ناامید و نامراد ملّتے از کارِ شاں اندر فساد!
ملّتے کو بندِ ہر ملّت کشاد ملک و دینش از مقامِ خود فتاد!
می ندانی خطّۂ ہندوستاں آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں
خطّۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز
در گلش تخمِ غلامی را کہ کشت؟ ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت!

در فضائے نیلگوں یک دم بایست
تا مکافاتِ عمل بینی کہ چیست!"

"جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن!"

ناقبول و ناامید و نامراد ان کے دم سے ساری ملّت میں فساد

قوم وہ اقوام کی مشکل کشا اس نے ملک و دین سب کچھ کھو دیا

جانتا ہے خطۂ ہندوستاں؟ وہ کہ تھا محبوبِ کل صاحب دلاں

خطہ وہ جس سے تھا روشن اک جہاں اب بھی خاک و خوں میں غلطاں ہے وہ یا

اس کو مجبورِ غلامی کر دیا؟ ہے ان ہی ارواحِ بد کا یہ کیا

اک گھڑی رکنا ضروری ہے یہاں
تا مکافاتِ عمل دیکھیں عیاں

قلزمِ خونین

آنچہ دیدم می نگنجد در بیاں — تن ز ہیبش بے خبر گردد ز جاں!
من چہ دیدم؟ قلزمے طوفاں بروں — قلزمے طوفاں بروں طوفاں دروں!
در ہوا ماراں چو در قلزم نہنگ — کفچہ شب گوں بال و پر سیماب رنگ!
موجہا دُرّندہ مانندِ پلنگ — از نہیبش مردہ بر ساحل نہنگ!
بحر ساحل را اماں یک دم نداد — ہر زماں کہ پارۂ در خوں فتاد
موجِ خوں با موجِ خوں اندر ستیز — در میانش زورقے در اُفت و خیز!
اندراں زورق دو مردِ زرد روے
زرد رو، عریاں بدن، آشفتہ موے!

آشکارا می شود روحِ ہندوستان

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد — پردہ را از چہرۂ خود برکشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال — در دو چشمِ او سرورِ لایزال!
حلّۂ در برسبک تر از سحاب — تار و پودش از رگِ برگِ گلاب
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند — بر لبِ او نالہ ہاے دردمند!
گفت رومی "روحِ ہند است ایں نگر
از فغانش سوزہا اندر جگر!"

قلزمِ خونین

جو بھی دیکھا کر نہیں سکتا بیاں
ڈر سے تن کھو دیتا ہے احساس جاں

مَیں نے کیا دیکھا ہے؟ اک دریائے خوں
ایک طوفاں خیز دریا، در بروں

مار موزی تھے ہواؤں میں ادھر
پھن سیاہی پوش، اجلے بال و پر

پنجہ زن موجیں تھیں مانندِ پلنگ
ان کے ڈر سے مردہ ساحل پر نہنگ

بحر سے آرام ساحل کو کہاں
کوہ پارے گر رہے تھے ہر زماں

موجِ خوں سے موجِ خوں لڑتی جنگ پر
اس میں کشتی ڈولتی زیر و زبر

زرد رو ہیبت زدہ اس میں دو تن
بال بکھرے، چہرہ فق، ننگا بدن

ہندوستان کی روح حاضر ہوتی ہے

حور اک آئی فلک کو چیر کر
ہو گئی چلمن اٹھا کر جلوہ گر

تھے جبیں پر نار و نورِ لایزال
اس کی آنکھوں میں سرورِ لایزال

جامہ ہلکا سا بدن پر جوں سحاب
تار و پود اس کے رگِ برگِ گلاب

باوجود اس حسن کے باطوق و بند
اس کے لب پر نالہ ہائے دردمند

بولے رومی روحِ ہندی دیکھ ادھر
اس کے نالوں سے ہے سوز اندر جگر

روحِ ہندوستان نالہ و فریاد می کند

شمعِ جاں افسردہ در فانوسِ ہند — ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند!
مردکِ نامحرم از اسرارِ خویش — زخمۂ خود کم زند بر تارِ خویش!
بر زمانِ رفتہ می بندد نظر — از تشِ افسردہ می سوزد جگر
بندہا بر دست و پائے من از دست — نالہ ہائے نارسائے من از دست
خویشتن را از خودی پرداختہ — از رسومِ کہنہ زنداں ساختہ

آدمیّت از وجودش دردمند
عصرِ نو از پاک و ناپاکش نژند

بگذر از فقرے کہ عریانی دہد — اے خنک فقرے کہ سلطانی دہد!
الحذر از جبر و ہم از خوئے صبر — جابر و مجبور را زہر است جبر!
ایں بہ صبرِ بیہمے خوگر شود — آں بہ جبرِ بیہمے خوگر شود

ہر دو را ذوقِ ستم گردد فزوں
وردِ من یالیت قومی یعلمون

روحِ ہندوستان نالہ و فریاد کرتی ہے

شمعِ گُل ہے ہند کے فانوس کی ہندیوں کو فکر کیا ناموس کی
مردِ یہ! نامحرمِ رازِ خودی چھیڑ کر دیکھا نہیں سازِ خودی
ہر گھڑی ماضی پہ ہی اُس کی نظر چاہیے خاکستر سے وہ سوزِ جگر
میرے دست و پا میں زنجیر اس سے ہے اور فغاں محرومِ تاثیر اس سے ہے
ہو گیا اپنی خودی سے وہ تہی قید میں خوش ہے رسومِ کہنہ کی

اس سے ہے انسانیت کی خستگی
عہدِ نو کی ریت الٹی اس نے کی

ترک کر وہ فقر جو عریاں کرے فقر اچھا جس سے سلطانی ملے
الحذر یہ تیری خوئے جبر و صبر جابر و مجبور کو ہے زہرِ جبر
یہ کرے گا صبر پیہم اختیار وہ کرے گا جبر پیہم اختیار

یونہی ذوقِ جور دونوں میں بڑھے
درسِ عبرت اے مری قوم اس سے لے

کے شبِ ہندوستاں آید بروز! مُرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز!
تا ز قیدِ یک بدن وا می رہد آشیاں اندر تنِ دیگر نہد!
گاہ او را با کلیسا ساز باز گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ او آئینِ او سوداگری است عنتری اندر لباسِ حیدری است
تا جہانِ رنگ و بو گردد دگر رسمِ او آئینِ او گردد دگر
پیشِ ازیں چیزے دگر مسجودِ او در زمانِ ما وطن معبودِ او
ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند باطنش چوں دیریاں زنّار بند
جعفر اندر ہر بدن ملّت کُش است ایں مسلمانے کہن ملّت کُش است!
خندہ خنداں است و با کس یار نیست مارا گر خنداں شود جز مار نیست!
از نفاقش وحدتِ قومے دو نیم ملّتِ او از وجودِ او لئیم!
ملّتے را ہر کجا غارت گرے است اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں!"

صبحِ روشن ہند میں کب آئے گی
مرگیا جعفر ہے زندہ جعفری

اک بدن کی قید سے نکلی اِدھر
جسمِ دیگر میں بنا لی گھر اُدھر

ہے کبھی گرجا سے اس کی ساز باز
گاہ اہلِ دیر سے اس کو نیاز

اس کا دین آئین سب سوداگری
عنتری اندر لباسِ حیدری

تاکہ ہو جائے دگر سارا جہاں
رسم و آئیں سب بدل جائیں یہاں

اس سے پہلے تھا جدا اس کا خدا
اب وطن معبود اس کو ہو گیا

دیکھنے میں دین سے ہمدرد یاں
اور حقیقت میں وہ زنّاری نہاں

قوم کا غدار جعفر ہر کوئی
دشمنانِ قوم ہیں جعفر سبھی

یار لگتا ہے مگر کب یار ہے!
مار ہنستا ہو گا لیکن مار ہے!

اس کے کرتوتوں سے ملّت ہے دو نیم
اس کے ہونے سے ہے ملّت بھی یتیم

جو بھی ہے ملّت میں غارت گر کوئی
نسلِ صادق سے ہے یا ہے جعفری

روحِ جعفر سے الٰہی الاماں
الاماں اس دور کے یہ جعفراں

فریادِ یکے از زورق نشینانِ قلزمِ خونیں

گُنے عدم مارا پزیرد نے وجود — وائے از بے مہریٔ بود و نبود!
تا گذشتیم از جہانِ شرق و غرب — بر درِ دوزخ شدیم از درد و کرب!
یک شرر بر صادق و جعفر نزد — بر سرِ ما مشتِ خاکستر نزد

گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ
شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ!

آنسوے نہ آسماں رفتیم ما — پیشِ مرگِ ناگہاں رفتیم ما
گفت جاں سرّے ز اسرارِ من است — حفظِ جان و ہدم تن کارِ من است
جان زشتے گرچہ نرزد با دو جَو — اے کہ از من ہدمِ جاں خواہی برو!

ایں چنیں کارے نمی آید ز مرگ
جانِ غدّارے نیاساید ز مرگ!

اے ہوائے تند! اے دریائے خوں! — اے زمیں! اے آسمانِ نیلگوں!
اے نجوم! اے ماہ تاب! اے آفتاب! — اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب!

قلزمِ خونین کی کشتی والوں میں سے ایک کی فریاد

نیستی اچھی نہ راس آیا وجود واہ ری بے دردیٔ بود و نبود!
اس جہاں سے چھوٹ کر جس دم چلے در پہ دوزخ کے یہ درد و کرب تھے
جعفر و صادق پہ چنگاری تو کیا ق خاک بھی سر پر نہ ڈالی اس جگہ!

بولا دوزخ "ان سے بہتر خار و خس!
میرے قابل کب ہیں یہ کافر دو کس!

پار نو افلاک کے بھی ہم گئے جا کے مرگِ ناگہاں سے بھی ملے
بولی ہاں جاں ہے مرے اسرار سے جاں بچا کر جسم ڈھانا ہے مجھے
جانِ بد قابل دو جو کے گو نہیں موت جاں کی چاہے بدخواہ جا کہیں

موت ایسے کام کرتی ہے کہیں؟
جاں غداروں کی سکھ پاتی نہیں

"اے ہوائے تند! اے دریائے خوں! اے زمیں! اے آسمانِ نیلگوں!
اے نجوم! اے ماہتاب! اے آفتاب! اے قلم! اے لوحِ محفوظ! اے کتاب!"

اے بتانِ ابیض! اے لُردانِ غرب! اے جہانے در بغل بے حرب و ضرب!
ایں جہاں بے ابتدا بے انتہاست!
بندۂ غدّار را مولا کجاست؟"

ناگہاں آمد صدائے ہولناک سینۂ صحرا و دریا چاک چاک!
ربطِ اقلیم بدن از ہم گسیخت دمبدم کُہ پارہ بر کُہ پارہ ریخت
کوہ ہا مثلِ سحاب اندر مرور انہدامِ عالمے بے بانگِ صور!
برق و تندر از تب و تابِ درون آتشیاں جستند اندر بحرِ خوں!
موجہا پُر شورد از خود رفتہ تر! غرقِ خوں گردید آں کوہ و کمر!
آنچہ بر پیدا و ناپیدا گذشت
خیلِ انجم دید و بے پروا گذشت!

"اے بتانِ ابیض! اے لُردانِ غرب! تم ہو عالم در بغل بے حرب و ضرب
ہے جہاں بے ابتدا، بے انتہا
ہے کوئی غدار کا آخر خدا؟

ناگہاں آئی صدائے ہولناک دشت و دریا ہو گئے سب چاک چاک!
تن کے اعضا تھے جدا سب ٹوٹ کر کوہ پارے گرتے تھے اک ایک پر
تھے رواں کہسار مانندِ سحاب قبلِ محشر دہر خستہ و خراب
بجلیاں پُرشور، ہر دم بے سکوں بن گئے سب طالب دریائے خوں
موجیں شوریدہ، رواں بے اختیار کر گئیں کوہ کمر کو لالہ زار

بود کیا! نابود کیا سب بہہ گیا
دیکھتے تاروں کا میلہ چل پڑا

آں سوئے افلاک

مقامِ حکیم المانوی نطشہ

ہر کجا استیزۂ بود و نبود — کس نداند سرِّ ایں چرخِ کبود!
ہر کجا مرگ آورد پیغامِ زیست — اے خوش آں مردے کہ داند مرگ چیست!
ہر کجا مانندِ باد ارزاں حیات — بے ثبات و با تمنائے ثبات!
چشمِ من صد عالمِ شش روزہ دید — تا حدِ ایں کائنات آمد پدید!
ہر جہاں را ماہ و پروینے دگر — زندگی را رسم و آئینے دگر!
وقتِ ہر عالم رواں مانندِ زو — دیر باز ایں جا و آں جا تند رو!
سالِ ما ایں جا بہے آنجا دمے! — بیشِ ایں عالم بآں عالم کمے!

عقلِ ما اندر جہانے دیگرے خوارو زبوں!
در جہانے دیگرے خوارو زبوں!

بر ثغورِ ایں جہانِ چون و چند — بود مردے با صد اے دردمند!
دیدۂ او از عقاباں تیز تر — طلعتِ او شاہدِ سوزِ جگر!
دمبدم سوزِ درونِ او فزود — بر لبش بیتے کہ صد بارش سرود!

"نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے — نے خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد ز جانِ آرزومندے!"

حکیم المانوی نطشہ کا مقام

ہر کہیں ہنگامہ ہست و نیست کا
کون جانے راز ہے قدرت کا کیا

موت لے آتی ہے پیغامِ حیات
مرحبا دانائے اسرارِ ممات!

ہر کہیں مثلِ ہوا ارزاں حیات
بے ثبات، اس کو تمنائے ثبات

دیکھے صدہا ایسے شش روزہ جہاں
انتہا یہ ہے کہ پہنچا ہوں یہاں

ہر جہاں کے ماہ و پرویں ہیں دگر
زندگی کے رسم و آئیں ہیں دگر

وقت کی رفتار پانی کی مثال
ہے کہیں سست اور کہیں تیز اس کی چال

اپنا سال اک ماہ اِدھر، اک دم اُدھر
ہم بہت سمجھیں جسے، وہ کم اُدھر

عقل اپنی اس جہاں میں ذو فنون
دوسری دنیا میں وہ خوار و زبوں

سرحدِ دنیائے فانی پر وہاں
مرد اک دیکھا گیا محوِ فغاں

تیز تر شاہیں سے بھی اس کی نظر
اس کا چہرہ شاہدِ سوزِ جگر

لحظہ لحظہ اس کا دردِ دل بڑھا
شعر یہ نطشہ مرتبہ پڑھتا رہا

خدا و جبرئیل و حور و جنت سے بھی کیا بہلے
وہ جس کی جان کو دہکا رہے ہوں عشق کے شعلے

من بہ رومی گفتم ایں دیوانہ کیست؟ گفت ایں فرزانۂ المانوی است

درمیانِ ایں دو عالم جائے اوست نغمۂ دیرینہ اندر نائے اوست!

باز ایں حلّاجِ بے دار و رسن نوعِ دیگر گفتہ آں حرفِ کہن!

حرفِ او بے باک و افکارش عظیم غربیاں از تیغِ گفتارش دو نیم!

ہم نشیں بر جذبۂ او پے نبرد بندۂ مجذوب را مجنوں شمرد!

عاقلاں از عشق و مستی بے نصیب! بنضِ او دادند در دستِ طبیب!

با پرستگاں چیست غیر از ریو و رنگ وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ!

ابنِ سینا بر بیاضے دل نہد رگ زند یا حبِّ خواب آور دہد

بود حلّاجے بشہرِ خود غریب
جاں ز ملّا برد و کشتِ او را طبیب!

مرد رہ دانے نبود اندر فرنگ پس فزوں شد نغمہ اش از تارِ چنگ!

راہ رو را کس نشان از رہ نداد صد خلل در واردات او فتاد!

نقد بود و کس عیارِ او را نکرد کار دانے مردِ کار او را نکرد!

عاشقے در آہِ خود گم گشتۂ سالکے در راہ خود گم گشتۂ!

مستیٔ او ہر زجاجے را شکست از خدا بریدہ و ہم از خود گسست!

خواست تا بیند بچشمِ ظاہری اختلاطِ قاہری با دلبری!

خواست تا از آب و گل آید بروں خوشۂ کز کشتِ دل آید بروں!

آنچہ او جوید مقامِ کبریاست ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست

پوچھا رومی سے یہ ہے مجنوں کوئی؟ بولے 'نہ' یہ ہے حکیم المانوی
دو جہاں کے درمیاں اس کا مقام ہیں مضامینِ کہن اس کا کلام
یہ ہے اک حلّاج بے دار و رسن ہے بیاں اس کا نیا، باتیں کہن
بات بے باک اور فکر اس کی عظیم اس کی تیغِ نطق سے مغرب دو نیم
اس کو ہم عصروں نے پہچانا نہیں وہ تھا اک مجذوب، دیوانہ نہیں
عشق و مستی سے ہیں عاقل بے نصیب لے گئے تشخیص کو پیشِ طبیب
چارہ گر کیا جانیں حیلوں کے سوائے لے جنم افرنگ میں مجذوب وائے!
ابنِ سینا کو بیاض دل سبھی جانے وہ خواب آوری، نشتر زنی

وہ تھا حلّاج اپنی بستی میں غریب
جان ملّا سے بچی، مارا طبیب

ارضِ مغرب میں کوئی رہ داں نہ تھا نغمہ حدِ تار سے اونچا چلا
راہرو کو رستہ دکھلایا نہیں مشکلیں حالات سے بڑھتی گئیں
نقد تھا اس کو کوئی جانچا نہیں پختگی کی راہ دکھلایا نہیں
وہ تھا بس گم گشتہ اپنی آہ میں! اک مسافر گم خود اپنی راہ میں!
اس کی مستی نے کیا ہر شیشہ چور حق سے کیا؟ وہ ہو گیا خود سے بھی دور
دیکھنا چاہا بہ چشمِ ظاہری 'اختلاطِ قاہری با دلبری'
تا کہ آب و گل سے ہو جائے رہا دیکھے کشتِ دل سے کیا ہاتھ آئے گا
چاہتا تھا وہ مقامِ کبریا دانش و حکمت سے جو ہے ماوری

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی است — لاَ و اِلاَّ از مقاماتِ خودی است!

او بہ لاَ درماند و تا اِلاَّ نرفت — از مقامِ 'عبدہٗ' بیگانہ رفت!

با تجلی ہمکنار و بے خبر — دُور تر چوں میوہ از بیخِ شجر

چشمِ او جز رویتِ آدم نخواست — نعرہ بے باکانہ زد آدم کجاست!

ورنہ او از خاکیاں بیزار بود — مثلِ موسےٰ طالبِ دیدار بود!

کاش بودے در زمانِ احمدے — تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

عقل او با خویشتن در گفتگوست — تورہِ خود رو کہ راہِ خود نکوست!

پیش نِہ گامے کہ آمد آں مقام
'کاندرو بے حرف می روید کلام!'

زندگی شرحِ اشاراتِ خودی
'لا' و 'الّا' ہیں مقاماتِ خودی

لا سے الّا تک نہ پہنچا وہ کبھی
عبدہٗ سے رہ گیا بیگانہ ہی

خود تجلی اس میں اور وہ بے خبر
دُور جیسے جھاڑ کی جڑ سے ثمر

وہ نہ چاہا کچھ بھی آدم کے سوا
نعرہ تھا آدم کجا، آدم کجا

ق

خاکیوں سے ورنہ وہ بیزار تھا
مثلِ موسیٰؑ طالبِ دیدار تھا

عہدِ شیخ احمدؒ میں ہونا تھا اسے
نشہ تا حق آشنائی کا ملے

کشتۂ عقل، عقل کہتی تھی اُسے
راہ اپنی ٹھیک، اپنی راہ لے

اک قدم بڑھ آگیا، اب وہ مقام
جس میں بے الفاظ پیدا ہے کلام

حرکت بجنّت الفردوس

در گذشتم از حدِ ایں کائنات
پا نہادم در جہانِ بے جہات!

بے تمیز و بے یسار است ایں جہاں
فارغ از لیل و نہار است ایں جہاں

پیشِ او قندیلِ ادراکم فسرد
حرفِ من از ہیبتِ معنی بمرد!

با زبانِ آب و گل گفتارِ جاں!
در قفس پرواز می آید گراں!

اندکے اندر جہانِ دل نگر
تا ز نورِ خود شوی روشن بصر

چیست دل؟ یک عالمِ بے رنگ و بوست
عالمِ بے رنگ و بو بے چار سوست!

ساکن و ہر لحظہ سیّار است دل!
عالمِ احوال و افکار است دل!

از حقائق تا حقائق رفتہ عقل
سیرِ او بے جادہ و رفتار و نقل!

صد خیال و ہر یک از دیگر جدا است
ایں بگردوں آشنا آں نارسا است!

کس نگوید ایں کہ گردوں آشناست
بر جمینِ آں خیالِ نارساست!

یا سروری کاید از دیدارِ دوست
نیم گامے از ہوائے کوئے اوست!

چشمِ تو بیدار باشد یا بخواب
دل بہ بیند بے شعاعِ آفتاب!

آں جہاں را بر جہانِ دل شناس
من چہ گویم ز انچہ ناید در قیاس!

حرکت بجنّت الفردوس

چھوڑ کر نکلا حدود کائنات — ہو گیا وارد بہ ملکِ بے جہات
یہ جہاں ہے بے تمین و بے لیسار — یہ جہاں نادیدۂ لیل و نہار
میرے اوسان اس کے آگے کھو گئے — لفظ معنی دیکھ کر گم ہو گئے

معنیٔ جاں اور زبان خاک داں
قید کی تنگی میں اڑنا ہے گراں

ڈال تو دنیائے دل پر اک نظر — تا ہو اپنے نور سے روشن بصر
کیا ہے دل اک عالمِ بے رنگ و بو — عالمِ بے رنگ و بو ہے چار سو
اپنا دل ثابت بھی ہے سیار بھی! — عالمِ احوال بھی، افکار بھی!
ہیں حقائق ہی خرد کا اعتبار — دل نہیں پابندِ نقل و رہگذار
نشو خیالات ایک سے دیگر جدا — یہ فلک رس اور وہ ہے نارسا
کون سمجھا اس کو گر دوں آشنا — تھی معاون اس کی فکر رسا
یار کے دیدار کا جذب و سرور — پاس ہوتے بھی ہے وہ مقصد سے دور
آنکھ ہو بیدار تیری یا بخواب — دل نہیں محتاجِ نورِ آفتاب

ہے جہانِ دل کے جیسا وہ جہاں
فہم سے بالا ہے کیونکر ہو بیاں

اندراں عالم جہانے دیگرے
اصلِ او از کن فکانے دیگرے!

لازوال و دہر زماں نوعِ دگر
ناید اندر وہم و آید در نظر!

ہر زماں او را کمالے دیگرے
ہر زماں او را جمالے دیگرے!

روزگارش بے نیاز از ماہ و مہر
گنجد اندر ساحت او نہ سپہر!

ہر چہ در غیب است آید رو برو
پیش ازاں کز دل بروید آرزو!

در زبانِ خود چساں گویم کہ چیست
ایں جہاں نور و حضور و زندگی است

لالہ ہا آسودہ در کہسارہا
نہرہا گردندہ در گلزارہا!

غنچہ ہائے سرخ و اسپید و کبود
از دمِ قدوسیاں او را کشود!

آب ہا سیمیں، ہوا ہا عنبریں
قصرہا با قبہ ہائے زمردیں!

خیمہ ہا یاقوت گوں زرّیں طناب
شاہداں با طلعتِ آئینہ تاب!

گفت رومیؒ اے گرفتارِ قیاس
در گذر از اعتباراتِ حواس

از تجلی کارہائے خوب و زشت
می شود آں دوزخ ایں گردد بہشت!

اے کہ بینی قصرہائے رنگ رنگ
اصلش از اعمال و نے از خشت و سنگ!

آنچہ خوانی کوثر و غلماں و حور
جلوۂ ایں عالمِ جذب و سرور!

زندگی ایں جا ز دیدار است بس
ذوقِ دیدار است و گفتار است بس!"

اِس جہاں میں ہے نرالا اک جہاں
باعث اُس دنیا کا دیگر کن فکاں

لازوال اور ہر گھڑی ہے وہ دگر
ہے ورائے وہم، دِکھتا ہے مگر

تازہ تازہ ہر گھڑی اس کا کمال
اور انوکھا دمبدم اس کا جمال

وقت اس کا بے نیازِ ماہ و مہر
اس کی پہنائی میں گم ہیں نو سپہر!

غیب کہئے جس کو وہ ہے رو برو
اس سے پہلے کہ ہو پیدا آرزو

اپنے منہ سے کیا کروں اس کا بیاں
یہ جہاں نور و حضور و جملہ جاں!

لالہ بھی آسودہ ہیں کہسار میں
پیچ کھاتی ندیاں گلزار میں

نیلی، اجلی، لال کلیاں چار سو
پھونک سے قدوسیوں کی خندہ رو

آبِ سیمیں اور ہوائیں عنبریں
اس پہ ایوانوں کے گنبد زمردیں

ڈیرے یاقوتی، سنہری ڈوریاں
حور بھی کیسی چمکتی پتلیاں!

بولے رومی "اے گرفتارِ قیاس
ترک کر اب اعتباراتِ حواس

ہیں تجلیات وجہِ خوب و زشت
اک تجلی اس کی دوزخ، اک بہشت

ہیں عمل در شکلِ ایواں رنگ رنگ
ان کی اصلیت نہیں ہے خشت و سنگ

جن کو کہئے کوثر و غلمان و حور
ہے ظہورِ عالمِ جذب و سرور

اس جہاں کی زندگی دیدار ہے
لذّتِ دیدار ہے گفتار ہے

قصرِ شرف النساء

گفتم ایں کاشانۂ از لعلِ ناب — آنکہ می گیرد خراج از آفتاب!
ایں مقام ایں منزل ایں کاخِ بلند — حوریاں بر درگہش احرام بند!
اے تو دادی سالکاں را جستجوے — صاحبِ او کیست؟ با من باز گوے
گفت "ایں کاشانۂ شرف النساست — مرغِ باغش با ملائک ہم نواست!
قلزمِ ما ایں چنیں گوہر نزاد — ہیچ مادر ایں چنیں دختر نزاد!
خاکِ لاہور از مزارش آسماں — کس نداند رازِ او را در جہاں!
آں سراپا ذوق و شوق و درد و داغ — حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ
آں فروغِ دودۂ عبدالصمد — فقرِ او نقشے کہ ماند تا ابد!
تا ز قرآنِ پاک می سوزد وجود — از تلاوت یک نفس فارغ نبود
در کمرِ تیغِ دو رُو قرآں بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست!
خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز!
بر لبِ او چوں دمِ آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید!

قصرِ شرف النساء

پوچھا کس کا ہے یہ قصرِ لعلِ ناب ہے ثنا گر جس کا قرصِ آفتاب
یہ بلند ایوان ہے کس کا مکاں ہیں محرّم اس جگہ جو حوریاں
تو نے دی ہے سالکوں کو جستجو دے پتہ اس کے مکیں کا مجھ کو تو!
بولے "ہے شرف النسا کا آستاں مرغ اس کے ہیں ملک کے ہم زباں
ایسا موتی اپنے دریا میں کہاں! کب جنم دی ایسی بیٹی کوئی ماں
اس کی تربت سے ہے لاہور آسماں جانتا ہے کون راز اس کا یہاں!
وہ سراپا ذوق و شوق و درد و داغ حاکم پنجاب کی چشم و چراغ
وہ کہ شمعِ خاندانِ عبدالصمد فقر اس کا اک نمونہ تا ابد
تا کرے قرآن میں خود کو فنا اک گھڑی کاٹی نہ قرأت کے بنا
وہ کمر میں تیغ اور قرآں بدست 'تن بدن ہوش و حواس اللہ مست'
'خلوت و شمشیر و قرآن و نماز' عمر ساری ہو رہی وقفِ نیاز
روبرو تھا جبکہ دنیا سے سفر دیکھی ماں کی سمت بھر بھر کر نظر

گفت اگر از رازِ من داری خبر — سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند — کائناتِ زندگی را محور اند!
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس — دخترت را ایں دو محرم بود و بس!
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن — تیغ و قرآں را جُدا از من مکن
دل بآں حرفے کہ می گویم بنہ — قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ!

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ ما را ہمیں ساماں بس است!

عمر ہا در زیرِ ایں زرّیں قباب — بر مزارش بود شمشیر و کتاب
مرقدش اندر جہانِ بے ثبات — اہلِ حق را داد پیغامِ حیات
تا مسلماں کرد با خود آنچہ کرد — گردشِ دوراں بساطش در نورد
مردِ حق از غیرِ حق اندیشہ کرد — شیرِ مولا روبہی را پیشہ کرد!
از دلش تاب و تبِ سیماب رفت — خود بدانی آنچہ بر پنجاب رفت!

خالصہ شمشیر و قرآں را ببُرد
اندراں کشور مسلمانی بمُرد"

بولی میرے راز سے گر ہے خبر — دیکھ یہ شمشیر، یہ قرآں اِدھر!
قوتیں دو، ایک کی حافظ دگر — گھومتی ہے زندگی اس کیل پر
جس جہاں میں موت ہے ہر اک نفس — تیری بیٹی کے یہ دو محرم تھے بس
وقتِ رخصت ہے، یہ کہنا ہے مگر — تیغ و قرآں کو جدا مجھ سے نہ کر!
گوشِ دل سے سن یہ کہتی ہوں تجھے — شمع و گنبد کی نہیں حاجت مجھے!

مومنوں کو تیغ با قرآن ہے بس
میری تربت کو یہی سامان ہے بس

ایک مدت تک تہِ گنبد یوں ہی — قبر پر قرآن تھا شمشیر تھی
دے رہی تھی اس کی تربت ہر گھڑی — اہلِ ایماں کو پیامِ زندگی
جانتے ہو پھر مسلماں کیا ہوئے! — گردشِ دوراں سے مٹ کر رہ گئے
غیرِ حق سے مردِ حق ڈرنے لگا — شیرِ مولا روبہی پیشہ کیا
جو تپش دل میں تھی ان کے کھو گئی — جانے تو جو گت ہوئی پنجاب کی؟

تیغ و قرآں لگ گئے سکھوں کے ہاتھ
گم مسلمانی بھی اُن دونوں کے ساتھ

زیارتِ امیر کبیر حضرت سیّد علی ہمدانی و ملّا طاہر غنی کشمیری

حرف رومی در دلم سوزے فگند — آہ پنجاب! آں زمینِ ارجمند!
از تپِ یاراں تپیدم در بہشت — کہنہ غمہا را خریدم در بہشت!
تا دراں گلشن صدائے دردمند — از کنارِ حوضِ کوثر شد بلند!

"جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را
گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں"

گفت رومی "آنچہ می آید نگر — دل مدہ با آنچہ بگذشت اے پسر!
شاعرِ رنگیں نوا طاہر غنی — فقرِ او باطن غنی ظاہر غنی!
نغمہ رومی خواند آں مست مدام — در حضورِ سیّدِ والا مقام
سیّد السادات، سالارِ عجم — دستِ او معمارِ تقدیرِ اُمم!
تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت — ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت!
مرشدِ آں کشورِ مینو نظیر — میر و درویش و سلاطیں را مشیر!
خطّہ را آں شاہِ دریا آستیں — داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مردِ ایرانِ صغیر — با ہنرہائے غریب و دلپذیر

یک نگاہِ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہے بدہ"

زیارتِ امیر کبیر حضرت سیّد علی ہمدانی و ملّا طاہر غنی کشمیری

سُن کے رومی کا بیاں دل تھا غمیں
آہ وہ پنجاب، وہ پیاری زمیں!

مجھ کو جنّت میں غمِ یاراں ملا
مَیں غمِ ایّامِ رفتہ لے لیا!

اس چمن میں اک صدائے دردمند
حوضِ کوثر کی طرف سے تھی بلند

خار و خس چن چن کے لایا آپ جلنے کے لئے
گل یہ سمجھا میں بناتا ہوں چمن میں آشیاں

بولے رومی دیکھ جو آئے نظر
اب ذرا ماضی کو دل سے دور کر

شاعرِ رنگیں نوا طاہر غنی
فقر اس کا باطن و ظاہر غنی

نغمہ رکھتا ہے اسے مستِ مدام
در حضورِ سیّدِ والا مقام

سیّد السادات، سالارِ عجم
وہ کہ تھے معمارِ تقدیرِ اُمم

جن سے رازِ ھُو، غزالی کو ملا
ذکر و فکر ان کے ہی کنبہ کی عطا

رہنمائے خطۂ جنّت نظیر
وہ فقیر و میر، شاہوں کے مشیر

اس جہاں میں وہ تھے دریائے عطا
علم و دیں، تہذیب، صنعت سب دیا

کر دیا اس کو بھی ایرانِ صغیر
باہنر ہائے غریب و دل پذیر

تُو گرہ کا حل بس ان کی یک نگاہ
تیر کو ان کے ذرا دے دل میں راہ

در حضورِ شاہِ ہمدان

زندہ رود

از تو خواہم سرِّ یزداں را کلید
طاعت از ما جست و شیطاں آفرید

زشت و ناخوش را چناں آراستن!
در عمل از ما نکوئی خواستن!

از تو پرسم ایں فسوں سازی کہ چہ!
با قمارِ بد نشیں بازی کہ چہ!

مشتِ خاک و ایں سپہرِ گرد گرد
خود بگو می زیبدش کارے کہ کرد؟

کارِ ما افکارِ ما آزارِ ما
دست با دنداں گزیدن کارِ ما!

شاہِ ہمدان

بندہ کز خویشتن دارد خبر
آفریند منفعت را از ضرر!

رزم با دیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال!

خویش را بر اہرمن باید زدن
تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن!

تیز تر شو تا فتد ضربِ تو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت!

درحضورِ شاہِ ہمدان

زندہ رود

حکمِ طاعت ہم کو جب حق نے دیا — کہیئے کیوں شیطاں کو بھی پیدا کیا؟
زشت و ناخوش کو سجاتا ہے اِدھر — دیتا ہے فرمان نیکی کا اُدھر
پوچھتا ہوں کیا ہے یہ افسوں گری — بد نشیں وہ، ہم سے کیسی ہمسری؟
مشتِ گل افلاک میں گھر کر رہے — آپ خود کہیئے، یہ زیبا ہے اُسے؟
اپنے کار افکار آزار دوام — پھر بھی کیوں ہم کو پشیمانی سے کام

شاہِ ہمدان

جو بھی ہے اپنی خودی سے باخبر — نفع کر لیتا ہے اخذ اندر ضرر
صحبتِ شیطاں ہے آدم کو وبال — معرکہ اس سے ہے آدم کا جمال
اہرمن پر تجھ کو شب خوں چاہیئے — تیغ ہے تو سان وہ تیرے لئے
تیز تر ہو، ضرب اک کاری لگا — ورنہ تو بدبخت ہی رہ جائے گا

زندہ رود

زیرِ گردوں آدم آدم را خورد — ملّتے بر ملّتے دیگر چرد!
جاں ز اہلِ خطّہ سوزد چوں سپند — خیزد از دل نالہ ہائے دردمند!
زیرک و درّاک و خوش گل ملّتے است — در جہاں تر دستیٔ او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ اوست — در نئے من نالہ از مضمون اوست!
از خودی تا بے نصیب افتادہ است — در دیارِ خود غریب افتادہ است!
دست مزدِ او بدستِ دیگراں — ماہیٔ رودش بہ شستِ دیگراں!
کاروانہا سوئے منزل گام گام — کارِ او ناخوب و بے اندام و خام!
از غلامی جذبہ ہائے او بمرد — آتشے اندر رگِ تاکش فسرد!
تا نہ پنداری کہ بود است ایں چنیں — جبہہ را ہموارہ سود است ایں چنیں!

در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانباز و پُردم بودہ است!

کوہ ہائے خنگ سار او نگر — آتشیں دست چنار او نگر!
در بہاراں لعل می ریزد ز سنگ — خیزد از خاکش یکے طوفانِ رنگ!
لکہ ہائے ابر در کوہ و دمن — پنبہ پرّاں از کمانِ پنبہ زن!
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب — من خدا را دیدم آنجا بے حجاب!
با نسیم آوارہ بودم در نشاط — بشنو از نے، می سرودم در نشاط!

زندہ رود

ہے جہاں میں آدم، آدم کا شکار
ملّتوں کے درمیاں سب کارزار

اہلِ خطہ سے جلے جاں جوں سپند
دل سے پیدا نالہ ہائے دردمند

اپنی ملّت تیز فکر و خوش خیال
وہ زمانے میں ہنرور بے مثال

جام لبریز اس کا اس کے خون سے
مَیں ہوں نالاں اس کے ہی مضمون سے

چوں کہ ہے اپنی خودی سے بے نصیب
آپ اپنے ہی وطن میں ہے غریب

اختیار اوروں کا اور یہ دستکار
مچھلیاں، اسکی ہیں غیروں کا شکار

قافلے بڑھتے چلے ہیں گام گام
کام بھونڈے اس کے سب بدشکل و خام

جذبہ لاالائی کے باعث مردہ ہے
شعلہ اندر تاک کے افسردہ ہے

یہ نہ سمجھو، تھا سدا یونہی، نہیں
وہ نہ تھا پہلے کبھی سر بر زمیں

صف شکن بھی تھا زمانے میں کبھی
طاق تھا لوہا بجانے میں کبھی

دیکھ بر فانی فلک رس کوہسار
دیکھ اس کے آتشیں برگِ چنار

موسمِ گل میں گہربار اس کے سنگ
خاک کے بستر پہ اک طوفانِ رنگ

ابر کے ٹکڑے سے اڑتے آس پاس
جیسے دھنیوں کی کمانوں سے کپاس

کوہ و دریا اور غروبِ آفتاب
مَیں نے دیکھا جلوۂ حق بے حجاب

تھا نشاط اندر صبا ساگھومتا
'بشنوازنے' کا ترانہ لب پہ تھا

مرغکے می گفت اندر شاخسار — با پشیزے می نیرزد ایں بہار!
لالہ رست و نرگسِ شہلا دمید — بادِ نوروزی گریبانش درید!
عمرہا باید ازیں کوہ و کمر — نستر از نورِ قمر پاکیزہ تر!
عمرہا گل رخت بربست و کشاد
خاکِ ما دیگر شہاب الدیں نزاد!'

نالۂ پرسوز آں مرغِ سحر — داد جانم را تب و تابِ دگر!
تا یکے دیوانہ دیدم در خروش — آنکہ برد از من متاعِ صبر و ہوش!

"بگذر از ما و نالۂ مستانۂ ما مجوے
بگذر از شاخِ گل کہ طلسمے است رنگ و بوے
گفتی کہ شبنم از ورقِ لالہ می چکد
غافل دلے است ایں کہ بگرید کنارِ جوے!
ایں مشتِ پر کجا و سرود ایں چنیں کجا
روحِ غنی است ماتمیٔ مرگِ آرزوے!
بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے ز ما بہ مجلسِ اقوام باز گوے
دہقاں و کشت و جوے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند!"

بولا مرغ اک از فرازِ شاخسار ایک کوڑی کی نہیں ہے یہ بہار
لالہ پھوٹا، نرگسِ شہلا اُگی دھجیاں سب کی قبا ہو کر رہی
مدتوں سے بر سرِ کوہ و کمر نسترن تھی چاندنی سے خوب تر
عمریں بیتیں گل کھلے بھی مٹ گئے
پھر شہاب الدین نہ اٹھا خاک سے

جب سُنا یہ نالۂ مرغِ سحر مجھ میں پیدا ہو گئی تابِ دگر
دیکھا اک مجنوں ادھر گرمِ خروش لٹ گیا میرا متاعِ صبر و ہوش
جا ہم سے دور نالۂ مستانہ تو نہ پوچھ
ہے شاخِ گل فریبِ نظر رنگ و بُو نہ پوچھ
کہتا ہے تو کہ اوس ٹپکتی ہے لالہ سے
ہے اشک بار کوئی سرِ آب جُو نہ پوچھ
یہ مشت پر کہاں! غزل اس نوع کی کہاں
روحِ غنیؔ ہے مانگ آرزو نہ پوچھ
بادِ صبا تو جائے جنیواؔ اگر کبھی
کیا کر رہی مجلسِ اقوام، کو نہ پوچھ
دہقاں کے ساتھ بک گئے سب کشت و باغ و جو
قیمت یہ کوڑیوں کے بِکائے ہیں قوم کو

شاہِ ہمدان

با تو گویم رمزِ باریک اے پسر — تن ہمہ خاک است و جاں والا گہر
جسم را از بہرِ جاں باید گداخت — پاک را از خاک می باید شناخت!
گر ببرّی پارۂ تن را ز تن — رفت انہ دستِ تو آں لختِ بدن!
لیکن آں جانے کہ گردد جلوہ مست — گر ز دست او رہا دہی، آید بدست!
جوہرش با ہیچ شی مانند نیست — ہست اندر بند و اندر بند نیست!
گر نگہداری بمیرد در بدن — ور بیفشانی فروغِ انجمن!
چیست جانِ جلوہ مست اے مردِ راد؟ — چیست جاں دادن ز دست اے مردِ راد؟
چیست جاں دادن؟ بحق پرداختن! — کوہ را با سوزِ جاں بگداختن!
جلوہ مستی؟ خویش را دریافتن! — در شباں چوں کوکبے برتافتن!
خویش را نا یافتن نابودن است — یافتن، خود را بخود بخشودن است!
ہر کہ خود را دید و غیر از خود ندید — رخت از زندانِ خود بیروں کشید!
جلوہ بد مستے کہ بیند خویش را — خوشتر از نوشینہ داند نیش را!
در نگاہش جاں چو باد ارزاں شود — پیشِ او زندانِ او لرزاں شود!
تیشۂ او خارہ را بر می درد — تا نصیبِ خود ز گیتی می برد

تا ز جاں بگذشت، جانش جانِ اوست
ورنہ جانش یک دو دم مہمانِ اوست!

شاہِ ہمدان

آبتاؤں رمز اک باریک تر
جسم مٹی کا ہے، جاں روشن گہر

جاں کی خاطر جسم کر دینا فنا
خاک سے یوں پاک کو پہچاننا!

کاٹ دے حصہ کوئی گر جسم کا
ہاتھ سے تیرے وہ حصہ کھو گیا

ہاں جو مستِ جلوہ جاں کھو جائیگی
لوٹ کر پھر وہ ترے ہاتھ آئیگی

اس کے جوہر کی نہیں کوئی نظیر
بندھن اس کو رکھ نہیں سکتے اسیر

تن میں رکھے بند تو گور اس کو تن
اس کو پھیلائے تو روشن انجمن

کیا ہے جاں کی جلوہ مستی اے دلیر
کیا ہے کارِ جاں فدائی اے دلیر؟

جان دینا؟ پیشِ حق جاں کی نیاز
سوزِ جاں سے کوہ کو کرنا گداز

جلوہ مستی؟ خود کا پالینا سراغ
شب میں روشن جیسے تارے کا چراغ

خود سے لاعلمی، نہ ہونا ہے وہی
اپنی بخشش آپ سے خود آگہی

جو نہ دیکھا غیر کو اپنے سوا
ہو گیا زندانِ خود سے وہ رہا

مستِ جلوہ ہے جسے خود آگہی
نوش سے بہتر ہے اس کو نیش ہی

جاں ہے ارزاں تر ہوا سے بھی اسے
لرزہ ہا بر تن جہنم اس کے سامنے

ضرب سے خارہ کو کرتا ہے وہ شق
تا جہاں سے لے سکے وہ اپنا حق

جان جانے تک ہے جاں اسکی ہی جاں
ورنہ اس کی جاں ہے جیسے میہماں

زندہ رود

گفتہ از حکمتِ زشت و نکوے　　پیرِ دانا نکتۂ دیگر بگوے
مرشدِ معنی نگاہاں بودۂ　　محرمِ اسرارِ شاہاں بودۂ
ما فقیر و حکمراں خواہد خراج　　چیست اصلِ اعتبارِ تخت و تاج؟

شاہِ ہمدان

اصلِ شاہی چیست اندر شرق و غرب؟　　یا رضائے امتاں یا حرب و ضرب
فاش گویم با تو اے والا مقام　　باج را جز باد و کس دادن حرام!
یا اُولی الامرے کہ 'منکم' شانِ اوست　　آیۂ حق حجت و برہانِ اوست
یا جواں مردے چو صرصر تند خیز　　شہر گیرد خویش باز اندر ستیز
روزِ کیں کشور کشا از قاہری　　روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری
می تواں ایراں و ہندستاں خرید　　پادشاہی را ز کس نتواں خرید
جامِ جم را اے جوانِ باہنر　　کس نگیرد از دکانِ شیشہ گر
ور بگیرد مالِ او جز شیشہ نیست
شیشہ را غیر از شکستن پیشہ نیست

زندہ رود

کہہ دیئے سب رازہائے خیر و شر
اب ذرا بتلایئے نکتہ دگر

عارفوں کے واسطے ہو تم جو پیر
بہرِ شاہاں محرمِ راز و مشیر

ہم فقیر، اور حکمراں چاہے خراج
کہئے کیا ہے اعتبارِ تخت و تاج

شاہِ ہمدان

مشرق و مغرب کی شاہی کا یہ حال
یا رضائے قوم، یا جنگ و جدال

صاف کہتا ہوں سن اے والا مقام
باج ان دو کے سوا سب پر حرام!

ایک وہ جو صاحبِ فرمان ہے
حجت اس پر آیۂ قرآن ہے

یا جواں، جوں بادِ صرصر تند و تیز
فاتح و جانباز ہنگامِ ستیز

رن میں ہو کشور کشائی قاہری
ان کا شیوہ آشتی میں دلبری

ہند و ایراں مول سکتے ہیں مگر
کس نے لی ہے بادشاہی مول کر؟

ساغرِ جم اے جوانِ باہنر
ہے کہیں مالِ دکانِ شیشہ گر؟

مل بھی جائے تو وہ اک شیشہ ہے بس
ٹوٹنا اس کے لئے پیشہ ہے بس

غنی

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد؟　　صید را سودائے صیادی کہ داد؟
آں برہمن زادگانِ زندہ دل　　لالۂ احمر ز روئے شاں خجل!
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش　　از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش!
اصلِ شاں از خاکِ دامنگیر ماست!　　مطلعِ ایں اختراں کشمیر ماست!
خاکِ ما را بے شرر دانی اگر　　بر درونِ خود یکے بکشا نظر!
ایں ہمہ سوزے کہ داری از کجاست؟　　ایں دمِ بادِ بہاری از کجاست؟

ایں ہماں باد است کز تاثیرِ او
کوہسارِ ما بگیرد رنگ و بو!

ہیچ می دانی کہ روزے در دلِ کر　　موجۂ می گفت با موجِ دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم　　خیز تا یک دم بساحل سر زنیم
زادۂ ما یعنی آں جوئے کہن　　شورِ او در وادی و کوہ و دمن!
ہر زماں بر سنگِ رہ خود را زند　　تا بنائے کوہ را بر می کند
آں جواں کوہ و دشت و در گرفت　　پرورش از شیرِ صد مادر گرفت
سطوتِ او خاکیاں را محشرے است　　ایں ہمہ از ماست نے از دیگرے است
زیستن اندر حدِ ساحل خطاست　　ساحلِ ما سنگے اندر راہِ ماست

غنی

ہند کو کس نے ذوقِ آزادی دیا؟ صید تھا صیاد اسے کس نے کیا؟
برہمن زادے وہ، کتنے زندہ دل! ان کے آگے لالۂ احمر خجل!
تیز چشم و پختہ کار و سخت کوش ہے فرنگ ان کی نظر سے پُر خروش
وہ ہیں اپنی خاکِ دامن گیر سے ہیں ستارے اپنے ہی کشمیر کے
اپنی یہ مٹی نہیں ہے بے شرر دیکھ باطن اپنا آنکھیں کھول کر
سوز یہ اپنا کہاں سے آگیا؟ آئی کس رخ سے بہارِ جاں فزا؟
ہے اسی آب و ہوا سے یہ نکھار
رنگ و بو سے ہیں پٹے یہ کوہسار

کیا ہوا، اک دن ولر میں ہے خبر کہہ رہی تھی موج سے موجِ دگر
جنگ کب تک بحر میں بایک دگر چل ذرا ساحل سے اب ٹکرائیں سر
اپنی بیٹی یعنی وہ جوئے کہن اس سے ہیں پُر شور یہ کوہ و دمن
چلتی ہے رستے کے پتھر روندتی ڈھائے گی اک روز یہ کہسار بھی
دشت و در سب گھیرتی جاتی ہے وہ پرورش تنہا ماؤں سے پاتی ہے وہ
اس کی ہیبت سے پریشاں خاکیاں یہ سبھی ہم سے ہے غیروں سے کہاں؟
گھر کے ساحل سے بسر کرنا خطا سنگِ رہ ساحل رہا ہم کو سدا

باکراں در ساختن مرگِ دوام گرچہ اندر بحرِ غلطی صبح و شام
زندگی جولاں میانِ کوہ و دشت
اے خنک موجے کہ از ساحل گذشت!

اے کہ خواندی خطِ سیمائے حیات اے بہ خاور دادہ غوغائے حیات
اے ترا آہے کہ می سوزد جگر تو از و بے تاب و ما بے تاب تر!
اے ز تو مرغِ چمن را ہائے و ہُو سبزہ از اشکِ تو می گیرد وضو!
اے کہ از طبعِ تو کشتِ گل دمید اے ز امیدِ تو جانہا پُر امید!
کاروانہا را صدائے تو درا تو ز اہلِ خطّہ نومیدی چرا؟
دل میانِ سینۂ شاں مردہ نیست اخگرِ شاں زیرِ تخ افسردہ نیست!
باش تا بینی کہ بے آوازِ صُور ملّتے برخیزد از خاکِ قبور!
غم مخور اے بندۂ صاحب نظر برکش آں آہے کہ سوزد خشک و تر
شہرِ ملک زیرِ سپہرِ لاجورد سوخت از سوزِ دلِ درویش مرد
سلطنت نازک تر آمد از حباب از دمے او را تواں کردن خراب
از نوا تشکیلِ تقدیرِ امم از نوا تخریب و تعمیرِ امم
نشترِ تو گرچہ در دلہا خلید مر ترا چو نانکہ ہستی کس ندید!
پردۂ تو از نوائے شاعری است آنچہ گوئی ماورائے شاعری است!

تازہ آشوبے بفگن اندر بہشت!
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت!

ساحلوں سے دوستی مرگِ دوام غوطہ زن ہے بحر میں گو صبح و شام
دوڑنا کہسار میں ہے زندگی
موج جو ٹھکرا کے ساحل کو چلی

جانتا ہے تو اشارے زیست کے تجھ سے مشرق میں ہیں چرچے زیست کے
تیری آہیں باعثِ سوزِ جگر ان سے تو بیتاب، ہم بیتاب تر
تجھ سے مرغانِ چمن میں 'ہائے و ہو' تیرے آنسو سے کرے سبزہ وضو
فکر سے تو نے اگائے گلستاں اے تری امید سے امیدِ جاں
تیرا نغمہ کاروانوں کو درا کیوں ہے مایوس اہلِ خطہ سے بتا؟
ان کے پہلو میں دلِ مردہ نہیں برف سے آگ ان کی افسردہ نہیں
ٹھہرتا دیکھے ابھی بے بانگِ صور پھاڑ کر اک قوم نکلے گی قبور
غم نہ کھا اے بندۂ صاحب نظر آہ بھر اک پھونک دے سب خشک و تر
خاک ہو جاتی ہیں جل کر بستیاں آہ جب درویش بھرتا ہے یہاں
بلبلے سے بھی ہے نازک تر شہی ختم کرنے ان کی بس اک پھونک ہی
نغمہ سے بنتی ہے تقدیرِ اُمم نغمہ سے تخریب و تعمیرِ اُمم
تیرے نشتر ہیں دلوں میں جاگزیں پر تو کیسا ہے کوئی جانا نہیں
تیرا پردہ ہے نوائے شاعری تیری باتیں ماورائے شاعری

غلغلہ جنّت میں بھی ڈال اب ذرا
نغمۂ مستانہ اپنی دھن میں گا

زندہ رود

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن
گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن!
در میکدہ ہا دیدم شایستہ حریفے نیست!
بار ستمِ دستاں زن با مغبچہ ہا کم زن!
اے لالۂ صحرائی تنہا نتوانی سوخت
ایں داغ جگر تابے بر سینۂ آدم زن
تو سوزِ درونِ او، تو گرمیٔ خونِ او
باور نکنی؟ چاکے در پیکرِ عالم زن
عقل است چراغِ تو؟ در راہ گذارے نہ
عشق است ایاغِ تو با بندۂ محرم زن
لختِ دلِ پر خونے از دیدہ فرو ریزم
لعلے ز بدخشانم بردار و بخاتم زن!

زندہ رود

پی بادۂ درویشی پیمانہ بہ پیمانہ
شاہی پہ لگا جم کر اک ضربِ فقیرانہ
پوچھا مری دنیا سے راضی ہے؟ تو 'نا' بولا
بولا کہ "پھر الٹا دے دنیا کو دلیرانہ"
میخانے سبھی چھانے پایا نہ حریف اپنا
رستم سے لڑا پنجہ، کیوں بازیٔ طفلانہ!
تنہا کہیں جلتے ہیں اے لالۂ صحرائی؟
یہ داغِ جگر کر دے انسان کو نذرانہ
تو سوزِ دروں میں ہے، تو گرمیٔ خوں میں ہے
پائے یہی گر جانے ہستی کا نہاں خانہ
کر راہ تری روشن تو شمعِ خرد لے کر
جا صحبتِ محرم میں پی عشق کا پیمانہ
ٹکڑے دلِ پُرخوں کے اشکوں میں بہاتا ہوں
خاتم میں بٹھا لینا یہ گوہرِ یکدانہ!

صحبتِ با شاعرِ ہندی برتری ہری

حوریاں را در قصور و در خیام
نالۂ من دعوتِ سوزِ تمام!

آں یکے از خیمہ سر بیروں کشید
واں دگر از غرفہ رخ بنمود و دید!

ہر دلے را در بہشتِ جاوداں
دادم از درد و غمِ آں خاکداں!

زیرِ لب خندید پیرِ پاک زاد
گفت "اے جادو گرِ ہندی نژاد

آں نوا پرداز ہندی را نگر
شبنم از فیضِ نگاہِ او گہر!

نکتہ آرائے کہ نامش برتری است
فطرتِ او چوں سحاب آذری است!

از چمن جز غنچۂ نورس نچید
نغمۂ تو سوئے ما او را کشید!

پادشاہے با نوائے ارجمند
ہم بہ فقر اندر مقامِ او بلند!

نقشِ خوبے بندد از فکرِ شگرف
یک جہاں معنی نہاں اندر دو حرف!

کارگاہِ زندگی را محرم است
او حرم است و شعرِ او جامِ جم است!"

ما بہ تعظیمِ ہنر برخاستیم
باز باوے صحبتے آراستیم

زندہ رود

اے کہ گفتی نکتہ ہائے دل نواز
مشرق از گفتارِ تو دانائے راز!

شعر را سوز از کجا آید بگوئے
از خودی یا از خدا آید بگوئے!

شاعرِ ہندی برتری ہری سے ملاقات

بہرِ حوراں، ساکن قصر و خیام — میرا نالہ دعوتِ سوزِ تمام
ایک نے خیمہ سے سر باہر کیا — تھی جھروکے سے دگر جلوہ نما
جو بھی صاحب دل تھے جنّت میں وہاں — بانٹا سب کو درد و غمہائے جہاں
ہنس کے زیرِ لب یہ رومی نے کہا — واہ رے! جادوگرِ ہندی مرا!
شاعرِ ہندی ہے یہ آ دیکھ اِدھر — شبنم اس کی اک نظر سے ہے گہر!
ہے یہی دانائے ہندی برتری — برق و باراں اس کی فطرت میں سبھی
غنچے نورس ہی چُنے اس نے سدا — کھینچ لائی ہے اسے تیری نوا
بادشہ وہ اس کے اقوال ارجمند — فقر میں بھی مرتبہ اس کا بلند
اس کی ندرتِ فکر کی دنیا میں دھوم — اس کی دو باتوں میں دنیائے علوم
رازدانِ زلیست وہ عالی مقام — خود وہ جم اور جامِ جم اس کا کلام

اٹھ کھڑے ہم بہرِ تعظیمِ ہنر
پھر ہوئے صحبت سے اس کی بارور

زندہ رود

اے کہ ہے ہر بات تیری دل نواز — تو نے مشرق کو کیا دانائے راز
سوز آیا شعر میں کیونکر بتا — ہے خودی کی یا خدا کی یہ عطا

برتری ہری

کس نداند در جہاں شاعر کجاست — پردۂ او از بم و زیرِ نواست!
آں دلِ گرمے کہ دارد در کنار — پیشِ یزداں ہم نمی گیرد قرار!
جانِ ما را لذّت اندر جستجوست — شعر را سوز از مقامِ آرزوست!
اے تو از تاکِ سخن مستِ مدام — گر ترا آید میسّر ایں مقام
با دو بیتے در جہانِ سنگ و خشت — می تواں بردن دل از حورِ بہشت!

زندہ رود

ہندیاں را دیدہ ام در پیچ و تاب
سرِّ حق وقت است گوئی بے حجاب!

برتری ہری

ایں خدایانِ تنک مایہ ز سنگ اند و ز خشت!
برتری ہست کہ دور است ز دیر و ز کنشت!

برتری ہری

ہے کہاں شاعر کوئی پایا نہیں
ہو گا چھپ کر زیر و بم میں وہ کہیں

ہو دلِ پُرسوز اگر اندر کنار
پیشِ حق بھی ہو گا محرم قرار

جاں ہے لطف اندوز وجہِ جستجو
اور سوزِ شعر وجہِ آرزو

تو کہ مستِ نے نوازی ہے مدام
ہو گیا حاصل تجھے گر یہ مقام

شعر سے اندر جہانِ آب و گل
حورِ جنّت کا اڑا سکتا ہے دل

زندہ رود

ہند میں ہلچل ہے برپا چار سو
وقت ہے اب سرِّ حق کر فاش تُو!

برتری ہری

یہ خداوند ہیں پتھّر کے نہ بخشش نہ عطا
برتری دیر و کلیسا سے پرے ہٹ کے چلا

سجدہ بے ذوقِ عمل خشک و بجائے نرسد
زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت!
فاش گویم بتو حرفے کہ ندانند ہمہ کس
اے خوش آں بندہ کہ لوحِ دل او را بنوشت!
ایں جہانے کہ تو بینی اثرِ یزداں نیست
چرخ از تست و ہم آں رشتہ کہ بر دوکِ تو رشت!
پیشِ آئینِ مکافاتِ عمل سجدہ گذار
زانکہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت!

(ترجمہ از: برتری ہری)

ذوق کردار سے خالی ہو تو سجدے بے سود
زندگی سب ہے عمل خواہ بھلا، خواہ بُرا
فاش بتلاؤں مَیں جو راز ہے سب سے پنہاں
شاد وہ دل سے یقیں کر لیا جس نے اُس کا
ہے مکافات عمل، کارِ خداوند نہیں
چرخ بھی، ریل بھی، دھاگا ہے سبھی کچھ تیرا
پیشِ آئینِ مکافات جھکا دے سر کو
تیرا انجام ہے ویسا ہی عمل ہو جیسا

حرکت بہ کاخِ سلاطینِ مشرق

نادر، ابدالی، سلطان شہید

رفت در جانم صدائے برتری
مست بودم از نوائے برتری

گفت رومی "چشمِ دل بیدار بہ
پا بروں از حلقۂ افکار نہ

کردۂ بر بزمِ درویشاں گذر
یک نظر کاخِ سلاطیں ہم نگر!

خسروانِ مشرق اندر انجمن
سطوتِ ایران و افغان و دکن

نادر آں دانائے رمزِ اتحاد
با مسلماں داد پیغامِ وِ داد

مرد ابدالی وجودش آیتے
داد افغاں را اساسِ ملّتے

آں شہیدانِ محبت را امام
"آبروئے ہند و چین و روم و شام"

نامش از خورشید و مہ تابندہ تر
خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر!

عشق رازے بود بر صحرا نہاد
تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد؟

از نگاہِ خواجۂ بدر و حنین
فقرِ سلطاں وارثِ جذبِ حسین!

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز!"

حرف و صوتم خام و فکرم ناتمام
کے تواں گفتن حدیثِ آں مقام!

نوریاں از جلوہ ہائے او بصیر
زندہ و دانا و گویا و خبیر!

کاخِ سلاطینِ مشرق کی سیر

نادرؔ، ابدالیؔ، سلطانؔ شہید

برتری کا نغمہ دل کو بھا گیا
مجھ پہ بدمستی کا عالم چھا گیا

بولے رومیؔ دیدۂ دل وا رہے
رستگاری چاہیے افکار سے

بزمِ درویشاں میں تھا اب تک گزر
دیکھ اب کاخِ سلاطیں بھی ادھر

یہ شہانِ شرق کی ہے انجمن
"سطوتِ ایران و افغان و دکن"

تھی عیاں نادر پہ رمزِ اتحاد
دی مسلمانوں کو ترغیب و داد

چوں کہ ابدالیؔ کو تھا ملّت کا پاس
ڈالی افغانی اخوت کی اساس

وہ شہیدانِ محبت کا امام
"آبروئے ہند و چین و روم و شام"

ہر دمہ سے نام وہ تابندہ تر
خاکِ تربت ان کی ہم سے زندہ تر

کر دیا رازِ عشق کا سب پر عیاں
کیسے مستانہ دی ہے اُسے جاں

فقرِ سلطاں کا حضورِ مصطفیٰؐ
جیسے فقرِ شاہِ دشتِ کربلا

چل دیئے سلطان، گو مدت ہوئی
گونجتا ہے ان کا نقارہ ابھی

فکر میری ناتمام اور بات خام
ہے بیاں سے ماوریٰ ان کا مقام

نوریوں کو ان سے بینائی ملی
زندگی، دانائی، گویائی ملی

قصرے از فیروزہ دیوار و درش — آسمانِ نیلگوں اندر برش!
رفعتِ او برتر از چند و چگوں — می کند اندیشہ را خوار و زبوں!
آں گل و سرو و سمن آں شاخسار — از لطافت مثلِ تصویرِ بہار!
ہر زماں برگِ گل و برگِ شجر — دارد از ذوقِ نمو رنگِ دگر!
ایں قدر رباد صبا افسوں گر است — تا مژہ بر ہم زنی زرد احمر است!
ہر طرف فوارہ ہا گوہر فروش — مرغکِ فردوس زاد اندر خروش
بارگاہے اندراں کاخے بلند — ذرۂ او آفتاب اندر کمند!
سقف و دیوار و اساطیں از عقیق — فرشِ او از یشم و پرچیں از عقیق!
بر یمین و بر یسارِ آں وثاق — حوریاں صف بستہ با زرّیں نطاق!
درمیاں بنشستہ بر او رنگِ زر — خسروانِ جم چشم بہرام فر!
روئے آں آئینۂ حسنِ ادب — با کمالِ دلبری بکشاد لب
گفت "مردے شاعرے از خاور است — شاعرے یا ساحرے از خاور است!
فکرِ او باریک و جانش دردمند
شعرِ او در خاوراں سوزے فگند!"

نادر

خوش بیا اے نکتہ سنجِ خاوری — اے کہ می زیبد ترا حرفِ دری
محرمِ رازیم! با ما راز گوے — آنچہ می دانی ز ایراں باز گوے!

بام و در فیروزی قصرِ نیلگوں — آسمانِ نیلگوں اندر بروں
غیر ممکن اس کی رفعت کا قیاس — خستہ خود اندیشہ و مرہونِ یاس
وہ صنوبر، وہ چنبیلی، شاخسار — ان کی پاکی جیسے تصویرِ بہار
جھاڑ کے پتّے، گلوں کی پتّیاں — جلوہ رنگارنگ ان کا ہر زماں
کتنی افسوں گر ہے یہ بادِ صبا — آنکھ جھپکی، زرد احمر ہو گیا
ہر طرف فوارے تھے گوہر فشاں — اور خرد و شاں طائرِ باغِ جناں
بارگاہ اونچے محل میں اک وہاں — اس کے ہر ذرے میں سورج ضو فشاں
تھے عقیقی سقف و دیوار و ستوں — سرخ احاطہ، فرش اس کا سبزہ گوں
تھیں کمر بستہ وہاں حوریں دو صف — ایک بائیں سمت، اک دائیں طرف
تختِ زرّیں پر وہاں تھے جلوہ گر — بادشاہاں جم حشم، بہرام فر
رومی با حسنِ ادب و خوش ادا — تھے کمالِ دلبری سے لب کشا
بولے ان کو "شاعرِ مشرق ہے یہ — اک سخنور، ساحرِ مشرق ہے یہ
ہے دقیق اس کی نظر، پُر درد جاں
شعر اس کے سوز بخشِ خاوراں"

نادر

مرحبا اے نکتہ سنجِ خاوری — تجھ کو زیبا ہے زبانِ فارسی
ہم بھی محرم ہیں بتا رازِ نہاں — جو بھی جانے حالِ ایراں کر بیاں

زندہ رود

بعد مدت چشمِ خود بر خود کشاد — لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد
کشتۂ نازِ بتانِ شوخ و شنگ — خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ!
کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب — ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب!
روزگارِ او تہی از واردات — از قبورِ کہنہ می جوید حیات!
با وطن پیوست و از خود در گذشت — دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت!

نقشِ باطل می پذیرد از فرنگ
سرگذشتِ خود بگیرد از فرنگ!

پیریٔ ایراں زمانِ یزدجرد — چہرۂ او بے فروغ از خون سرد!
دین و آئین و نظامِ او کہن — شید و تارِ صبح و شامِ او کہن!
موجِ مے در شیشۂ مرتاکش نبود — یک شرر در تودۂ خاکش نبود!
تا ز صحرائے رسیدش محشرے — آنکہ داد او را حیاتِ دیگرے!
ایں چنیں حشر از عنایاتِ خدا است — پارس باقی! رومۃ الکبریٰ کجا ست؟
آنکہ رفت از پیکرِ او جانِ پاک — بے قیامت برنمی آید ز خاک!
مردِ صحرائی با یراں جاں دمید — باز سوئے ریگ زارِ خود رمید!
کہنہ را از لوحِ ما بستر دو رفت — برگ و سازِ عصرِ نو آورد و رفت!

آہ احسانِ عرب نشناختند
از تشِ افرنگیاں بگداختند!

زندہ رود

بعد مدّت خود کو وہ پایا مگر — اس کو بھایا حلقۂ دامِ دگر
بن کے جویائے بتانِ شوخ و شنگ — بھولی تہذیب اپنی بلی راہِ فرنگ
بن گیا سودائیِ ملک و نسب — ناز اسے ایران پہ، تحقیرِ عرب
اس کا جینا ہو گیا بے واردات — چاہتا ہے اب مزاروں سے حیات
بھول کر خود کو وطن پر وہ فدا — بندھ گیا رستم سے حیدرؓ سے گیا

راہِ باطل اس نے لی افرنگ سے
داستاں اپنی سنی افرنگ سے

تھا ضعیف ایراں بہ عہدِ یزدجرد — چہرہ بے رونق رگوں میں خونِ سرد
دین و آئین اور نظام اس کے کہن — نور و ظلمت صبح و شام اس کے کہن
موجِ صہبا تاک میں اس کے نہ تھی — راکھ میں ڈھونڈو تو چنگاری نہ تھی
جب وہ صحرا سے قیامت آ گئی — مل گئی ایراں کو تازہ زندگی
حشر ایسا فضلِ ربِ دو جہاں — اب بھی ہے ایراں، مگر روما کہاں
وہ بدن جس سے نکل جاتی ہے جاں — قبلِ محشر زندہ ہوتا ہے کہاں
پھونک کر صحرا کے تن میں تازہ جاں — اپنے صحرا کو چلا پھر کارواں
نقشِ پارینہ مٹا کر لوح سے — کر کے عصرِ نو کا ساماں چل دیئے

آہ احسانِ عرب بھولے سبھی
اُن کو پگھلا دی ہے آگ افرنگ کی

نمود ارمی شود روحِ ناصرِ خسرو علوی و غزلے مستانہ سرائیدہ غائب میشود

"دست را چوں مرکبِ تیغ و قلم کردی مدار
ہیچ غم گر مرکبِ تن لنگ باشد یا عرن
از سرِ شمشیر و از نوکِ قلم زاید ہنر
اے برادر ہمچو نور از نار و نار از نارون
بے ہنر داں نزدِ بے دیں ہم قلم ہم تیغ را
چوں نباشد دیں نباشد کلک و آہن را ثمن
دیں گرامی شد بدانا و بناداں خوار گشت
پیشِ ناداں دیں چو پیشِ گاو باشد یاسمن!
ہمچو کرپاسے کہ از یک نیمہ زو الیاس را
کرتہ آید و ز دگر نیمہ یہودی را کفن"

ابدالی

آں جواں کو سلطنت ہا آفرید — باز در کوہ و قفارِ خود رمید!
آتشے در کوہ سارش برفروخت — خوش عیار آمد بروں یا پاک سوخت؟

رُوحِ ناصرِ خسروِ علوی ظاہر ہوتی ہے اور یہ غزلِ مستانہ اندازِ مین سناکر

وہ کہ جس کے بس میں ہو گا مرکبِ تیغ و قلم
پاؤں سے معذور ہو گا بھی تو ہے وہ زور ور
آگ سے جس طرح ایندھن اور جوں ایندھن سے نور
خامہ و شمشیر کی تیزی سے پیدا ہے ہنر
بے ہنر ہوتے ہیں بے دینوں کے شمشیر و قلم
دین سے غافل جو ہوں گے وہ نہ پائیں گے ثمر
دین دانا سے معزّز اور ناداں سے ذلیل
جاہلوں میں دین گویا یاسمن پیشِ بقر
نصف چادر جامۂ الیاسؑ! کیا اس کا مقام!
جو یہودی کا کفن ہو، حیف وہ نصف دگر!

ابدالی

مملکت کا پایہ رکھ کر جو جواں ہو گا کوہ و غار کی جانب رواں
وہ کرے کہسار کو پھر شعلہ زار جل کے ہو گا راکھ یا کامل عیار

زندہ رود

امّتاں اندر اخوت گرم خیز — او برادر با برادر در ستیز!
از حیاتِ او حیاتِ خاور است — طفلکِ ده سالہ اش لشکر گر است!
بے خبر خود را ز خود پرداختہ — ممکناتِ خویش را نشناختہ!
ہمت دارائے دل و غافل ز دل — تن ز تن اندر فراق و دل ز دل!
مردِ رہرو را بمنزل راہ نیست — از مقاصد جانِ او آگاہ نیست!
خوش سرود آں شاعرِ افغاں شناس — آنکہ بیند، باز گوید بے ہراس!
آں حکیمِ ملّت افغانیاں — آں طبیبِ علّتِ افغانیاں!
رازِ قومے دید و بے باکانہ گفت — حرفِ حق با شوخیٔ رندانہ گفت!
"اُشترے یابد اگر افغانِ حُر — با یراق و ساز و با انبارِ دُر
ہمتِ دونش ازاں انبارِ دُر — می شود خوشنود با زنگِ شتر!"

ابدالی

در نہادِ ماتب و تاب از دل است — خاک را بیداری و خواب از دل است!
تن ز مرگِ دل دگرگوں می شود — در مساماتش عرق خوں می شود!
از فسادِ دل بدن ہیچ است ہیچ — دیدہ بر دل بند و جز بر دل مپیچ!

زندہ رود

قوموں کی خوبی ہے ذوقِ اتفاق
ہے وہاں پر بھائی بھائی میں نفاق

اس کی ہستی سے ہے مشرق کی کشاد
اس کے بچوں میں بھی ہے ذوقِ جہاد

بے خبر خالی ہے خود سے آپ ہی
ممکنات اپنے نہ پایا وہ ابھی

رہ کے وہ دارائے دل، غافل ز دل
تن ز تن بے واسطہ و دل ز دل

راہرو منزل کو خود جانا نہیں
خود مقاصد کو بھی وہ پایا نہیں

خوب بولا شاعرِ افغاں شناس
جو بھی دیکھا بولتا ہے بے ہراس

وہ حکیمِ ملّتِ افغانیاں
وہ طبیبِ علّتِ افغانیاں

جو بھی دیکھا کہہ دیا وہ صاف صاف
کتنا رندانہ ہے اس کا انکشاف!

"کوئی اونٹ افغاں پاتا ہے اگر
اس پہ ہو سامان و انبارِ گہر

ابلہ وہ لعل و گہر سب چھوڑ کر
ہوگا خوش زنگولہ کی آواز پر!"

ابدالی

ساتھ جاں کے ہے یہ دل کا اضطراب
منحصر ہیں دل پہ بیداری و خواب

جسم مر جاتے ہیں دل کی موت سے
اور پسینہ ہو کے خوں بہنے لگے

دل ہے گر بیمار تن مٹی کا ڈھیر
دل پہ رکھ دائم نظر اس سے نہ پھیر

آسیا یک پیکرِ آب و گل است ملّتِ افغاں دراں پیکر دل است!
از فسادِ او فسادِ آسیا در کشادِ او کشادِ آسیا!
تا دل آزاد است آزاد است تن ورنہ کاہے در رہِ باد است تن!
ہمچو تن پابندِ آئین است دل مردہ از کیں زندہ از دین است دل!

قوتِ دیں از مقامِ وحدت است
وحدت ار مشہود گردد ملّت است!

شرق را از خود برد تقلیدِ غرب باید ایں اقوام را تنقیدِ غرب
قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب!
نے ز سحرِ ساحرانِ لالہ روست نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ موست!
محکمی او را نہ از لادینی است نے فروغش از خطِ لاطینی است!
قوتِ افرنگ از علم و فن است از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست مانعِ علم و ہنر عمّامہ نیست!
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ!
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست ایں کُلہ یا آں کُلہ مطلوب نیست

فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ درّاکے اگر داری بس است!

گر کسے شبہا خورد دودِ چراغ گیرد از علم و فن و حکمت سراغ!
ملکِ معنی کس حدِ او را نہ بست بے جہادِ پیہمے ناید بدست!

ایشیا ہے ایک جسمِ آب و گل — قومِ افغانی ہے اس میں جیسے دل
ہے فسادِ ایشیا اس کا فساد — ہے کشادِ ایشیا اس کی کشاد
دل ہے گر آزاد تن آزاد ہے — ورنہ اک تنکا سوارِ باد ہے
اپنا دل وابستہ ہے آئین سے — مردہ بے دینی سے، زندہ دین سے

اس کی وحدت سے ہے قوت کی نمود
اور وحدت سے ہے ملّت کا وجود

دورِ خود سے شرق از تقلیدِ غرب — گرچہ لازم اس کو تھی تنقیدِ غرب
عیش کوشی سے نہیں مغرب قوی — وجہ اس کی رقص نے بے پردگی
کچھ حسینوں کی نہیں یہ ساحری — قطع مو کی ہے نہ عریاں ساق کی
اصل قوت اس کی بے دینی نہیں — خطِ لاطینی کی خوبی بھی نہیں
اس کی قوت کا سبب علم و ہنر — روشنی اس کی سبب اس کا ثمر
باعثِ علم و ہنر جامہ نہیں — مانع اس کا اپنا عمامہ نہیں
علم و فن کے واسطے ہے مغز اساس — کب ہے باعث اس کا افرنگی لباس
چاہیئے اس کے لئے روشن نگاہ — یہ کلاہ مطلوب ہے نے وہ کلاہ

چاہیئے فکرِ رسا اس کے لئے
اور بس اس کو ذہانت چاہیئے

مستقل کوشش ضروری ہے اسے — علم و فن، حکمت سبھی حاصل کرے
ملکِ معنی کی حدِ فاصل نہیں — جہدِ پیہم کے بنا حاصل نہیں

تُرکِ از خود رفتہ و مستِ فرنگ — ز ہر نوشیں خوردہ از دستِ فرنگ
زانکہ تریاقِ عراق از دست داد — من چہ گویم جز خدایش یار باد
بندۂ افرنگ از ذوقِ نمود — می برد از غربیاں رقص و سرود!
نقدِ جانِ خویش در بازد بہ لہو — علم دشوار است می سازد بہ لہو!
از تن آسانی بگیرد سہل را — فطرتِ او در پذیرد سہل را!

سہل را جستن دریں دیرِ کہن
ایں دلیلِ آنکہ جاں رفت از بدن!

زندہ رود

می شناسی چیست تہذیبِ فرنگ — در جہانِ او دو صد فردوسِ رنگ!
جلوہ ہایش خانمانہا سوختہ — شاخ و برگ و آشیانہا سوختہ!
ظاہرش تابندہ و گیرندہ ایست — دل ضعیف است و نگہ رابندہ ایست!
چشم بیند دل بلغزد اندروں — پیشِ ایں بت خانہ افتد سرنگوں!
کس نداند شرق را تقدیر چیست! — دل بظاہر بستہ را تدبیر چیست؟

ابدالی

آنچہ بر تقدیرِ مشرق قادر است — عزم و حزمِ پہلوی و نادر است

تُرک نے طرزِ فرنگ اپنا لیا — اس کے ہاتھوں زہرِ شیریں کھا لیا
زہر مہرہ دیں کا ہاتھوں سے دیا — بس کہوں گا اس کا حافظ ہے خدا
ظاہری خوبی پہ مرتا ہے غلام — ناچ گانے غرب سے سیکھے تمام
عیش و عشرت پر کرے جاں کو فدا — علم دشوار، عیش اسے آسان تھا
چاہیے وہ سب سہل اور تن پروری — اس کی فطرت چاہتی ہے سہل ہی

ڈھونڈنا آسانیوں کو ہر کہیں
ہے ثبوت اس کا تن میں جاں نہیں

رندہ رود

جانتے ہو کیا ہے تہذیبِ فرنگ — جنتیں اس کی جہاں میں رنگ رنگ
پھونک ڈالے اس نے کتنے خانماں — کیسے کیسے باغ، کتنے آشیاں!
اس کا ظاہر دل کش و تابندہ ہے — دل ہے لاغر، وہ نظر کا بندہ ہے
آنکھ دیکھے اور دل جائے پھسل — بت کے آگے گر پڑے گا منہ کے بل
کیا کہیں ہے شرق کا انجام کیا! — کیا ہے اس ظاہر پرستی کی دوا!

ابدالی

جس کے ہاتھوں میں ہے قسمت شرق کی — وہ ہیں نادر اور رضا شاہ پہلوی

پہلوی آں وارثِ تختِ قباد — ناخنِ او عقدۂ ایراں کشاد
نادرِ آں سرمایۂ دُرّانیاں — آں نظامِ ملّتِ افغانیاں
از غمِ دین و وطن زار و زبوں — لشکرش از کوہسار آمد بروں
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر — با عدو فولاد و با یاراں حریر!
من فدائے آنکہ خود را دیدہ است — عصرِ حاضر را نکو سنجیدہ است!

غربیاں را شیوہ ہائے ساحری است
تکیہ جز بر خویش کردن کافری است

سلطان شہید

باز گو از ہند و از ہندوستاں — آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں!
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد — آنکہ اندر دیرِ او آتش فسرد!
آنکہ دل از بہرِ او خوں کردہ ایم — آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غمِ ما کن غمِ او را قیاس — آہ ازاں معشوقِ عاشق ناشناس!

زندہ رود

ہندیاں منکر ز قانونِ فرنگ — در نگیرد سحر و افسونِ فرنگ!
روح را بارِ گراں آئینِ غیر — گرچہ آید ز آسماں آئینِ غیر!

پہلوی فرمانروا ایران کا ملکِ ایراں کے لیے مشکل کشا
اور نادر وارثِ درّانیاں اس سے نظمِ ملّتِ افغانیاں
دردِ دیں، فکرِ وطن سے زار زار اس کے فوجی مردمانِ کوہسار
وہ سپاہی، وہ سپہ گر، وہ امیر اعدا کو فولاد، یاروں کو حریر
مَیں فدا اس مردِ خود آگاہ پر عصرِ نو سے جو ہوا اچھا باخبر

کاروبارِ غرب سارے ساحری
غیر پر اپنا بھروسہ کافری

سلطان شہید

اب ذرا ہندوستاں کا ہو بیاں کاہ بھی جس کی ہے رشکِ بوستاں
وہ کہ جس کی مسجدیں سنساں ہیں وہ، جہاں آتش کدے ویران ہیں
وہ کہ جس کے غم سے دل آباد ہے میری جاں میں تازہ جس کی یاد ہے
جیسے ہم رنجور، ویسا غم اسے وہ مگر واقف نہیں عشاق سے

زندہ رود

ہند پر قانونِ یورپ بار ہے سحرِ افرنگی سے وہ بیزار ہے
بوجھ بھاری جان پر آئینِ غیر آسمانی بھی ہو گر آئینِ غیر

سلطان شہید

چوں بروید آدم از مشتِ گلے — بادلے، بآرزوئے دردلے!
لذتِ عصیاں چشیدن کارِ اوست — غیرِ خود چیزے ندیدن کارِ اوست!
زانکہ بے عصیاں خودی ناید بدست — تا خودی ناید بدست آید شکست!
زائرِ شہر و دیارم بودۂ — چشمِ خود را بر مزارم سودۂ!
اے شناسائے حدودِ کائنات — در دکن دیدی ز آثارِ حیات؟

زندہ رود

تخمِ اشکے ریختم اندر دکن — لالہ ہا روید ز خاکِ آں چمن!
رود کاویری مدام اندر سفر — دیدہ ام در جانِ او شورے دگر!

سلطان شہید

اے ترا دادند حرفِ دل فروز — از تپِ اشکِ تو می سوزم ہنوز
کاوِ کاوِ ناخنِ مردانِ راز — جوئے خوں بکشاد از رگہائے ساز

سلطان شہید

خاک سے جب ہوگی انسان کی نمو — ہوگا دل پہلو میں، دل میں آرزو!
کارِ عصیاں سے شغف اس کو مدام — مستِ خود وہ اس کو کیا غیروں سے کام
بے خطا کاری خودی پیدا نہیں — ہارے ہے جب تک اسے پاتا نہیں
سیر کی تو نے مرے اقلیم کی — تو نے آنکھوں سے لگائی قبر بھی
تو ہے آگاہِ حدودِ کائنات — کیا دکن میں ہیں کچھ آثارِ حیات؟

زندہ رود

مَیں نے بوئے اشک در خاکِ دکن — تختۂ لالہ بنے گا وہ چمن!
رات دن کاوِیری ہے اندر سفر — اس کی ہلچل کی ہے کیفیت دگر!

سلطان شہید

تو نے پائی ہے زبانِ دل فروز — ہوں تپش سے اس کی میں سوزاں ہنوز
کاوشِ ناخونِ اہلِ راز سے — جوئے خوں جاری ہے تارِ ساز سے

آں نوا کز جانِ تو آید بروں　　می دہد ہر سینہ را سوزِ دروں!
بودہ ام در حضرتِ مولائے کُل[۳]　　آنکہ بے او طے نمی گردد سُبل!
گرچہ آنجا جرأتِ گفتار نیست　　روح را کارے بجز دیدار نیست!
سوختم از گرمیٔ اشعارِ تو　　برزبانم رفت از افکارِ تو
گفت "ایں بیتے کہ برخواندی زکیست؟　　اندرو ہنگامہ ہائے زندگی است!"
باہماں سوزے کہ در سازد بجاں　　یک دو حرف از مابہ کاویری رساں!

در جہاں تو زندہ رود او زندہ رود
خوشترک آید سرود اندر سرود

آج تیرے دم سے اے آتش نوا! آگ سینوں میں ہے روشن جا بجا
درگہِ مولائے کُل میں بھی گیا راہیں طے ہوتی نہیں جن کے بِنا
حوصلہ اس جا نہیں گفتار کا روح رہتی ہے فقط محوِ لقا
مَیں ترے اشعار سے سوزاں جو تھا ذکر کر بیٹھا ترے افکار کا
پوچھے تیرے لب پہ ہے کس کا کلام؟ زندگی کا جوش ہے اس میں تمام
سوز ایسا ہو جو ہو جاں کو سزا مجھ سے کاویری کو دو باتیں بتا

تُو بھی زندہ رود، وہ بھی زندہ رود!
خوب ہے عالم، سرود اندر سرود!

پیغام سلطان شہید بہ رودِ کاویری

(حقیقت حیات و مرگ و شہادت)

رودِ کاویری یکے نرمک خرام　　خفتہ شاید کہ از سیرِ دوام!
در کہستاں عمرہا نالیدہ　　راہ خود را با مژہ کاویدہ
اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات　　اے دکن را آب تو آبِ حیات!
آہ شہرے کو در آغوش تو بود　　حسن نوشین جلوہ از نوشِ تو بود
کہنہ گر دیدی شباب تو ہماں　　پیچ و تاب و رنگ و آبِ تو ہماں!
موجِ تو جز دانۂ گوہر نزاد　　طرّۂ تو تا ابد شوریدہ باد!
اے ترا سازے کہ سوزِ زندگی است　　ہیچ می دانی کہ ایں پیغامِ کیست؟
آنکہ می کردی طوافِ سطوتش　　بودۂ آئینہ دارِ دولتش!
آنکہ صحرا باز تدبیرش بہشت!　　آنکہ نقشِ خود بخونِ خود نوشت!
آنکہ خاکش مرجعِ صد آرزوست　　اضطرابِ موجِ تو از خونِ اوست!

آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب و او بیدار بود!

اے من و تو موجے از رودِ حیات　　ہر نفس دیگر شود ایں کائنات!

کاویری کو پیامِ سلطانِ شہید

(حیات، موت اور شہادت کی حقیقت)

رودِ کاویری چل آہستہ ذرا
مدتوں کہساروں میں نالاں رہی
اے تو مجھ کو رشکِ جیحوں و فرات
تیرے پہلو میں جو شہر اپنا بسا
کہنہ ہو کر بھی وہی تیرا شباب!
بس تری موجوں سے موتی ہی ملے
اے کہ سوزِ زیست ہے ساماں ترا
وہ کہ جس کے طوف میں تھی پُر ہراس
جس کی تدبیروں سے صحرا بھی بہشت
جس کی مٹی مرجعِ صد آرزو

تھک گئی ہو گی تو چل چل کر سدا
(رستہ پکڑ، سے بنلتے چل پڑی)
ہے دکن میں تیرا آب، آبِ حیات
تیرے امرت سے وہ شیریں جلوہ تھا
بل وہی ہے اور وہی سب رنگ و آب
طرہ آشفتہ ترا دائم رہے
ہے خبر؟ پیغام یہ کس نے دیا
جس کی دولت کا تھا تجھ میں انعکاس
لکھی اپنے خوں سے اپنی سرگذشت
تیری لہروں میں تپاں جس کا لہو

جس کا قول آئینۂ کردار تھا
نیند میں مشرق تھا وہ بیدار تھا

زیست کے دھارے میں ہم موجِ رواں
کائناتِ دہر دیگر ہر زماں

زندگانی انقلابِ ہر دمے است — زانکہ او اندر سراغِ عالمے است!
تار و پودِ ہر وجود از رفت و بود — ایں ہمہ ذوقِ نمود از رفت و بود
جادہ ہا چوں رہرواں اندر سفر — ہر کجا پنہاں سفر پیدا حضر!
کاروان و ناقہ و دشت و نخیل — ہر چہ بینی نالد از دردِ رحیل!
در چمن گل میہمانِ یک نفس — رنگ و آبش امتحانِ یک نفس!
موسمِ گل ہا تمّم و ہم نائے و نوش — غنچہ در آغوش و نعشِ گل بدوش!
لالہ را گفتم یکے دیگر بسوز — گفت رازِ ما منی دانی ہنوز!

از خس و خاشاک تعمیرِ وجود
غیر حسرت چیست پاداشِ نمود؟

در سرائے ہست و بود آئی؟ میا — از عدم سوئے وجود آئی؟ میا
در بیابانی چوں شرار از خود مرو — در تلاشِ خرمنے آوارہ شو!
تاب و تب داری اگر مانندِ مہر — پا نبہ در وسعت آبادِ سپہر!
کوہ و مرغ و گلشن و صحرا بسوز — ماہیاں را در تہِ دریا بسوز!
سینہ داری اگر در خوردِ تیر — در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر!
زانکہ در عرضِ حیات آمد ثبات — از خدا کم خواستم طولِ حیات!

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟
یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش!

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست — موت نیرنج و طلسم و سیمیاست!

زندگی کا رنگ ہے ہر دم دگر　　ڈھونڈتی ہے ہر گھڑی عالم دگر
جو بھی پیدا ہے فنا انجام ہے　　سب دکھاوا ہے فنا انجام ہے
راستے خود جوں مسافر در سفر　　ہے سفر در اصل، لگتا ہے حضر
قافلہ و ناقہ، صحرا و شجر　　در درِ رحلت سے ہیں سب نالاں ادھر
گُل چمن میں اک نفس کا میہماں　　حسن و خوبی لمحہ بھر کا امتحاں
فصلِ گُل شادی، ادھر ماتم ادھر　　غنچہ بر میں نعشِ گل کی دوش پر
بولا، لالہ سے تو بن سوز ندہ تر!　　بولا کیا تجھ کو نہیں اب تک خبر؟

ہے خس و خاشاک سے پیدا وجود
غیرِ حسرت کیا ہے انجام نمود

عالمِ فانی میں آتا ہے؟ نہ آ　　نیست سے ہستی میں آتا ہے؟ نہ آ
آ کے چنگاری کی صورت بجھ نہ جا　　جستجوِ خرمن کی کر، پھر جا بجا
تجھ میں تابانی ہے سورج کی اگر　　وسعتِ افلاک میں ہو جلوہ گر
کوہ و باغ و مرغ و صحرا کو جلا　　ماہیانِ بطنِ دریا کو جلا
تیر کے قابل ترا سینہ ہے گر　　دہر میں شاہیں ساجی شاہیں سامر
چوں کہ عرضِ زندگانی ہے ثبات　　حق سے مانگا ہی نہیں طول حیات

رسم و راہِ زیست کو سمجھا ہے کیا؟
سو برس گیدڑ کے اک دم شیر کا

ہے قوی خوئے رضا سے زندگی　　شعبدہ ہے بس حقیقت موت کی

بندۂ حق صیغم و آہو ست مرگ — یک مقام از صد مقام اوست مرگ!
می فتد بر مرگ آں مرد تمام — مثل شاہینے کہ افتد بر حمام!
ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ — زندگی او را حرام از بیمِ مرگ!
بندۂ آزاد را شانے دگر — مرگ او را می دہد جانے دگر!
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست! — مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست!
بگذر از مرگے کہ سازد بالحد — زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد!
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک — آں دگر مرگے کہ بر گیرد ز خاک!
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر! — مرگِ پورِ مرتضےؓ چیزے دگر!
آں دگر مرگ! انتہائے راہ شوق — آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق!
جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است — جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است!
جنگِ مومن چیست؟ ہجرت سوئے دوست! — ترکِ عالم، اختیارِ کوئے دوست!
آنکہ حرفِ شوق با اقوام گفت — جنگ را رہبانیٔ اسلام گفت!

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

بندۂ حق شیر، آہو موت اُسے
یا ہے منزل سانس لینے کیلئے

مرد آتا ہے اجل پر پھاند کر
جس طرح شہباز جھپٹے مرغ پر

موت کی ہیبت سے مرتا ہے غلام
موت کے ڈر سے اسے جینا حرام

ہے مقامِ مردِ آزاد اور ہی
موت اسے دیتی ہے تازہ زندگی

اس کو دُھن اپنی، نہیں ڈر موت کا
مرگِ حُر اک لمحہ بھر ہے اور کیا؟

مرگ و آرامِ لحد فاسد خیال
یہ ہے چوپایوں کے مرنے کی مثال

مردِ حق وہ موت مانگے ہر گھڑی
جو کرے مٹی سے پیدا زندگی

گرچہ ہے ہر مرگ مومن کو عزیز
مرگِ فرزندِ علیؓ ہے اور چیز

مرگ دیگر! وہ ہے حدِّ راہِ شوق
آخری تدبیر در جنگاہِ شوق

"جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری
جنگِ مومن سنتِ پیغمبری"

جنگِ مومن کیا ہے ہجرت سوئے دوست
"ترکِ عالم، اختیار کوئے دوست"

جس نے درسِ عشق دنیا کو دیا
جنگ کو رہبانیٔ مسلم کہا

غیرِ شہداء اس کی ہے کس کو تمیز
لی انہوں نے خون کی قیمت میں یہ چیز

زندہ رود رخصت می شود از فردوسِ بریں و تقاضائے حورانِ بہشتی

شیشۂ صبر و سکونم ریز ریز
پیرِ رومی گفت در گوشم کہ خیز!

آں حدیثِ شوق و آں جذب و یقیں
آہ آں ایوان و آں کاخِ بریں!

بادلِ پُرخوں رسیدم بر درش
یک ہجومِ حور دیدم بر درش!

بر لبِ شاں زندہ رود، اے زندہ رود
زندہ رود، اے صاحبِ سوز و سرود!

شور و غوغا از یسار و از یمیں
یک دو دم با ما نشیں، با ما نشیں!

زندہ رود

راہرو کو داند اسرارِ سفر
ترسد از منزل ز رہزن بیشتر

عشق در ہجر و وصال آسودہ نیست
بے جمالِ لایزال آسودہ نیست!

ابتدا پیشِ بتاں افتادگی
انتہاں از دلبراں آزادگی!

عشقِ بے پروا و ہر دم در رحیل
در مکاں و لامکاں ابنِ السبیل!

کیشِ ما مانندِ موجِ تیز گام
اختیارِ جادہ و ترکِ مقام!

زندہ رود فردوسِ بریں سے رخصت ہوتا ہی
اور حورانِ بہشتی کا تقاضا

دل سے سب صبر و سکوں جاتا رہا
کان میں رومی نے اٹھنے کو کہا

وہ کلامِ شوق وہ جذب و یقیں
آہ! وہ ایوان، وہ کاخِ بریں

حسرتوں کے ساتھ پہنچا تا بہ در
اک ہجومِ حور کو پایا ادھر

اُن کے لب پر زندہ رود اے زندہ رود
"زندہ رود اے صاحبِ سوز و سرود!"

دائیں بائیں شور ان کا تھا یہی
"بیٹھ ہمارے ساتھ اک دو دم ابھی"

زندہ رود

راہ رو ہے واقفِ رازِ سفر
بڑھ کے رہزن سے اسے منزل کا ڈر

عشق بے کل ہجر ہو یا ہو وصال
چاہیئے اس کو جمالِ لایزال

اوّل اوّل عاجزی پیشِ بتاں
انتہا کیا؟ احتراز از دلبراں

عشق مشغولِ سفر ہے ہر زماں
وہ ہے رہگیرِ مکان و لامکاں

چلتے رہنا موج سا بس اپنا کام!
راہ سے دل بستگی ترکِ مقام!

حورانِ بہشت

شیوہ ہا داری مثالِ روزگار
یک نوائے خوش در ایغ از ما مدار

غزلِ زندہ رود

بآدمے نرسیدی، خدا چہ می جوئی
ز خود گریختہ را آشنا چہ می جوئی!

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم درکش
پریدہ رنگ! از بادِ صبا چہ می جوئی؟

دو قطرہ خونِ دل است آنچہ مشک می نامند
تو اے غزالِ حرم در خطا چہ می جوئی؟

عیارِ فقر ز سلطانی و جہانگیری است
سریرِ جم بطلب بوریا چہ می جوئی!

سراغِ او ز خیابانِ لالہ می گیرند
تو اے خوں شدۂ ما نما چہ می جوئی!

نظر ز صحبتِ روشندلاں بیفزاید
ز دردِ کم بصری تو تیا چہ می جوئی!

قلندر یم و کراماتِ ما جہاں بینی است
ز ما نگاہ طلب کیمیا چہ می جوئی!

حورانِ بہشت

ہے زمانے کی طرح تو خوش ادا
اک غزل ہم کو سنائے بن نہ جا

زندہ رود کی غزل

تو آدمی کو نہ پایا خدا سے کیا لے گا
جو خود سے دُور ہے تو آشنا سے کیا لے گا

تو رہ کے شاخ سے وابستہ آب و نم لے لے
جو زرد رو ہے وہ فیضِ صبا سے کیا لے گا

جو مشک ہے وہ ترے خونِ دل کے دو قطرے
پھر اے غزالِ حرم تو خطا سے کیا لے گا

شہنشہی ہے کسوٹی تری فقیری کی
سریر چاہیے فرشِ گدا سے کیا لے گا

جہاں ہے تختۂ لالہ وہیں تو ڈھونڈ اسے
سرودِ رفتہ ہماری نوا سے کیا لے گا

نظر تو صحبتِ اہلِ نظر سے ہوتی ہے تیز
دوا ہے سرمہ بجا، اس دوا سے کیا لے گا

ہم اہلِ عشق جہاں سے ہے آگہی ہم کو
تو مانگ ہم سے نظر، کیمیا سے کیا لے گا

حضور

گرچہ جنت از تجلی ہائے اوست
جاں نیاساید بجز دیدار دوست!

ما ز اصل خویشتن در پردہ ایم
طائریم و آشیاں گم کردہ ایم!

علم اگر کج فطرت و بدگوہر است
پیشِ چشمِ ما حجابِ اکبر است

علم را مقصود اگر باشد نظر
می شود ہم جادہ و ہم راہبر

می نہد پیشِ تو از قشرِ وجود
تا تو پرسی چیست رازِ ایں نمود

جادہ را ہموار سازد ایں چنیں
شوق را بیدار سازد ایں چنیں

درد و داغ و تاب و تب بخشد ترا
گریہ ہائے نیم شب بخشد ترا

علمِ تفسیرِ جہانِ رنگ و بو
دیدہ و دل پرورش گیرد ازو

بر مقامِ جذب و شوق آرد ترا
باز چوں جبریل بگذارد ترا!

عشق کس را کے بخلوت می برد
او ز چشمِ خویش غیرت می برد!

اوّلِ او ہم رفیق و ہم طریق
آخرِ او راہ رفتن بے رفیق!

در گذشتم زاں ہمہ حور و قصور
ز ورقِ جاں با ختم در بحرِ نور!

غرق بودم در تماشائے جمال
ہر زماں در انقلاب و لا یزال!

گم شدم اندر ضمیرِ کائنات
چوں رباب آمد بچشمِ من حیات!

آنکہ ہر تارش رباب دیگرے
ہر نوا از دیگرے خونیں ترے!

حضور

جلوۂ حق ہی تو ہے جنّت سبھی
چاہیے جاں لیکن لقائے ذات ہی

علم اپنی ذات کا ہم کو کہاں
ہم نے کھو بیٹھا خود اپنا آشیاں

علم بد آموز ہو یا ناصواب
ہو گا پیشِ چشم اک سنگیں حجاب

علم ہو جائے جو خواہانِ نظر
راستہ بن جائے خود، خود راہبر

پوست لا رکھے گا از شانِ وجود
تا کہ پوچھے اس سے تو رازِ نمود

راہ سب ہموار کرتا ہے تبھی
ٹوہ میں اس کی لگا تا ہے یونہی

درد و داغ و تاب و تب دے گا تجھے
گریہ ہائے نیم شب دے گا تجھے

علم رنگ و بوئے عالم کا بیاں
دیدہ و دل اس سے ہوتے ہیں جواں

تجھ کو جذب و شوق کا حامل کرے
پھر پرِ جبریل کی پرواز دے

غیر کو خلوت میں کب لاتا ہے عشق
خود نظر سے اپنی شرماتا ہے عشق

ابتدا میں ہا رفیق و ہا طریق
انتہا جائے وہ تنہا بے رفیق

چھوڑ کر نکلا میں سب حور و قصور
کشتیٔ جاں تھی سوارِ بحرِ نور

ہو گیا غرقِ تماشائے جمال
اس کے جلوے تازہ تازہ لایزال

ہو گیا غرقِ ضمیرِ کائنات
ساز کی صورت نظر آئی حیات

اس کا ہر اک تار تھا سازِ دگر
اس کے ہر سُر میں تھا خونیں تر اثر

ماہمہ یک دود مانِ نار و نور — آدم و مہر و مہ و جبریل و حور!
پیشِ جاں آئینۂ آویختند — حیرتے را با یقیں آمیختند!
صبحِ امروزے کہ نورش ظاہر است — در حضورش دوش و فردا حاضر است!
حق ہویدا با ہمہ اسرارِ خویش — با نگاہِ من کند دیدارِ خویش!
دیدنش افزودنِ بے کاستن! — دیدنش از قبر تن برخاستن!
عبد و مولا در کمینِ یک دگر — ہر دو بے تاب انداز ذوقِ نظر!
زندگی ہر جا کہ باشد جستجو است!
حل نشد ایں نکتہ من صیدم کہ اوست!

عشق جاں را لذتِ دیدار داد — باز با نم جرأتِ گفتار داد
"اے دو عالم از تو با نور و نظر — اندکے آں خاکدانے را نگر
بندۂ آزاد را ناساز گار — برد مد از سنبلِ او نیشِ خار!
غالباں غرق اند در عیش و طرب — کارِ مغلوباں شمارِ روز و شب!
از ملوکیت جہانِ تو خراب — تیرہ شب در آستینِ آفتاب!
دانشِ افرنگیاں غارت گری — دیر ہا خیبر شد از بے حیدری!
آنکہ گوید لا الہ بیچارہ ایست — فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست!
چار مرگ اندر پے ایں دیر میر — سود خوار و وائی و ملا و پیر!
ایں چنیں عالم کجا شایانِ تست
آب و گل داغے کہ بر دامانِ تست"

ہم سبھی اک خاندانِ نار و نور — آدم و مہر و مہ و جبریل و حور
پیشِ جاں آئینہ آویزاں ادھر — تھے تحیّر اور یقیں شیر و شکر
تھی سحر امروز کی گو ضو فشاں — ماضی و مستقبل اس میں تھے عیاں
آشکارا حق تھا با اسرارِ حق — حق کو میری آنکھ سے دیدارِ حق
کم نہ ہونا بڑھتے جانا، اس کی دید — پھاڑ کر قبرِ تن آنا، اس کی دید
عبد و مولا اپنے اپنے داؤ پر — دیکھنے بے تاب دونوں کی نظر

جستجو ہی زیست کا ہر جا شعار
مسئلہ بس کون ہے کس کا شکار!

عشق نے کیا لذتِ دیدار دی — مجھ کو کیسی جرأتِ گفتار دی
اے کہ تجھ سے دو جہاں نور و نظر — دیکھ دنیا کی ذرا حالت ادھر
بہرِ آزاداں وہ ہے ناسازگار — پھوٹتے ہیں اس کے سنبل سے بھی خار
جو ہیں غالب ان کا کام عیش و طرب — اور مغلوبوں کا گننا روز و شب
ہے ملوکیت سے عالم سب خراب — ظلمتِ شب اندرونِ آفتاب
پُر ہلاکت غرب کی دانش وری — بت کدے مضبوط تر بے حیدری
کلمہ گو جو بھی ہے وہ بیچارہ ہے — چوں کہ بے مرکز ہے فکر آوارہ ہے
مارتے پر سخت جان کے مرگ چار — حکمراں، ملّا، و پیر و سود خوار

ایسی دنیا تجھ کو شایاں ہے کہاں؟
دھبہ ہے دامن کا تیرے یہ جہاں!"

ندائے جمال

کلکِ حق از نقشہائے خوب و زشت
ہر چہ ما را سازگار آمد نوشت!

چیست بودن دانی اے مردِ نجیب؟
از جمالِ ذاتِ حق بردن نصیب!

آفریدن؟ جستجوئے دلبرے!
وانمودن خویش را بر دیگرے!

ایں ہمہ ہنگامہ ہائے ہست و بود
بے جمالِ ما نیاید در وجود!

زندگی ہم فانی و ہم باقی است
ایں ہمہ خلّاقی و مشتاقی است!

زندہ؟ مشتاق شو خلّاق شو
ہمچو ما گیرندۂ آفاق شو!

در شکن آنرا کہ ناید سازگار
از ضمیرِ خود دگر عالم بیار!

بندۂ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہانِ دیگراں!

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جز کافر و زندیق نیست!

از جمالِ ما نصیبِ خود نبرد
از نخیلِ زندگانی بر نخورد

ق

مردِ حق! برّندہ چوں شمشیر باش
خود جہانِ خویش را تقدیر باش!

زندہ رود

چیست آئینِ جہانِ رنگ و بو
جز کہ آبِ رفتہ می ناید بجو!

ندائے جمال

خیر و شر جو بھی ہمیں موزوں رہا
خامۂ تقدیر سے لکھوا دیا

کس کو کہتے ہیں وجودِ خوش خصال؟
وہ ہے ذاتِ حق سے تحصیلِ جمال

کیا ہے تخلیق؟ ایک دلبر کی تلاش
غیر کے آگے بتانا خود کو فاش

یہ جہاں، اس کے یہ ہنگامے یہ حال
ہم نہ ہوں تو ان کا ہونا ہے محال

زندگی فانی بھی ہے باقی بھی ہے
کارِ خلاقی بھی مشتاقی بھی ہے

زندہ تُو؟ مشتاق بن خلّاق بن
جیسے ہم فرماں دہِ آفاق بن

تجھ کو جو بھاتا نہیں اس کو مٹا
اپنی خواہش کی نئی دنیا بنا

بندۂ آزاد کے حق میں گراں
زندگی اندر جہانِ دیگراں

بندہ جو بے قوتِ تخلیق ہے
کچھ نہیں، بس کافر و زندیق ہے

وہ رہا بے بہرۂ شانِ جمال
وہ نہ پایا زندگانی کا مآل

بندۂ حق! تیز جوں شمشیر بن
اپنی دنیا کو تو خود تقدیر بن

زندہ رود

کیا ہے دستورِ جہاں اس کے سوا
بہ گیا جو نہر سے پانی، گیا!

زندگانی را سرِ تکرار نیست فطرتِ او خوگرِ تکرار نیست!
زیرِ گردوں رجعتِ او را روا ست چوں ز پا افتاد قومے برنخاست!
ملّتے چوں مُرد کم خیزد ز قبر
چارۂ او چیست غیر از قبر و صبر!

ندائے جمال

زندگانی نیست تکرارِ نفس اصلِ او از حیّ و قیوم است و بس!
قربِ جاں با آنکہ گفت 'انّی قریب' از حیاتِ جاوداں بردن نصیب!
فرد از توحید لاہوتی شود ملّت از توحید جبروتی شود!
بایزید و شبلی و بوذر از وست امّتاں را طغرل و سنجر از وست!
بے تجلی نیست آدم را ثبات جلوۂ ما فرد و ملّت را حیات!
ہر دو از توحید می گیرد کمال زندگی این را جلال آں را جمال!
این سلیمانی است آں سلمانی است آں سراپا فقر و این سلطانی است!
آں یکی را بیند این گردد یکی
در جہاں با آں نشیں با این بزی!
چیست ملّت اے کہ گوئی لا الہ؟ با ہزاراں چشم بودن یک نگہ!
اہلِ حق را حجت و دعوائے یکے است خیمہ ہائے ما جدا، دلہا یکے است!

زندگی یہ بار بار آتی نہیں خو اسے تکرار کی بھاتی نہیں
لوٹنا ممکن نہیں زیرِ فلک گر کے قوم اُٹھی نہ کوئی اب تلک
مر کے ملّت چھوڑ بھی سکتی ہے قبر ؟
کیا علاج اس کا سوائے قبر و صبر!

ندائے جمال

آنا جانا سانس کا جینا نہیں زندگی ہے فضلِ ربّ العالمیں
جاں ہے نزدِ صاحبِ اِنّی قَرِیب لینا اپنا جاودانی سے نصیب
فرد لاہوتی بنے توحید سے قوم جبروتی بنے توحید سے
اُس سے شبلی، اُس سے بوذر، بایزید طغرل و سنجر سے ملّت مستفید
بے تجلی آدمی ہے بے ثبات فرد و ملّت کو مرے جلوے حیات
پاتے ہیں توحید سے دونوں کمال زندگی اس کو جلال اس کو جمال
یہ سلیمانی ہے، سلمانی ہے وہ یہ ہے درویشی تو سلطانی ہے وہ
دیکھے یہ وحدت کو وہ وحدت سبھی
ساتھ اُس کے بیٹھ اُس کے ساتھ جی!

اے مسلماں! کیا ہے ملّت سے خبر؟ ہوں ہزاروں آنکھیں لیکن اک نظر
سب کے دعوے اور دلائل ایک ہی خیمے ان کے ہیں الگ دل ایک ہی

ذرہ ہا از یک نگاہی آفتاب یک نگہ شو تا شود حق بے حجاب!
یک نگاہی را بچشم کم مبیں از تجلی ہائے توحید است ایں!

ملّتے چوں می شود توحید مست
قوت و جبروت می آید بدست!

روحِ ملّت را وجود از انجمن روحِ ملّت نیست محتاج بدن!
تا وجودش را نمود از صحبت است مُرد چوں شیرازۂ صحبت شکست!
مردہ از یک نگاہی زندہ شو بگذر از بے مرکزی پایندہ شو

وحدتِ افکار و کردار آفریں
تا شوی اندر جہاں صاحب نگیں!

زندہ رود

من کیم؟ تو کیستی؟ عالم کجاست؟ در میانِ ما و تو دوری چراست؟
من چرا در بندِ تقدیرم بگوئے تو نمیری من چرا میرم بگوئے!

ندائے جمال

بودۂ اندر جہانِ چار سو ہر کہ گنجد اندرو میرد درو

یک نگاہی سے ہیں ذرے آفتاب یک نگہ ہو جا کہ حق ہو بے حجاب
یک نگاہی کو نہ جانِ اصلا حقیر کیونکہ ہے توحید سے یہ مستنیر

مستِ وحدت ہو گی جب ملّت کوئی
قوت و جبروت پالے گی سبھی

روحِ ملّی کا نشاں ہے انجمن جانِ ملّت کب ہے محتاجِ بدن ؟
چوں کہ یک جائی سے ہے وہ آشکار ختم کر دیتا ہے اس کو انتشار
اے تو مردہ ؟ یک نگہ بن زندہ رہ ترک کر بے مرکزی پائندہ رہ

وحدتِ فکر و عمل کر اختیار
تا رہے دنیا میں بن کر تاجدار

زندہ رود

کون مَیں ؟ تُو کون ؟ عالم ہے کہاں ؟ کیوں یہ دوری اپنے تیرے درمیاں ؟
بند میں تقدیر کے مَیں کیوں بھلا ؟ تُو ہے دائم مَیں ہوں فانی کیوں بتا ؟

ندائے جمال

قید ہے تُو چار سو کے درمیاں اس کو مرنا ہے رہے جو بھی وہاں

زندگی خواہی خودی را پیش کن — چار سو را غرق اندر خویش کن
باز بینی من کیم تو کیستی — در جہاں چوں مردی و چوں زیستی

زندہ رود

پوزشِ ایں مردِ ناداں در پذیر — پردہ را از چہرۂ تقدیر گیر
انقلابِ روس و المان دیدہ ام — شور در جانِ مسلماں دیدہ ام
دیدہ ام تدبیرہائے غرب و شرق — وانما تقدیرہائے غرب و شرق!

افتادنِ تجلیٔ جلال

ناگہاں دیدم جہانِ خویش را — آں زمین و آسمانِ خویش را
غرق در نورِ شفق گوں دیدمش — سرخ مانندِ طبرخوں دیدمش!
زاں تجلی ہا کہ در جانم شکست — چوں کلیم اللہ فتادم جلوہ مست!
نورِ او ہر پردگی را وا نمود — تابِ گفتار از زبانِ من ربود!

از ضمیرِ عالمِ بے چند و چوں
یک نوائے سوز ناک آمد بروں!

باخودی رہ، چاہیئے گر زندگی
غرق خود میں کر تو جہتوں کو سبھی
دیکھ پھر تو کون ہے مَیں کون ہوں!
کس طرح جیتا ہے تُو مرتا ہے کیوں!

زندہ رود

التجا سُن مردِ ناداں کی ذرا
چہرۂ تقدیر سے پردہ اٹھا
دیکھے روس اور جرمنی کے انقلاب
جانِ مسلم میں ہے پیدا اضطراب
دیکھے ہیں تدبیر ہائے غرب و شرق
فاش کر تقدیر ہائے غرب و شرق!

تجلّیٔ جلال کا گرنا

یک بیک دیکھا مَیں خود اپنا جہاں
وہ زمیں اپنی وہ اپنا آسماں
رنگ مانندِ شفق دونوں کا لال
اور لالی ان کی بھٹی کی مثال
جان پہ تھا عالم تجلیات کا
جوں کلیمؑ اللہ عشق کھا کر گرا
ہر نہاں کو نور نے ظاہر کیا
مجھ میں اب گفتار کا یارا نہ تھا

عالمِ بے چند و چوں کے بطن سے
اک نوائے سوزناک آئی مجھے

"بگذر از خاور و افسونِ افرنگ مشو
که نیرزد بجوئے ایں همه دیر ینه و نو
آں نگینے که تو با اہرمناں باختهٔ
هم بجبریلِ امینے نتواں کرد گرو!
زندگی انجمن آرا و نگهدارِ خود است
اے که در قافلهٔ بے همه شو با همه رو!
تو فروزنده تر از مهرِ منیر آمدهٔ
آبخناں زی که بهر ذرّه رسانی پرتو!
چوں پرِ کاه که در رهگذرِ باد افتاد
رفت اسکندر و دارا و قباد و خسرو!
از تنک جامئ تو میکده رسوا گردید
شیشهٔ گیر و حکیمانه بیاشام و برو!"

چھوڑ مشرق کو تو افرنگ سے مسحور نہ ہو
دانۂ جو کے برابر نہیں یہ کہنہ و نو
اہرمن سے جو تو بازی میں گنوایا وہ گہر
کوئی کرتا نہیں جبریل کے ہاتھوں بھی گرو
زندگی انجمن آرا بھی ہے خود دار بھی ہے
ساتھ چل سب کے، نہ کر ترک تو تنہائی کو
اے کہ سورج سے بھی بڑھ کر تری ہستی روشن
اس طرح جی کہ ہو ہر چیز پہ تیرا پرتو
مثل تنکے کے اڑا لے گئی ان سب کو ہوا
گئے اسکندر و دارا و قباد و خسرو
تنگ ظرفی سے ہوا میکدہ اپنا رسوا
شیشہ لے شوق سے پی، ہوش کسی حال نہ کھو

خطاب به جاوید

سخنے بہ نژادِ نو

خطاب بہ جاوید

(سخنے بہ نژادِ نو)

ایں سخن آراستن بے حاصل است — بر نیاید آنچہ در قعرِ دل است!
گرچہ من صد نکتہ گفتم بے حجاب — نکتۂ دارم کہ ناید در کتاب!
گر بگویم می شود پیچیدہ تر — حرف و صوت او را کند پوشیدہ تر
سوزِ او را از نگاہِ من بگیر
یا ز آہِ صبح گاہِ من بگیر!

مادرت درسِ نخستیں با تو داد — غنچۂ تو از نسیمِ او کشاد!
از نسیم او ترا ایں رنگ و بوست — اے متاعِ ما بہائے تو از دوست!
دولتِ جاوید از و اندوختی — از لبِ او لا الہ آموختی!
اے پسر! از ذوقِ نگہ از من بگیر — سوختن در لا الہ از من بگیر!
لا الہ گوئی؟ بگو از روئے جاں — تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں!
مہر و مہ گردد ز سوزِ لا الہ — دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہ!
ایں دو حرفِ لا الہ گفتار نیست — لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست!

جاوید سے خطاب
(نئی نسل کو پیغام)

اس سخن آرائی کا حاصل ہے کیا — دل میں جو کچھ ہے نہ ظاہر کر سکا
نکتے صدہا کر کے رکھا بے حجاب — پر ہے اک جس کی نہیں حامل کتاب!
گر کہوں پیچیدہ تر ہو جائے بات — اور حرف و صوت میں کھو جائے بات

سوز اس کا تو مری نظروں سے لے
یا تو میری صبح کی آہوں سے لے

درس اول تجھ کو مادر نے دیا — اس کی پھونکوں سے ترا غنچہ کھلا!
اس کے چھونے سے ترے یہ رنگ و بو — فیض سے اس کے گراں قیمت ہے تو!
دولت جاوید تو نے اس سے لی — لا الہ بھی تجھ کو سکھلائی وہی
اے پسر! اب مجھ سے لے ذوقِ نظر — کسبِ سوزِ لا الہ مجھ سے تو کر
صدقِ دل سے لا الہ پڑھ تو یہاں — تا کہ پیدا تجھ میں ہوں آثارِ جاں
چاند میں سورج میں سوزِ لا الہ — کوہ ہیں اس سوز سے خالی نہ کہ
یہ نہ سمجھو لا الہ گفتار ہے — لا الہ اک بے اماں تلوار ہے

زیستن با سوزِ او قہاری است
لاالہ ضربِ است و ضربِ کاری است

مومن و پیش کساں بستن نطاق! مومن و غداری و فقر و نفاق!
با پشیزے دین و ملّت را فروخت ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت!
لاالہ اندر نمازش بود و نیست نازہا اندر نیازش بود و نیست!
نور در صوم و صلواتِ او نماند جلوہ در کائناتِ او نماند!
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ فتنۂ او حبِّ مال و ترسِ مرگ!
رفت از و آں مستی و ذوق و سرور دینِ او اندر کتاب و او بگور!
صحبتش با عصرِ حاضر در گرفت حرفِ دیں را از دو پیغمبر گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد آں زِ حج بیگانہ و ایں از جہاد!
تا جہاد و حج نماند از واجبات رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوات!
روح چوں رفت از صلوٰت و از صیام فرد ناہموار و ملّت بے نظام!
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی!

از خودی مردِ مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت!

سجدۂ کز وے زمیں لرزیدہ است بر مرادش مہر و مہ گردیدہ است
سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود در ہوا آشفتہ گردد ہم چو دود!
ایں نماں جز سر بزیری ہیچ نیست اندرو جز ضعفِ پیری ہیچ نیست!

اس کے ہمراہ زندگی قہاری ہے
لاالہ بے ضرب، ضربِ کاری ہے!

مومن اور ہو جائے غیروں کا غلام؟ فقر، غداری، نفاق اس کا ہو کام!
دین و ملّت ایک کوڑی میں بکائے آگ خود گھر بار کو اپنے لگائے!
لاالہ کے سوز سے خالی نماز اور تہی ہو ناز سے اس کا نیاز!
نور سے بے بہرہ سب صوم و صلوٰت اور تہی جلوؤں سے اس کی کائنات
وہ کہ تھا جس کے لئے سب کچھ خدا اس کو دولت کی ہوس، ڈر موت کا!
ذوق و مستی آج وہ باقی نہیں گور میں وہ، دفتروں میں اس کا دیں
عصرِ حاضر کے مطابق خود ہوا دیں بھی دو نیبوں سے حاصل کر لیا
وہ تھا ایرانی تو یہ ہندی نژاد حج کا مانع وہ، یہ ناہی جہاد!
گر نماز و حج سے ہو گا احتراز روح سے خالی رہیں روزہ، نماز
ہو گئے بے جاں جو صلوٰت و صیام فردِ ناہموار، ملّت بے نظام
گرمیِ قرآں سے دل ان کے تہی پھر کہاں ان سے توقع خیر کی

ہے مسلماں میں خودی باقی کدھر؟
سر سے اونچا ہو گیا پانی خضرؑ!

سجدہ وہ جس سے زمیں لرزیدہ تھی تھے رضا پر جس کی مہر و ماہ بھی
ثبت ہو گر سنگ پر اس کا نشاں منتشر ہو گا تبھی بنکر دھواں
سرنگونی کے سوا اب کچھ نہیں ضعفِ پیری کے سوا اب کچھ نہیں

آں شکوہِ ربّی الاعلےٰ کجا ست ایں گناہِ اوست یا تقصیرِ ماست؟
ھر کسے بر جادۂ خود تند رو ناقۂ ما بے زمام و ھر زہ دو!

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب
العجب ثم العجب ثم العجب!

گر خدا سازد ترا صاحب نظر روزگارے را کہ می آید نگر!
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز!
علم و فن، دیں و سیاست، عقل و دل زوج زوج اندر طوافِ آب و گل!
آسیا آں مرز و بوم آفتاب غیر بیں، از خویشتن اندر حجاب!
قلبِ او بے وارداتِ نو بنو حاصلش را کس نگیرد باد و جو!
روزگارش اندریں دیر مغاں ساکن و تخ بستہ و بے ذوق سیر!
صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک آہوئے اندیشۂ او لنگ و لوک!
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ بستۂ فتراکِ لُردانِ فرنگ!
تا ختم بر عالمِ افکارِ او بر دریدم پردۂ اسرارِ او!

درمیانِ سینہ دل خوں کردہ ام
تا جہانش را دگرگوں کردہ ام!

من بطبعِ عصرِ خود گفتم دو حرف کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف!
حرفِ پیچاپیچ و حرفِ نیش دار تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار!
حرفِ تہ دارے بانداز فرنگ نالۂ مستانہ از تارِ چنگ!

ربّی الاعلےٰ کا وہ عالم کہاں؟ پائی جاتی ہے خطا کس کی یہاں؟
اپنی اپنی راہ پر سب تیز گام ناقۂ آوارہ اپنی بے زمام!

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب!
اُلعجب، ثم العجب، ثم العجب!

گر کرے اللہ تجھے صاحبِ نظر اک نظر رکھ آنے والے دَور پر
عقل ہے بے باک اور سنگین دل آنکھ بے شرم اور غرقِ آب و گِل
عُلم و فن دین و سیاست عقل و دل جوق جوق اندر طوافِ آب و گِل
ایشیاء جائے طلوعِ آفتاب غیر سے آگاہ خود اندر حجاب
اس کے دل میں جہد کی لذّت نہیں اس کے حاصل کی کوئی قیمت نہیں
اس دیارِ کہنہ میں اس کا وجود بے حس و حرکت، سراپا اک جمود
حال اس کا شاہ و مُلّا سے ہے تنگ آہوئے فکر اس کا ناراست اور لنگ
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ سب کے سب نخچیرِ رُدانِ فرنگ
ان کے اندیشوں پہ دھاوا بول کر رکھ دیئے سب رازِ آخر کھول کر

مَیں نے اپنے دل کا کر ڈالا ہے خوں
تا دگرگوں اس کی دنیا کو کروں

کہہ کے دو باتیں خود اپنے عہد سے مَیں نے دو دریا دو کوزوں میں بھرے
ایک پیچیدہ، وہ دیگر نوک دار عقل و دل مردوں کے تا کر لوں شکار
وہ عمیق اور اس میں اندازِ فرنگ اور یہ مستانہ نوائے تارِ چنگ

اصلِ ایں از ذکر و اصلِ آں ز فکر — اے تو بادا وارثِ ایں فکر و ذکر!
آبجوئیم از دو بحرِ اصلِ من است — فصلِ من فضل است و ہم وصلِ من است!

تا مزاجِ عصرِ من دیگر فتاد
طبعِ من ہنگامۂ دیگر نہاد!

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ — شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ!
کم نگاہ و بے یقین و نا امید — چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید!
ناکساں منکر ز خود مومن بغیر — خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر!
مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست — تا بجذب اندر وِنش راہ نیست!
نورِ فطرت را ز جانہا پاک شست — یک گلِ رعنا ز شاخِ او نرست!
خشت را معمارِ ماہر می نہد — خوئے بط با بچۂ شاہیں دہد!
علم تا سوزے نگیرد از حیات — دل نگیرد لذتے از واردات!
علم جز شرحِ مقاماتِ تو نیست — علم جز تفسیرِ آیاتِ تو نیست!
سوختن می باید اندر نارِ حس — تا بدانی نقرۂ خود را ز مس!

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور
آخرِ او می نگنجد در شعور!

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر — خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر
ہر کسے زاں می کہ ریزد از نظر — مست می گردد بانداز دگر!
از دمِ بادِ سحر میرد چراغ — لالہ زاں بادِ سحر مے در ایاغ!

اِس کا باعث ذکر، باعث اُس کا فکر — حق کرے تجھ کو عنایت فکر و ذکر
نہر ہوں، دو بحر سے ہستی مری — ہجر میرا ہجر بھی ہے وصل بھی

چوں کہ طبعِ ہم نشیناں اور ہے
میرے نالوں کا بھی عنواں اور ہے

نوجواناں پیاسے اور خالی سفال — شستہ رو، تاریک جاں، روشن خیال
وہ ہیں اندھے، ناامید و بے یقیں — زندگی میں ان کو کچھ حاصل نہیں
منکرِ خود، ناکس اور ممنونِ غیر — خاک وقف ان کی پئے تعمیرِ دیر
ان کے مکتب خود نہیں منزل شناس — جذبِ باطن پر نہیں ان کی اساس
جان میں ان کی نہیں باقی جِلا — غنچہ سے محرومِ نخلِ امید کا
اینٹ ٹیڑھی رکھ کے وہ دیوار اٹھائے — راہِ بط پر باز بچّوں کو چلائے
علم اگر پائے نہ سوزِ زندگی — بیتیاں کیا لطف دیں گی زیست کی
فاش تجھ پر علم سے تیرا نہاں — علم تیری شرح اور تیرا بیاں
یہ تپانا خود کو اندر نارِ حس — تا جدا ہم کر سکیں نقرہ و مس!

معرفت، اوّل حواس آخر حضور
اس کے آخر کو نہ پہنچے گا شعور

تجھ کو حاصل ہے کتابوں سے ہنر — ہے ہنر سے خوب تر درسِ نظر
جو نظر کی تاک سے ڈھلتی ہے مے — اس کی مستی اس کا عالم اور ہے
پھونک سے بادِ سحر کی گل چراغ — اور صبا سے لالہ ہے مے در ایاغ

کم خورد کم خواب و کم گفتار باش — گردِ خود گردندہ چوں پرکار باش!
منکرِ حق نزدِ ملّا کافر است — منکرِ خود نزدِ من کافر تر است!
آں بانکارِ وجود آمد 'عجول' — ایں 'عجول' و ہم 'ظلوم' و ہم 'جہول'!
شیوۂ اخلاص را محکم بگیر — پاک شو از خوفِ سلطان و امیر
عدل در قہر و رضا از کف مدہ — قصد در فقر و غنا از کف مدہ
حکم دشوار است؟ تاویلے مجو — جز بقلبِ خویش قندیلے مجو
حفظِ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب — حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب
حاکمی در عالمِ بالا و پست — جز بحفظِ جان و تن ناید بدست
لذّتِ سیر است مقصودِ سفر — گر نگہ بر آشیاں داری مپر
ماہ گردد تا شود صاحبِ مقام — سیرِ آدم را مقام آمد حرام!
زندگی جز لذّتِ پرواز نیست — آشیاں با فطرتِ او ساز نیست!

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور
رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور

سرِّ دیں صدقِ مقال اکلِ حلال — خلوت و جلوت تماشائے جمال!
در رہِ دیں سخت چوں الماس زی — دل بحق بر بند و بے وسواس زی!
سرّے از اسرارِ دیں بر گویمت — داستانے از مظفر گویمت
اندر اخلاصِ عمل فرد فرید — پادشاہے با مقام بایزید
پیشِ او اسپے چو فرزندانِ عزیز — سخت کش چوں صاحبِ خود در ستیز

خواب کم، خوراک کم، کم گفتگو — آپ اپنے حفظ میں رہ مست تو
منکرِ حق، شیخ کو کافر رہا — منکرِ خود مجھ کو کافر سے سوا
کر کے وہ انکارِ حق ٹھہرا عجول — یہ عجول، اور یہ ظلوم، اور یہ جہول،
شیوۂ اخلاص اپنانا سدا — خوفِ شاہ و میر کو دل سے مٹا
عدل کا ہر حال میں رکھنا خیال — ہو دمِ فقر و غنا بھی اعتدال
حکم میں تاویل کی جرأت نہ کر — کر دلِ روشن کو اپنا راہبر
صحتِ جاں ذکر و فکرِ بے حساب — تن کی صحت ضبطِ نفس اندر شباب
دو جہاں میں سرفرازی کے لئے — جان و تن دونوں کی صحت چاہیئے
سیر ہو مقصد تو کر عزمِ سفر — گھر ہے گر مقصد قدم باہر نہ دھر
چاند گردش میں ہے تا پائے مقام — آدمی کے حق میں ہے منزل حرام
زندگانی کیا ہے؟ پروازِ دوام — اس کی فطرت کو نہیں شایاں مقام

زاغ کو کرگس کو خاکِ گور خوان
خوانِ بازاں در مہ و مہر آسمان

دین ہے سچ بولنا، کھانا حلال — حاضری ہر وقت پیشِ ذوالجلال
راہِ دیں میں سخت جوں الماس رہ — دل لگا کر حق سے بے وسواس رہ
رازِ دینِ حق مَیں کرتا ہوں بیاں — سُن مظفر شاہ کی اک داستاں
تھا بہ اخلاصِ عمل فردِ فرید — اس کی شاہی میں تھی شانِ بایزید
اسکو گھوڑے سے تھا جوں فرزند پیار — محنتی دونوں سواری اور سوار

سبزہ رنگے از نجیبانِ عرب — باوفا، بے عیب، پاک اندر نسب
مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس — چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟
من چہ گویم وصفِ آں خیر الجیاد — کوہ و روے آبہار رفتے چو باد
روزِ ہیجا از نظر آمادہ تر — تند بادے طایفِ کوہ و کمر!
در تگِ او فتنہ ہاے رستخیز — سنگ از ضربِ سُمِ او ریز ریز
روزے آں حیواں چوں انساں ارجمند — گشت از دردِ شکم زار و نزند
کرد بیطارے علاجش از شراب — اسپ شہ را وا رہاند از پیچ و تاب
شاہِ حق بیں دیگر آں یکراں نخواست — شرعِ تقوےٰ از طریقِ ما جداست

اے ترا بخشد خدا قلب و جگر
طاعتِ مردِ مسلمانے نگر!

دیں سراپا سوختن اندر طلب — انتہایش عشق و آغازش ادب!
آبروئے گل ز رنگ و بوے اوست — بے ادب بے رنگ و بو، بے آبرو ست!
نوجوانے را چو بینم بے ادب — روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا — یادِ عہدِ مصطفےٰ آید مرا!
از زمانِ خود پشیماں می شوم — در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم!
سترِ زن یا زوج یا خاکِ لحد — سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد
حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست — کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست!
آدمیت احترامِ آدمی — باخبر شو از مقامِ آدمی!

سبزہ رنگ اور نسل سے پورا عرب
باوفا، بے عیب، پاک اس کا نسب

کیا ہے پیارا مردِ مومن کے لئے
بڑھ کے قرآن اور اسپ و تیغ سے

لائقِ تحسیں تھا وہ خیر الجیاد
کوہ و دریا میں رواں مانندِ باد

وقتِ ہیجا وہ نظر سے تیز تر
جیسے صرصر طائفِ کوہ و کمر

دوڑ میں اس کی قیامت کا سا رنگ
ٹھوکروں سے اس کی پارہ پارہ سنگ

ایک دن وہ آدمی سا راہوار
ہو گیا دردِ شکم سے زار زار

چارہ گر نے دے کے تھوڑی سی شراب
اس کی جاں سے دور کر ڈالا عذاب

شاہ نے از راہِ تقوی پھر کبھی
اس پہ بھولے سے نہ زیں اپنی کسی

حق کرے قلب و جگر تجھ کو عطا
دیکھ تقویٰ اک مسلماں کا ہے کیا!

دینِ حق ہے سر بسر سوز طلب
انتہا عشق، ابتدا اس کی ادب

آبروئے گل کا باعث رنگ و بو
بے ادب بے رنگ و بو بے آبرو

نوجواں کو جب بھی پایا بے ادب
دن ہوا تاریک مجھ پر مثلِ شب

درد میرے دل کا ہوتا ہے زیاد
ہوتی ہے دورِ نبیؐ کی تازہ یاد

زرد رو حاضر سے ہو جاتا ہوں میں
دور بیں ماضی کے کھو جاتا ہوں میں

پردہ زن کا، اس کا شوہر یا لحد
پردہ مردوں کا ہے ترکِ یار و بد

بد زبانی ہے بہ ہر حالت خطا
کافر و مومن سبھی خلقِ خدا

آدمیت احترامِ آدمی
چاہیئے پاسِ مقامِ آدمی

آدمی از ربط و ضبطِ تن بہ تن — بر طریق دوستی گامے بزن!
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق — می شود بر کافر و مومن شفیق!
کفر و دیں را گیرد در پہنائے دل — دل اگر بگریزد از دل، وائے دل!

گرچہ دل زندانیٔ آب و گل است
ایں ہمہ آفاق آفاقِ دل است!

گرچہ باشی از خداوندانِ دہ — فقر را از کف مدہ، از کف مدہ
سوز او خوابیدہ در جانِ تو ہست — ایں کہن مے از نیاگانِ تو ہست!
در جہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ — نعمت از حق خواہ و از سلطاں مخواہ
اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر — می شود از کثرتِ نعمت ضریر!
کثرتِ نعمت گداز از دل برد — ناز می آرد نیاز از دل برد!
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام — نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام!

من فدائے آنکہ درویشانہ زیست
وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست!

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق — آں یقیں آں رنگ و بو آں ذوق و شوق!
عالماں از علمِ قرآں بے نیاز — صوفیاں در بندہ گرگ و مو دراز!
گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست — کو جوانمردے کہ صہبا در کدوست!
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب — چشمۂ کوثر بجویند از سراب!
بے خبر از سرِّ دیں اند ایں ہمہ — اہلِ کیں اند اہلِ کیں اند ایں ہمہ!

ربطِ باہم سے ہے باقی آدمی — لازمی ہے اتحادِ باہمی
بندۂ حق، حق سے لیتا ہے طریق — کافر و مومن کے حق میں وہ شفیق
کفر و دیں کی ہو جگہ پہنائے دل — دل ہے گر دل سے جدا اے وائے دل

دل اگرچہ ہے اسیرِ آب و گل
وسعتِ آفاق کا حامل ہے دل

ہو گا اپنے ملک کا حاکم ولے — فقر کی دولت تو ہاتھوں سے نہ دے
تیری ہستی میں وہ مستی ہے ابھی — یہ شرابِ کہنہ ہے اسلاف کی
دردِ دل کے ما سوا ساماں نہ لے — حق سے نعمت لے نہ لے سلطان سے
کیسے کیسے اہلِ حق اندیش تھے — کثرتِ نعمت سے اندھے ہو گئے
دل سے ڈھائے کثرتِ نعمت گداز — وہ ابھارے ناز، پر چھینے نیاز
مَیں نے برسوں چھان کر دیکھا جہاں — اہلِ دولت کو نہ پایا مہرباں

میں فدائے منعمِ درویش حال
حیف وہ بیگانۂ حق مستِ مال!

اب مسلماں میں نہیں وہ ذوق و شوق — جذبۂ عشق و یقیں وہ ذوق و شوق
علمِ قرآں سے ہیں عالم بے نیاز — صوفیاء بے رحم با موئے دراز
خانقاہوں میں ہے شورِ ھاؤ ھو — پر مئے عرفاں سے خالی ہیں سبو
ہم مسلماں نقلِ مغرب سے خراب — ہم کو، کوثر چاہیے اندر سراب
بے شعورِ سنّۂ دیں ہیں یہ سبھی — اہلِ کیں ہیں، اہلِ کیں ہیں یہ سبھی

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام — دیدہ ام صدق و صفا را در عوام!
اہلِ دیں را باز داں از اہلِ کیں — ہم نشینِ حق بجو با او نشیں،

کرگساں را رسم و آئیں دیگر است
سطوتِ پروازِ شاہیں دیگر است!

مردِ حق از آسماں افتد چو برق — ہمیزم او شہر و دشتِ غرب و شرق
ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات — او شریکِ اہتمامِ کائنات
او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ — او محمدؐ او کتاب او جبرئیلؑ!
آفتابِ کائناتِ اہلِ دل — از شعاعِ او حیاتِ اہلِ دل
اول اندر نارِ خود سوزد ترا — باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ با سوزِ او صاحب دلیم — ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم
ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں — در بدن غرق است و کم داند نہاں!
چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود — مردِ حق در خویشتن پنہاں شود!
در نیابد جستجو آں مرد را — گرچہ بینند روبرو آں مرد را!
تو مگر ذوقِ طلب از کف مدہ — گرچہ در کارِ تو افتد صد گرہ!
گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر — از اب و جد آنچہ من دارم بگیر!
پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست — پائے او محکم فتد در کوئے دوست!
شرحِ او کم دند و او را کس ندید — معنیٔ او چوں غزال از ما رمید

ان بخیلوں میں نہیں خوبی کا نام — رہ گئے صدق و صفا بہرِ عوام
اہلِ دیں اور اہلِ کیں میں کر تمیز — دوست ان کا بن جنہیں ہے حق عزیز

کرگسوں کا جو ہے آئیں اور ہے
سطوتِ پروازِ شاہیں اور ہے

ہے ظہور مردِ حق مانندِ برق — اس کو ایندھن شہر و دشت و غرب و شرق
ہم ابھی غرقِ ظلامِ کائنات — وہ شریکِ اہتمامِ کائنات
وہ کلیمؑ اللہ وہ عیسیٰؑ وہ خلیلؑ — وہ محمدؐ وہ کتاب و جبرئیلؑ
روشن اس کے دم سے دنیا عشق کی — اہلِ دل پاتے ہیں اس سے زندگی
آگ میں اوّل جلاتا ہے تجھے — گرمِ شاہی کے پھر سکھاتا ہے تجھے
اس کے باعث ہم سبھی ہیں اہلِ دل — ورنہ باطل بود اور ہم آب و گل
الاماں! تیرا زمانہ الاماں — جسم بارونق ہیں اور تاریک جاں
قحطِ جاں سے جسم ارزاں ہوں گے جب — مردِ حق خود میں نہاں ہو جائے تب
کچھ پتہ دے گی نہ اس کی جستجو — گو وہ خود موجود ہوگا رو برو
جستجو کا ذوق کم ہونے نہ دے — لاکھ دشواری ہو یہ جاری رہے
مردِ دانا گر نہ ہاتھ آئے تجھے — مَیں نے جو اسلاف سے پایا ہے لے
کر کے رومیؒ کو رفیقِ راہ چل — تا گدازِ سوز بخشے عز و جل
پیرِ رومیؒ پرعیاں سب مغز و پوست — محکم ان کی جاں ہے عشقِ دوست
شرح لکھ دی پر نہ دیکھا ان کا حال — ہو گئے معنی ہرن مثلِ غزال

رقصِ تن از حرف او آموختند
چشتم را از رقصِ جاں برد و ختند!

رقصِ تن در گردش آرد خاک را
رقصِ جاں برہم زند افلاک را!

علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست
ہم زمیں ہم آسماں آید بدست!

فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم!
ملّت از وے وارثِ ملکِ عظیم!

رقصِ جاں آموختن کارے بود
غیرِ حق را سوختن کارے بود

تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر
جاں برقص اندر نیاید اے پسر

ضعفِ ایمان است و دلگیری است غم
نوجوانا! دیمۂ پیری است غم!

می شناسی؟ حرص "فقرِ حاضر" است
من غلامِ آنکہ بر خود قاہر است

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب
تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

سرِّ دینِ مصطفیٰ[۱۳] گویم ترا
ہم بقبہ اندر دعا گویم ترا!

سیکھے ان سے رقصِ تن کے گُر تمام
پر نہ رکھا رقصِ جاں سے کوئی کام

رقصِ تن سے خاک ہو زیر و زبر
رقصِ جاں سے زلزلے افلاک پر

علم و حکمت میں مآلِ رقصِ جاں
زیرِ فرماں سب زمین و آسماں

فرد کو اس کا صلہ ضربِ کلیم
اور ملّت وارثِ ملکِ عظیم

رقصِ جاں کا سیکھ لینا ہے کمال
غیرِ حق کو پھونک دینا ہے کمال

حرص و غم سے ہو جگر جب تک تپاں
رقص کے قابل کبھی ہو گی نہ جاں

غم ہمارے ضعفِ ایماں کا نشاں
نصف پیری ہے یہ غم اے نوجواں

حرص ہے افلاسِ موجودہ کا نام
اس پہ جو غالب ہو میں اس کا غلام

اے کہ ہے تسکینِ جانِ بے قرار
ہو گا رقصِ جاں سے گر تو مایہ دار

میں بتاؤں سرِّ دینِ مصطفیٰؐ
قبر میں بھی کر رہا ہوں گا دعا

علامہ اقبال کے فارسی کلام کا مکمل و منظوم اردو ترجمہ مع متن جو تفہیم اقبال کے سلسلہ میں کافی ممد و معاون ہوگا - فارسی نہ جاننے والے عاشقانِ اقبال کے لئے **سید احمد ایثار** کے منفرد اور باوقار تحفے

- پیام مشرق صفحات :552 قیمت:-/220 روپے
- زبورِ عجم صفحات :554 قیمت:-/250 روپے

دیگر زیر اشاعت تراجم :

- پس چہ باید کرد • اسرارِ خودی
- رموزِ بے خودی • ارمغانِ حجاز

ان کے علاوہ

- رباعیاتِ عمر خیام • رباعیاتِ سعدی
- رباعیات شمس تبریزی • مثنوی مولانا رومؒ

ایثار صاحب کی پہلی تصنیف: رباعیات و قطعات کا

ایک خوبصورت گلدستہ

- ترانہ و ترنگ صفحات: 136 قیمت-/100 روپے

طلباء، لائبریریوں اور کتب فروشوں کے لئے خصوصی رعایت

آج ہی ہم سے طلب کیجئے

ایثار پبلشنگ ہاؤز ٹرسٹ، نمبر 967 شیر خان اسٹریٹ

نگرتھ پیٹ، بنگلور-2 فون- 56694697 / 2217815